کالے راستے

ایم اے راحت

بشمول ایوارڈ یافتہ ناولٹ "نئی منزل"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



کالے راستے

دفتر خالی ہو چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے سب لوگ جلدی اٹھ گئے تھے لیکن اسے گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہاں تھا ہی کون؟ صرف ایک نوکر اور ...... اور بس۔

وہ سست رفتاری سے کار ڈرائیو کرتا رہا، پھر ایک چوراہے سے مڑا تو ایک سفید ہاتھ اس کے سامنے لہرا گیا۔

اس نے حسب عادت اس طرف نگاہ بھی نہیں کی۔ ایسے موقعوں کو وہ نظر انداز کر دیتا تھا۔ امن پسند انسان تھا اس لئے الجھنوں سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ بارہا لڑکیوں نے اس سے لفٹ مانگی تھی لیکن اس نے ہمیشہ انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ مغرور تھا بلکہ الگ تھلگ رہنے کا خیال اسے ان باتوں سے روکتا تھا۔ اخبارات کی خبریں بھی اسے اس نیکی سے باز رکھتی تھیں، بعض اوقات ایسی کوئی نیکی مصیبت بھی بن جاتی تھی۔

اس وقت بھی اس نے سفید ہاتھ پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اتفاق سے عقب نما آئینے پر نگاہ جا پڑی تھی۔ لفٹ مانگنے والی آئینے کی زد میں تھی، وہ

بڑی مایوسی سے کار کو دیکھ رہی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس اس کا چہرہ تو نظر نہیں آیا لیکن ہر انداز سے بے بسی عیاں تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا...... کار سست ہوتے ہوئے بھی کافی دور نکل آئی تھی لیکن پھر اس نے کلچ پر پاؤں رکھ کر اسے روک ہی لیا۔ ایک لمحے کے لئے ذہن میں کشمکش ہوئی، پھر اس نے کار ریورس گیئر میں ڈال دی اور کلچ چھوڑنے لگا۔

بے بس چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ خود بھی آگے بڑھنے لگی۔ سفید رنگ کی ہی ایک فائل سینے سے لگی تھی، چند ساعت بعد وہ قریب پہنچ گئی۔

''بیٹھ جاؤں......؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''بیٹھو... کہاں جاؤ گی......؟'' اس نے کہا اور لڑکی جلدی سے عقبی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

''معاف کیجئے گا، کپڑے بھیگے ہوئے ہیں، آپ کی سیٹ بھیگ جائے گی۔''

''کہاں جاؤ گی......؟'' اس نے کار آگے بڑھاتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''یہ سڑک شاد باغ جاتی ہے۔ اس سے پہلے کوئی آبادی نہیں ہے اس لئے آپ یا تو شاد باغ جائیں گے یا اس سے آگے۔ مجھے شاد باغ چھوڑ دیں۔''

''ہوں......!'' اس نے آہستہ سے کہا اور نگاہیں سامنے جما دیں۔

''آپ نے مجھے دیکھا نہیں تھا یا آگے جا کے رحم آ گیا......؟'' اس نے پوچھا۔ لہجے میں شوخی اور بے باکی نمایاں تھی۔

''بے دھیانی میں تھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بڑا ظلم کرتے اگر آپ نکل جائے...... ایک گھنٹے سے پہلے کوئی بس نہ آتی اور اس وقت تک بارش نہ جانے کیا قیامت ڈھاتی۔ کمبخت اس روٹ پر صرف تین بسیں ہیں جو اپنی مرضی سے آتی جاتی ہیں۔ ذرا سی دیر ہو گئی، بارش کی وجہ سے اور بس نکل گئی۔ سوچ رہی تھی کہ واپس کالج کی عمارت میں چلی جاؤں لیکن گھر والے پریشان ہوتے اس لئے ہمت کر لی۔''

''پڑھتی ہو......؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں......! سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں۔'' وہ باتیں کرنے کی شوقین معلوم ہوتی تھی۔

''لیکن بی بی......! اس طرح لفٹ مانگنا نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

''میں بہت بہادر ہوں، جوڈو جانتی ہوں۔'' اس نے معصومیت سے کہا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لڑکی کا سراپا وہ دیکھ چکا تھا۔ دبلی پتلی، نازک اندام سی، عمر سولہ سترہ برس سے زیادہ نہیں ہو گی۔

''خوب......!'' وہ آہستہ سے بولا۔

''غلط نہیں کہہ رہی۔ روزانہ کسی سے لفٹ تھوڑی مانگتی ہوں، آج بارش کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی۔''

''ہاں......! آئندہ خیال رکھنا، ممکن ہے دوسرا بھی جوڈو ماسٹر ہو۔''

''اللہ مالک ہے۔ اب روز بارش تھوڑی ہوتی ہے۔'' اس نے اطمینان سے کہا اور پھر بولی۔

''شاد باغ آ گیا۔ بس اگلے چوراہے پر روک دیں۔''

''گھر کتنی دور ہے......؟''

"چوراہے سے زیادہ دور نہیں ہے اور پھر یہ تو اپنا علاقہ ہے۔" اس نے مردانہ وار کہا۔

"ضرورت محسوس کرو تو گھر چھوڑ دوں......؟"

"ارے باپ رے...... ماموں بنوٹ ماسٹر ہیں۔ ان کے آگے جوڈو بھی نہیں چلتے۔" اس نے شرارت آمیز انداز میں آنکھیں مٹکا کر کہا۔

"اچھا......!" وہ بولا۔

"بس پلیز......! اسی جگہ......!" لڑکی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اس نے کار کی رفتار سست کر کے اسے روک دیا۔

"احسان مند ہوں...... خدا حافظ......!" وہ دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے بولی اور پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گئی۔

ایک لمحے کے لئے اس کا دل چاہا کہ رک کر لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھے۔ اس کی چال بڑی خوب صورت تھی۔ لیکن پھر اسے مناسب محسوس نہیں ہوا۔ غیر شریفانہ حرکت تھی۔ چنانچہ وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ لیکن آج گھر پہنچ کر بھی اسے عجیب محسوس ہوا تھا۔ لڑکی کی صورت کئی بار اس کی تصور میں ابھری۔ معصوم، شوخ سی۔

"جوڈو جانتی ہوں...... روز بارش تھوڑی ہوتی ہے۔"

کئی جملے اس کے کانوں سے ٹکرائے اور اس کے دل سے کچھ نئی آوازیں ہم آہنگ ہوئیں۔

"کیا ان الفاظ میں...... اس سوچ میں بچپن نہیں تھا......؟ بچپن اور میں خود اس کے تصور میں اپنا چہرہ ابھرا۔ جسے وہ ہر روز آئینے کے سامنے بال سنوارتے ہوئے دیکھتا تھا۔ کیا میں اس کی کمسنی سے ہم آہنگ ہو سکتا ہوں۔

وہ مسہری سے اتر گیا۔ اس سے قبل چہرے پر ایسی گہری نگاہ کبھی نہیں ڈالی تھی لیکن آج...... آج اس نے بہت غور سے خود کو دیکھا۔ پکا چہرہ کسی طور دلکشی کا حامل نہیں تھا۔

وہ آئینے کے سامنے سے تھوڑا سا ہٹ گیا۔ اپنے قریب اس نے لڑکی کو کھڑا کیا اور اپنا موازنہ اس سے کرنے لگا۔ اسے خود ہی شرم آ گئی۔

"اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ مجھے اس کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچنا چاہئے۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔"

لیکن دنیا میں صرف وہی تو نہیں ہے۔ میں غیر شادی شدہ ہوں، اگر چاہوں تو بہت سی لڑکیاں جو میری عمر اور چہرے سے مناسبت رکھتی ہوں، میرے قریب آسکتی ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی شریک زندگی منتخب کیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے، اس نے اپنے خالی مکان کا جائزہ لیا جس میں داور کے علاوہ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ اگر اس مکان میں کسی وجود کا اضافہ کر دیا جائے تو...... تو اس کا حسن بے پناہ بڑھ جائے گا۔

کیوں نہ چچا سے تذکرہ کروں...... لیکن چچی...... چچی خوفزدہ ہو جائیں گی کہ اب ان کی آمدنی بند ہو جائے گی۔ وہ ہرگز یہ نہ ہونے دیں گی۔ اونہہ......! اس کی ضرورت بھی کیا ہے، جو کچھ کرنا ہے خود ہی کر لیا جائے۔

تو پھر...... دفتر کی لڑکیوں کے چہرے نگاہوں میں گھومنے لگے۔ نہ جانے کیوں اس نے آج تک اس طرح نہ سوچا تھا۔ زندگی کا ایک رخ یہ بھی تو ہے۔ بہرحال...... پہلے تلاش...... اس کے بعد کچھ اور سوچیں گے گویا اس نے ابتداء کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اسے بھی کسی مخلص ساتھی کو شریک زندگی بنا لینا چاہئے۔

دفتر کی طرف کار دوڑاتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن شام تک فائلوں میں کھو کر اس کے ذہن سے یہ خیالات نکل چکے تھے۔ کام کے معاملے میں وہ ہمیشہ مستعد تھا اور یہی اس کی خوبی تھی۔

لیکن جب نادیہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ چونک پڑا۔

خاموش طبع، خوش لباس، صورت شکل بھی بری نہیں تھی۔ اس نے ایک نظر نادیہ کو دیکھا جو اس کے سامنے کچھ فائلز رکھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے......! میں دیکھ لوں گا۔ آپ چند ساعت بیٹھیں۔'' اس نے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ آج اس کی آواز سپاٹ نہیں تھی۔ لہجے میں اخلاق بھی تھا۔ ورنہ اس سے قبل اس نے کبھی نادیہ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا تھا۔ اس کی شکل تک غور سے نہیں دیکھی تھی۔ اگر کچھ کاغذات دینے میں دیر بھی ہو جاتی تو نادیہ کھڑی رہتی چنانچہ آج بھی نادیہ نے یہی سمجھا کہ وہ غلطی سے یہ الفاظ کہہ بیٹھا ہے۔ وہ کھڑی رہی اور یہ بات محسوس کر کے بھی وہ فائل کی ورق گردانی کرتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کہے؟ پھر اس نے گردن اٹھائی۔

''ارے آپ کھڑی ہیں، بیٹھ جائیے......!''

''ٹھیک ہوں جناب......!'' نادیہ نے جواب دیا۔

''بس چند منٹ...... پلیز......! آپ بیٹھ جائیے......!'' اس نے دوسری فائل اٹھاتے ہوئے کہا لیکن اپنے الفاظ کا ردِعمل نادیہ کے چہرے پر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بہرحال نادیہ بیٹھ گئی۔

''اب کیا کہوں......؟'' وہ سوچ رہا تھا لیکن نادیہ......

''کیا ابتداء اسی سے کی جائے......؟ جلدبازی کی کیا ضرورت

ہے......؟ پہلے غور تو کر لیا جائے۔ اسے ٹھیک سے دیکھ تو لیا جائے۔'' اس نے سوچا اور پھر اس نے وہ فائل نکال لی جس سے کاغذات نکالنے تھے۔ اس کے بعد وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''مس نادیہ......! یہ کام کب تک کر لیں گی......؟''

''جب آپ حکم دیں جناب......!'' نادیہ نے کہا۔

''میں وقت کا تعین تو نہیں کر سکتا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نادیہ کو اس کے روّیے پر شدید حیرت ہوئی تھی۔ بہرحال...... وہ خوش بھی تھی جس کا اندازہ اس کی آواز سے ہوتا تھا۔

''آپ حکم دیں جناب......! میں کمپیوٹر بھی بن سکتی ہوں۔''

''نہیں......! آپ انسان ہیں، کمپیوٹر تو نہیں ہیں۔ آپ اپنی سہولت سے یہ کام شروع کریں۔ ہاں جتنے کاغذات ہو جائیں۔ وہ مجھے ضرور پہنچا دیں۔''

''جی بہتر......!'' نادیہ نے کہا اور اٹھ گئی۔ پھر جب وہ مڑ گئی تو اس نے عقب سے اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ نادیہ کی کمر بہت چوڑی تھی اور چال بھی غیر دلکش تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک کلرک تھی، دس ہزار تنخواہ پانے والی۔

''کینسل...... کینسل......'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور نادیہ کو ذہن سے نکال پھینکا۔ آج ہی اس نے ایملی کو بھی بغور دیکھا۔ سانولی لیکن دلکش۔ ہر لحاظ سے نادیہ سے اچھی تھی لیکن کرسچن تھی۔ اسے کوئی حیثیت نہیں دی جا سکتی تھی لیکن رومانس...... رومانس میں کیا حرج ہے......؟

ساڑھے چار بجے نادیہ آ گئی۔ اس نے سارے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیئے اور داد طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کتنے ہو گئے......؟'' اس نے پوچھا۔

''سب کر دیئے جناب......!'' نادیہ نے جواب دیا اور اس نے نگاہیں اٹھا کر نادیہ کو دیکھا۔ بلاشبہ اس نے نادیہ کو اپنی فہرست سے نکال دیا تھا۔ اس کے باوجود نادیہ صنف نازک تھی، کیا ضروری ہے کہ اس سے خوش اخلاقی بھی نہ برتی جائے۔ اس نے اپنے ذہن میں تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔

''بہت شکریہ مس نادیہ......! کافی کام سمیٹ لیا آپ نے۔'' وہ نرم لہجے میں بولا۔

''اور کوئی حکم سر......؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''نہیں......! باقی کل......!'' اس نے جواب دیا اور نادیہ اجازت لے کر باہر چلی گئی۔ اس نے کاغذات سمیٹ کر فائل بند کر دی۔ پھر باتھ روم جا کر چہرہ درست کیا اور بال وغیرہ سنوار کر باہر آ گیا۔ کار اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔

آج موسم صاف تھا۔ سست رفتاری سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ زندگی واقعی گھر اور دفتر تک محدود نہیں رہنی چاہئے اور پھر ایک اچھے مستقبل کے لئے دوڑ دھوپ بھی تو ضروری ہے۔ اس کے جو دوست ہیں، وہ بھی فیملی والے ہیں۔ کسی سے گھلے ملے تو دوسرے راستے بھی نکلیں گے۔ ہاں معمولات میں تھوڑی سی تبدیلی ضروری ہے اور وہ اس تبدیلی کے طریقے پر غور کرنے لگا۔

لیکن اسی وقت اس کی نگاہ اس سفید لباس پر پڑی، وہی کل والی لڑکی...... جوڈو ایکسپرٹ...... حالانکہ وہ اسے ذہن سے نکال چکا تھا۔ اس نے سوچ کا انداز بدل دیا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا۔

اس نے کار کی کھڑکی سے گردن نکال کر لڑکی کو اشارہ کیا اور لڑکی اسے دیکھنے لگی، وہ آگے نہیں بڑھی تھی۔ تب اس نے کار پیچھے کی اور اس کے قریب پہنچ گیا۔

''موسم ٹھیک ہے، میں انتظار کر لوں گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ناراض ہو گئی ہو کیا......؟ کوئی گستاخی ہو گئی مجھ سے......؟'' وہ صاف دلی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ بات نہیں ہے، میں چلی جاؤں گی۔''

''بہتر......! اگر تمہیں اعتراض ہے۔'' اس نے کہا۔

''سنئے......!'' وہ مسکرا کر بولی اور وہ رک گیا۔

''بیٹھ جاؤں......؟'' لڑکی نے شرارت سے پوچھا اور اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

''ایک بات کہوں......! آپ یقین کر لیں گے......؟'' وہ کار میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کر لوں گا......!''

''آج بھی اتفاق سے بس نکل گئی مگر میں آپ کا انتظار نہیں کر رہی تھی۔''

''کیا تمہارے خیال میں میں نے اس انداز میں سوچا ہوگا......؟''

''یہ نہیں کہہ سکتی لیکن گنجائش تو ہے۔''

''تب پھر تم یہ بھی سوچ سکتی ہو کہ میں بھی تمہاری تلاش میں اسی وقت ادھر سے گزروں گا۔''

''ایں......!'' لڑکی چند ساعت سوچتی رہی پھر ہنس پڑی۔

''ارے ہاں......! یہ چانس بھی تو ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''بلکہ تمہارے بارے میں تو یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ تمہیں میرے آنے کا کوئی علم نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے، تمہیں یہ نہیں معلوم ہوگا کہ کل میں اتفاقاً یہاں سے گزرا تھا یا یہ میرا معمول ہے جبکہ میں تمہارے بارے میں جان چکا ہوں کہ تم کالج میں پڑھتی ہو اور یہی وقت تمہاری چھٹی کا ہے۔''

''ارے واہ......! آپ نے تو میری پوزیشن بالکل صاف کر دی۔''

''جی ہاں......! تاکہ آپ فضول باتیں نہ سوچیں۔'' اس نے کہا اور لڑکی چند ساعت خاموش رہی پھر مسکرا کر بولی۔

''ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں غلط نہیں سوچیں گے لیکن کیا آپ واقعی شاد باغ سے کہیں آگے رہتے ہیں......؟''

''ہاں......! کینٹ ایریا میں۔''

''اوہ...... تب تو آپ ہمارے ذرا دور کے پڑوسی ہی ہیں۔ میری ایک پھپھو بھی کینٹ ایریا میں رہتی ہیں۔ دو تین بار ان کے ہاں جا چکی ہوں۔''

''گڈ......! کیا نام ہے تمہارا......؟''

''نبیلہ......!'' لڑکی نے جواب دیا۔

''اور آپ کا......؟'' وہ فوراً بولی۔

''جمال شاہ......!'' اس نے جواب دیا۔

''کینٹ ایریا میں کس طرف رہتے ہیں......؟''

''کوٹھی نمبر اٹھائیس۔''

''ارے......! کوٹھی نمبر پچیس میں تو میری پھپھو رہتی ہیں۔ کیا آپ

عبدالرحمن کو جانتے ہیں جو ماسٹر ربر کمپنی میں ملازم ہیں......؟''

''نہیں......! وہاں میری کسی سے جان پہچان نہیں۔''

''اونچی سوسائٹی میں یہی ایک بری بات ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے ناواقفیت کو اپنی شان سمجھتے ہیں جبکہ ہمارے شاد باغ کے کسی مکان کے سامنے کھڑے ہو کر آپ کسی کا پتا پوچھ لیں، آپ کو آپ کی مطلوبہ جگہ پر ہی پہنچایا جائے گا۔''

''ہاں......! یہ حقیقت ہے۔'' جمال شاہ نے اعتراف کیا۔

''بس پلیز......! یہیں اتار دیں۔'' نبیلہ نے شاد باغ کے چوراہے پر پہنچ کر کہا اور اس نے بھی کار روک دی۔

''نبیلہ......!'' وہ آہستہ سے بولا۔

''جی......!''

''دیکھو......! اگر کوئی بری بات تمہارے ذہن میں نہ آئے تو میں ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ دفتر سے میری چھٹی اسی وقت ہوتی ہے، تم میرا انتظار کر لیا کرو۔ تمہیں یہاں ڈراپ کرنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''حرج تو کوئی نہیں ہے اور مجھے کسی کی پرواہ بھی نہیں ہے۔'' نبیلہ نے بے باکی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے......! پھر کل......''

''خدا حافظ......!'' وہ کار سے اتر کر بولی اور جمال شاہ نے کار آگے بڑھا دی۔ لیکن اس وقت پھر اس کی ذہنی کیفیت بدل چکی تھی۔ وہ نبیلہ کے بارے میں ہی سوچتے ہوئے گھر پہنچا تھا اور پھر رات کو بستر پر لیٹ کر

بھی وہ اسے نظرانداز نہ کر سکا۔ اسے اس کی بے باکی پسند آئی تھی۔

لیکن دوسری صبح آئینے میں خود کو سنوارتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنا فیصلہ بدل ڈالا۔ وہ کسی طور نبیلہ کے قابل نہیں ہے۔ زندگی کی ساتھی درکار ہے تو بہت سی ایسی لڑکیاں مل جائیں گی جو نبیلہ سے کہیں زیادہ خوبصورت، کہیں زیادہ خوش مزاج ہوں گی۔ پھر اس معصوم لڑکی کے بارے میں ہی کیوں سوچا جائے؟ رہا معاملہ اس سے کئے ہوئے وعدے کا تو ضروری تو نہیں ہے کہ کسی نوخیز کلی کو بھونرے کی نگاہ سے ہی دیکھا جائے۔

اس فیصلے نے اسے کسی حد تک مطمئن کر دیا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے ذہن پر عورت سوار ہوگئی تھی۔ چنانچہ آج دفتر میں ایملی پر اس نے خاص طور سے نظر عنایت کی۔ ایملی نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ تقریباً چار بجے وہ اس کے آفس میں آئی تھی۔

''میرے لئے کوئی کام تو نہیں ہے سر......!'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......ایملی......! بس اب کوئی کام نہیں ہے۔''

''اگر آپ کی اجازت ہو تو چلی جاؤں......؟''

''اگر کوئی خاص کام ہو تو چلی جاؤ۔ ویسے چند منٹ اور رکو تو میں تمہیں تمہاری مطلوبہ جگہ چھوڑ دوں گا۔''

''اوہ......نہیں سر......! آج میرے منگیتر کی سالگرہ ہے، پاسکل سے میں بچپن سے محبت کرتی ہوں اور بہت جلد ہم دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ پاسکل خود مجھے لینے آئے گا۔''

''اوہ......! تب پھر آپ جائیں۔'' اس نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

فطرتاً وہ برا انسان نہیں تھا۔

''شکریہ سر......!'' ایملی نے کہا اور وہ باہر نکل گئی۔ ممکن ہے ایملی نے اسے باز رکھنے کے لئے ہی یہ کہانی سنائی ہو۔ شام کو پانچ بجے دفتر سے نکلتے ہوئے نبیلہ یاد آ گئی لیکن اب اس یاد کے ساتھ کوئی الجھن نہیں تھی۔

آج وہ نبیلہ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی سے ملا۔

''ہیلو نبیلہ......! میں لیٹ تو نہیں ہوا......؟''

''بالکل نہیں......!'' نبیلہ نے بھی بے تکلفی سے کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گئی۔ اس نے کار آگے بڑھا دی۔

''کوئی نئی خبر......!''

''کوئی خاص نہیں......! ویسے میری سہیلیاں آج پوچھ رہی تھیں کہ میں بس میں کیوں سوار نہیں ہوئی......؟''

''کیا جواب دیا تم نے......؟''

''ارے...... پچاس جواب ہوتے ہیں۔ اس میں الجھن کی کوئی بات تو نہیں تھی۔'' اس نے جواب دیا اور پھر راستے میں کئی باتیں ہوئیں، پھر اس نے نبیلہ کو چوراہے پر اتارا اور خود گھر پہنچ گیا لیکن آج کی شام نبیلہ کے نام نہیں تھی، آج وہ بہت پرسکون تھا۔

دوسرے دن دوپہر کو اس کے دوست ارسلان کا فون آ گیا۔

''یار......! بڑے بے مروت انسان ہو۔ مصروف تو ہم بھی ہیں لیکن ایسے بھی نہیں، کیا کرتے رہتے ہو......؟''

''کچھ نہیں یار......! میں خود بھی سوچ رہا تھا۔ بہت دن ہو گئے، ملاقات نہیں ہوئی۔''

’’بہت خوب......! دوستوں سے ملاقات کے لئے بھی سوچتے ہو......؟‘‘

’’آؤں گا...... پرسوں آؤں گا۔‘‘

’’جی نہیں......! آپ کل آئیں گے۔‘‘

’’کل......؟‘‘

’’ہاں......!‘‘

’’شام کو......؟‘‘

’’ہاں......! تقریباً سات بجے۔ آپ کی بھابی جان کی سالگرہ ہے اور اگر آپ نہ آئے تو تعلقات ختم ہو جائیں گے۔‘‘ ارسلان نے جواب دیا۔

’’ایک شرط پر......!‘‘ وہ مسکرا کر بولا۔

’’کہو کہو......!‘‘

’’بھابی سے کہہ کر میری بھی شادی کرا دو۔‘‘

’’کل ہی لو...... سہرا وغیرہ خریدتے لانا۔ کھڑے کھڑے ہو جائے گی۔‘‘ وہ بولا اور جمال شاہ ہنسنے لگا۔

’’یہ بات ہے تو میں آ رہا ہوں۔‘‘ اس نے جواب دیا اور فون بند کر دیا۔ اس دوران نادیہ اندر آ گئی تھی۔ اس نے کچھ خطوط اس کے سامنے رکھ دیئے اور کھڑی رہی۔

’’شکریہ مس نادیہ......! بس اور کوئی کام نہیں ہے۔‘‘ اس نے نادیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا اور وہ واپس مڑ گئی لیکن اس کے انداز میں عجیب سی کیفیت تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ بہار صرف ایک دن کے لئے کیوں آئی تھی؟

نادیہ کے جانے کے بعد وہ ارسلان کے فون کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوئی تحفہ بھی خریدنا ہوگا۔ کل ذرا جلدی اٹھ جاؤں گا۔ اس نے فیصلہ کیا۔ پھر حسب معمول شام کو نبیلہ کو ڈراپ کرنے کے بعد گھر پہنچا۔

دوسرے دن وہ جلد ہی دفتر سے اٹھ گیا۔ واپسی میں بازار گیا، وہاں سے ایک خوب صورت اور قیمتی لاکٹ خریدا اور پھر کچھ وقت ایک ریستوران میں گزارا تاکہ نبیلہ کو اس کے کالج سے لے سکے۔ نبیلہ حسب معمول اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اب وہ اطمینان سے دروازہ کھول کر اس کے نزدیک ہی بیٹھ جاتی تھی اور راستے بھر باتیں کرتی رہتی تھی۔ نبیلہ کو چھوڑ کر وہ گھر پہنچا اور پھر ایک خوب صورت لباس پہن کر ٹھیک وقت پر چل پڑا۔

اپنے چھوٹے سے خوب صورت بنگلے میں ارسلان نے اس کا استقبال کیا۔ دوسرے بہت سے مہمان بھی جمع تھے۔ سالگرہ ہوئی اور قہقہے ابھرنے لگے۔ ارسلان ایک زندہ دل نوجوان تھا اور اس کے دوست بھی خوب تھے۔ کئی نئے لوگوں سے تعارف ہوا۔ پھر مہمان رخصت ہونے لگے لیکن ارسلان نے جمال کو روک لیا۔

’’یار......! تمہاری کون سی بیوی انتظار کر رہی ہوگی۔ رک جاؤ، اب کل جانا۔ رات کو فرصت سے باتیں ہوں گی۔‘‘ ارسلان نے کہا اور وہ مان بھی گیا۔ سالگرہ میں کئی خوب صورت لڑکیاں بھی نظر آئی تھیں۔

پھر ارسلان اور اس کے دو بے تکلف دوست اور ان کی بیگمات سب ایک جگہ بیٹھ گئے اور خوش گپیاں ہونے لگیں۔

’’یار......! یقین کرو۔ ہم میں تم سب سے زیادہ خوش قسمت ہو۔‘‘ ارسلان نے کہا۔

"کیوں......؟"

"اس لئے کہ تم نے شادی نہیں کی۔"

"کیا شادی انسان کی ضرورت نہیں......؟"

"ہے......! لیکن ایسی ضرورت جس کے پورا ہونے میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔"

"آخر کیوں......؟"

"اس لئے کہ شادی کے بعد انسان بڑی بڑی نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ تنہا ہو تو زندگی میں عیش ہی عیش ہوتے ہیں۔"

"تعجب ہے...... میں تو تنہا صرف بور ہوتا رہتا ہوں۔"

"اس لئے کہ یاروں سے مہینوں میں ملتے ہو، اگر روزانہ آجایا کرو تو......" ارسلان نے کہا اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

"تو......؟" اس نے پوچھا۔

"ایسے نہیں شاگردی اختیار کرو۔ اس کے بعد تمہاری حالت زار پر توجہ دی جاسکتی ہے۔"

"شاگردی اختیار کرنے کے کیا طریقے ہوں گے......؟" اس نے نڈھال لہجے میں کہا۔

"ہوں......! بچہ کافی پریشان معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ٹھیک ہے...... فی الحال تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ روزانہ شام کو سات بجے یہاں پر حاضری دینا ہوگی۔"

"بہت بہتر......!" جمال نے جواب دیا۔

"فی الحال یہیں سے ابتداء کرو اور صرف آج اجازت دی جاسکتی

ہے، کل سے معمولات پر عمل کیا جائے گا۔"

"جی بہتر......!" جمال شاہ ہنستے ہوئے بولا۔

پھر کافی رات گئے اسے بمشکل واپسی کی اجازت مل سکی تھی۔

دوسرا دن چھٹی کا تھا، صبح دیر تک سوتا رہا کیونکہ رات بہت دیر تک جاگا تھا۔ تقریباً پونے گیارہ بجے داور نے ہی اسے اٹھایا تھا اور ناشتے کے لئے کہا تھا۔ چنانچہ داور کے کہنے سے اٹھنا پڑا۔

چھٹی کا دن بے اعتدالی کا دن ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ دوپہر کا کھانا تو گول ہی ہو چکا تھا...... شام کو چائے پی جس سے طبیعت کو کسی قدر فرحت محسوس ہوئی اور پھر وہ ارسلان کی طرف جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

آج تو نبیلہ سے ملاقات نہیں ہوگی۔ اس نے سوچا اور ایک لمحے کے لئے وہ اس کے خیالات میں کھو سا گیا۔ نبیلہ جیسے وہ اس حیثیت سے نکال چکا تھا جس کے تحت اس نے پہلی بار نبیلہ کو دیکھا تھا، لیکن اسی بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ نبیلہ سے ایک چھوٹی سی ملاقات اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر چھوڑ گئی تھی۔

نبیلہ کی خوب صورت باتوں سے متاثر ہو کر ہی اس نے عورت کے بارے میں سوچا تھا اور یہ بھی اس کی اپنی سوچ تھی کہ نبیلہ چونکہ چھوٹی عمر کی ہے اس لئے اس کی طرف اس قسم کی نگاہ ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ خاص طور سے اس جیسے شخص کے لئے۔ حالانکہ نبیلہ کے انداز سے یہ پتا چلتا تھا کہ وہ جمال شاہ سے کافی متاثر ہے۔ اس کے باوجود جمال شاہ اپنے ذہن میں نبیلہ کے لئے برا ارادہ نہیں پاتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر یہ معصوم لڑکی بہک بھی گئی تو اسے سنبھالنے کی کوشش کرے گا۔

شام کو ساڑھے چھ بجے وہ ارسلان کے مکان پر تھا۔ یہاں مشتاق، فاروق، ارسلان کے کچھ اور دوست بھی موجود تھے۔ گفتگو کا موضوع شاید وہی تھا کیونکہ ارسلان اسے دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''لو...... میرا ذہین ترین شاگرد آ گیا۔ کم از کم سعادت مند تو ہے۔ آؤ...... بیٹے آؤ......! میں نے تمہارے لئے سارے انتظامات کر لئے ہیں۔''

ارسلان بہت بے تکلف آدمی تھا۔ ارسلان نے اس کا باقی لوگوں سے تعارف کرایا۔ حالانکہ ان لوگوں سے ایک دن پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ارسلان نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا خیال ہے...... پھر چلیں......؟''

''بالکل چلو......!'' جمال شاہ نے بھی اپنی کار وہیں چھوڑ دی اور ارسلان کی بڑی کار میں بیٹھ کر وہ سب چل پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد کار ایک خوب صورت عمارت کے باہر رک گئی۔ عمارت کے قریب پہنچ کر وہ سب اتر گئے۔ پھر ایک عمدہ ٹائلز کی روش سے گزر کر اندر عمارت کے دروازے تک پہنچ گئے جہاں باوردی چوکیدار کھڑا ہوا تھا۔ اس نے شیشے کا ایک بڑا دروازہ کھول دیا اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ اندر داخل ہوتے ہوئے جمال شاہ چونکا ضرور تھا۔

جمال شاہ کو اس ماحول سے واسطہ تو نہیں پڑا تھا لیکن بہرحال وہ اجنبی بھی نہیں تھا۔ دنیا دیکھے ہوئے تھا اور یہ جانتا تھا کہ یہ بار ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس کے ذہن میں ہلکی سی الجھن پیدا ہوئی لیکن پھر اس نے سوچا کہ یہ لوگ جس انداز سے زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو میں کیوں ان سے پیچھے رہوں؟

نہ جانے کیوں یہ باغیانہ خیالات اس کے ذہن میں پیدا ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ایک میز سنبھال لی تھی۔

''پی ہے کبھی......؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''نہیں......! کبھی نہیں......!''

''پارسا بن رہے ہو......؟''

''استاد کے سامنے جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' جمال شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے......! بچے کے لئے ذرا ہلکی منگواؤ اور صرف تین پیگ۔'' ارسلان نے کہا اور ویٹر کو اشارہ کر دیا۔ ویٹر نزدیک آ گیا اور ارسلان اسے آرڈر دینے لگا۔ اس نے ویٹر سے کہا۔

''شرمیلا کہاں ہے......؟''

''موجود ہیں جناب......!'' ویٹر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس سے کہو...... ارسلان صاحب بلاتے ہیں۔'' ویٹر نے ادب سے گردن جھکائی۔

''استاد......!'' اس نے ارسلان کو مخاطب کیا۔

''کیا...... کہو کیا بات ہے......؟''

''پی لوں گا تو گھر کیسے جاؤں گا......؟''

''آج بہت ہلکی ہو گی اور اس کے باوجود تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ارسلان نے کہا۔

شراب کے پہلے پیگ نے اس کے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا۔

دوسرے پیگ پر شرمیلا آ گئی۔ شوخ آنکھوں اور مسکرانے پر گالوں میں گڑھے پڑ جانے والی خوب صورت لڑکی۔ خوب صورت لباس اور اس سے اٹھتی ہوئی نفیس خوشبو سے اس کے خوش ذوق ہونے کا پتا چلتا تھا۔

''ہمارے نئے دوست...... جمال شاہ......! قابل احترام...... پہلی بار پی رہے ہیں، اور جمال......! یہ ہیں ہماری بہترین دوست شرمیلا......!''

''پلیز......! نائس ٹو میٹ یو......!'' شرمیلا نے اپنا نرم و گرم ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور دیر تک نہ چھوڑا۔ جمال کا بدن بھی گرم ہونے لگا۔

''پی چکے ہیں......؟''

''پہلا پیگ......!'' ارسلان نے جواب دیا۔

''برا کیا......! اگر میرے ہی ہاتھ سے افتتاح ہوتا تو لطف ہی دوسرا ہوتا...... خیر اب سہی......!'' اس نے جمال شاہ کے لئے ایک جام بنایا۔

''اوہ شرمیلا......! خیال رکھو...... نیا پنچھی ہے۔''

''ان کی پرواز میں کمی نہ ہوگی۔ ہم شرابیوں کی دعا ہے۔'' شرمیلا نے ہنستے ہوئے پیگ جمال شاہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

جمال شاہ کو پہلا ہی پیگ سرور دینے لگا تھا۔

اب اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ شرمیلا اسے آسمان سے اتری ہوئی حور لگ رہی تھی۔ اس نے شرمیلا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور شرمیلا اسے دیکھنے لگی۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں تمہیں شاد کر دوں گی۔'' شرمیلا نے کہا۔

''تو لے جاؤ اسے...... تمہیں بخشا......!'' ارسلان نے مسرور لہجے

میں کہا اور شرمیلا گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ارے......! یاروں پر جان نچھاور......! یہ رکھو......!'' ارسلان نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر شرمیلا کے پرس میں ٹھونس دیئے۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ شرمیلا اسے کس طرح اور کہاں لے گئی۔ کوئی ہوش ہی نہ رہا تھا۔ ہاں صبح کو وہ ایک اجنبی بیڈ روم میں تھا اور اس انداز میں تھا کہ خود ہل گیا۔ اسے خود سے شرم محسوس ہونے لگی۔ وہ جلدی سے اٹھ گیا اور پھر فوراً تیار ہو کر کمرے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ دروازے سے نکلتے ہی اس کی مڈبھیڑ شرمیلا سے ہوگئی۔ رات میں اور اس وقت میں بہت فرق تھا، اس وقت وہ منحوس شکل لگ رہی تھی، اسے دیکھ کر مسکرائی۔

''ہیلو...... جمال شاہ......!''

''میں جانا چاہتا ہوں۔''

''ارے ناشتہ وغیرہ نہیں کرو گے۔ چلے جانا...... ایسی بھی کیا جلدی ہے......؟''

''سوری......! مجھے پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔ دفتر بھی جانا ہے۔'' اس نے معذرت آمیز انداز میں کہا، اس دوران میں اس نے ایک بار بھی شرمیلا سے نظریں نہیں ملائی تھیں اور اس کی اس کیفیت پر شرمیلا مسکرا رہی تھی۔

''جیسی تمہاری مرضی......!'' اس نے کہا اور پھر وہ باہر تک اسے چھوڑنے آئی۔ جب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا تو بولی۔

''اب تمہیں کلب کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں جمال......! ہم دوست تو بن ہی چکے ہیں، جب دل چاہے چلے آنا......!''

''بہتر......!'' اس نے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ پھر

ایک ٹیکسی لے کر ارسلان کے مکان کی طرف چل پڑا۔ ارسلان تو موجود نہیں تھا، اس کی بیوی نے جمال کو کار کی چابی دی اور بتایا کہ ارسلان جاتے ہوئے یہ چابی اسے دے گیا تھا۔ گھر جانے کے بجائے وہ سیدھا دفتر کی طرف چل پڑا۔

گو لباس وغیرہ درست نہیں تھا۔ اس سے پہلے کبھی وہ اس حالت میں دفتر نہیں آیا تھا۔ آج پہلی بار دفتر کے کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا اور ذہن میں عجیب خیالات آ رہے تھے۔ وہ ان خیالات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود کو کام میں مشغول رکھنا چاہتا تھا۔ نادیہ کے آنے پر بھی اس نے گردن نہیں اٹھائی۔ ویسے مخصوص خوشبو سے اس نے پہچان لیا تھا کہ وہ نادیہ ہے۔ اس نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کی پھر پھیکے انداز میں مسکرا کر بولا۔

''فرمائیے مس نادیہ......!''

''کوئی کام نہیں ہے سر......! میں آپ کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔''

''کیوں...... مجھے کیا ہوا ہے......؟''

''آپ شکل سے بیمار معلوم ہو رہے ہیں۔''

''اوہ......!'' وہ آہستہ سے بولا۔

''ہاں...... مس نادیہ......! میرے سر میں درد ہے۔''

''چھٹی کر لی ہوتی سر......! آپ اب بھی فائلوں میں الجھے ہوئے ہیں۔'' نادیہ کے لہجے میں بڑی اپنائیت تھی۔ اس کے لہجے نے اسے متاثر کیا اور وہ کسی قدر نرم ہو گیا۔

''چھٹی کر کے کیا کرتا مس نادیہ......! تنہا انسان ہوں، گھر پر بھی

پڑے رہ کر کیا کرتا......؟'' نادیہ نہ جانے کیوں خاموش ہو گئی، چند ساعت کی خاموشی کے بعد بولی۔

''آپ کے لئے چائے یا کافی منگواؤں سر......!''

''آج تو ناشتہ بھی نہیں کیا میں نے۔''

''میں ابھی بھجواتی ہوں۔'' نادیہ جلدی سے باہر کی طرف چلی گئی۔ اس کے باہر نکل جانے کے بعد بھی وہ دروازے کو گھورتا رہا۔ اسے رات کے واقعات کا بڑا رنج تھا۔

دوپہر کو مس ایملی تشریف لائیں۔ کسی کام سے ہی آئی تھیں۔ جمال شاہ کو دیکھ کر کافی دیر تک خاموش کھڑی رہیں۔

''فرمائیے مس ایملی......!''

''سر......! یہ کچھ کاغذات ہیں لیکن آپ کچھ بیمار لگ رہے ہیں......؟''

''نہیں......! میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے کاغذات اپنے سامنے سرکا لئے۔ اس نے ایملی کی صورت دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''سر......! کیا میری کسی بات سے آپ کو دکھ ہوا ہے......؟''

''مس ایملی......! براہ کرم آپ پہیلیاں نہ بجھوائیں، کیا کہنا چاہتی ہیں، صاف صاف کہیں۔'' اس نے خشک اور کھردرے لہجے میں کہا۔

''دراصل سر......! میں محسوس کر رہی ہوں کہ ممکن ہے میری وجہ سے آپ کسی الجھن کا شکار ہیں۔''

''اوہ......!'' جمال شاہ نے گہری سانس لی۔ ایملی کی بات اب اس کی سمجھ میں آئی تھی لیکن اس بات سے وہ چراغ پا نہیں ہوا بلکہ اس کے

ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''مس ایمیلی......! تشریف رکھئے اور فرمایئے کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہیں......؟''

اس کے انداز سے ایمیلی گھبرا گئی۔ پھر وہ قدرے بدحواس لہجے میں بولی۔

''مم...... میرا کوئی غلط مطلب نہیں ہے سر......! سوری......!'' اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

''بے وقوف......! غالباً سوچ رہی ہے کہ اس کے عشق میں ناکام ہو کر میری یہ حالت ہوئی ہے......اونہہ......!''

شام تک وقت ایسی ہی فضول باتوں میں گزرا۔ کام بھی پوری دل جمعی سے نہیں ہوا تھا۔ پانچ بجنے والے تھے، چنانچہ وہ باہر نکل آیا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا تو اچانک ہی نبیلہ کا خیال آ گیا۔ وہ چونک پڑا تھا۔ نبیلہ اب تک اس کے ذہن سے محو رہی تھی۔ اس کا سراپا جمال شاہ کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

کار اس چوراہے تک پہنچ گئی تھی جہاں اسے نبیلہ نظر آتی تھی۔ چند ساعت کے بعد اس نے دور سے سفید لباس کو دیکھ لیا۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک نبیلہ کو دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔

کار آہستہ آہستہ نبیلہ تک پہنچ کر رک گئی۔ نبیلہ نے مسکراتے ہوئے اسے سلام کیا اور پھر وہ دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

دوسرے ہی لمحے وہ بھی اسے دیکھ کر چونک پڑی۔

''جمال صاحب......! خیریت......؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں

کہا۔

''جی ہاں......! بالکل خیریت ہے......نبیلہ......!''

''نہیں......! کوئی خاص بات ضرور ہے۔ آپ...... آپ کچھ پریشان سے...... کچھ بیمار سے نظر آ رہے ہیں......؟''

''اب اس میں میرا کیا قصور ہے مس نبیلہ......! دراصل میں نے شیو نہیں بنایا۔ رات کو نیند پوری نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ سے یہ حلیہ ہو گیا ہے۔'' جمال شاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہو......! یہ بات ہے۔'' نبیلہ مطمئن ہو گئی۔ پھر بولی۔

''کل تو میں آپ کی طرف گئی تھی۔''

''میری طرف......؟'' وہ حیرت سے چونک پڑا۔

''جی ہاں......! کل ممانی جان، پھپھو کے ہاں گئی تھیں، میں بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔ ممانی جان سے میں نے کہا کہ یہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

''آپ ناراض تو نہیں ہوئے......؟''

''نہیں......!'' جمال شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا ہوا......؟''

''بس ہوتا کیا...... آپ کے ہاں پہنچی تو ایک شخص باہر نکلا، کہنے لگا صاحب نہیں ہیں۔''

''مجھے بڑا افسوس ہے مس نبیلہ......! آپ وہاں گئیں اور مجھ سے ملاقات بھی نہ ہو سکی۔''

''اس میں افسوس کی کیا بات ہے جمال صاحب......! کل نہ سہی پھر

سہی۔'' نبیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں......! ضرور تشریف لایئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔''
جمال شاہ نے خلوص سے کہا۔

بس اب اس لڑکی کے بارے میں کوئی برا خیال ابھرتا ہی نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں جمال شاہ کو اس سے عقیدت سی ہوگئی تھی۔ نبیلہ کی باتوں سے بھی اس قسم کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ وہ جمال سے ایک مرد ہونے کی حیثیت سے متاثر ہوئی ہے۔

''اب آپ گھر جا کر اپنا حلیہ درست کریں...... مجھے بالکل اچھے نہیں لگ رہے۔''

''بہت بہتر......!'' اس نے بھی مسخرے پن سے جواب دیا۔ حسب معمول چوراہے کے قریب نبیلہ اتر گئی۔ اور وہ آگے بڑھ گیا۔

جمال شاہ اپنے خیالوں میں گم گھر پہنچ گیا۔ چائے پینے کے دوران میں اس کے ذہن میں پھر وہی خیالات آگئے۔ تب اس نے سوچا۔

''ارسلان گری ہوئی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔ سوسائٹی میں ایک مقام ہے، کیا شرمیلا کے ساتھ وہ نہیں گیا ہوگا......؟ کیا اس کا دوست...... سب ہی تو پیتے ہیں۔ سب ہی تو زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میں کیوں شرم سے کٹا جا رہا ہوں......؟ یہ تو زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ اعلیٰ سوسائٹی کا حصہ ہے۔''

اور اس نے محسوس کیا کہ ان خیالات نے اس کے ذہن کے بوجھ میں کمی کر دی تھی۔ رات کو بھی سکون سے سویا اور دوسری صبح وہ ہشاش بشاش تھا۔ شیو بنا کر غسل کیا۔

آج دفتر میں کوئی خاص احساس ذہن میں بیدار نہیں ہوا۔ نادیہ اور ایمبلی دونوں ہی سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ہاں دوپہر کو ارسلان کا فون آیا اور اس نے ریسور اٹھالیا۔

''مسٹر جمال شاہ......!''

''خادم ارسلان ہے۔''

''اوہ...... ارسلان......! خیریت......؟''

''یہاں خیریت ہے، تم سناؤ......!''

''تمہاری دعا ہے۔''

''صرف دُعا......؟ یا دوا بھی کارآمد ہوئی ہے......؟''

''دونوں......!''

''بہت خوب......! آج کس وقت آ رہے ہو......؟''

''آج......؟''

''ہاں......! وعدہ بھول گئے......؟''

''نہیں......! لیکن ارسلان......! دوسرے دن پریشانی ہوتی ہے۔''

''کیسی پریشانی......؟''

''دفتر جانے کی...... کیوں نہ چھٹی کا دن رکھا جائے......؟''

''جمال شاہ......!'' ارسلان نے ڈانٹ کر کہا۔

''زبان کھولتے ہو استادوں کے سامنے......!''

''اوہ...... معاف کیجئے گا استاد......! لیکن......''

''اس کا حل بھی سوچ لیا جائے گا۔ ویسے بھی آج کلب کا پروگرام نہیں ہے۔''

"پھر......؟"

"ٹھیک سات بجے تم میرے محل پر پہنچ جاؤ......!"

"جی بہتر......! تعمیل ارشاد ہوگی۔" اس نے کہا اور ارسلان نے بائے کہہ کر فون بند کر دیا۔ ریسیور رکھ کر مسکرانے لگا۔

سارے کام حسب معمول رہے۔ نبیلہ کو اس کی جگہ چھوڑا اور سات بجے سے پہلے ہی تیار ہو کر باہر نکل آیا۔

ارسلان کے ساتھ اس کے دوسرے دوست بھی تھے۔ جمال شاہ کا استقبال بہت پرتپاک انداز میں کیا گیا۔ وہ سب تیار تھے، اس کے پہنچتے ہی ارسلان نے کہا۔

"کیوں بھئی......! چائے وغیرہ کا پروگرام ہے یا چلیں......؟"

"میرا خیال ہے، چلو......! فرخ منتظر ہوگا۔"

"اداس ہوگا بے چارہ......!" ریاض نے کہا۔

"تب پھر چلو، باقی کام اس کا ہے۔" ارسلان نے کہا۔

"دونوں گاڑیاں لے چلتے ہیں۔" فرید بولا اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں کاریں ایک سڑک پر دوڑ رہی تھیں۔ ارسلان، جمال شاہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کار ریاض چلا رہا تھا۔

"فرخ کی شادی کی سالگرہ ہے۔ اس کے والد محمد بخش بہت بڑے مل اونر تھے۔ اپنی زندگی میں بے حد کنجوس، فرخ نے اس سے قبل کبھی سالگرہ نہیں منائی۔ اس نے تو اپنی شادی کی کوئی عمدہ پارٹی بھی نہیں دی تھی۔ اس لئے آج وہ ساری کسر پوری کر رہا ہے۔ کیونکہ محمد بخش خدا کو پیارے ہو چکے ہیں۔"

"خوب......! تو میں تو بن بلایا مہمان رہا۔" جمال شاہ نے کہا۔

"فرخ بے تکلف دوست ہے۔ یہ خیال ذہن میں نہ لاؤ۔"

وہ سب فرخ کی خوب صورت کوٹھی میں داخل ہوگئے۔ فرخ بلاشبہ انتہائی خوش مزاج نوجوان تھا۔ اس کی بیوی بھی اس سے کم نہیں تھی۔ وہ سارے لوازمات یہاں موجود تھے جو ایسی جدید ترین پارٹیوں میں ہوتے ہیں۔ رقص و سرور، شراب و کباب، قہقہے، ہنگامے......

جمال شاہ نے بھی پی۔ کئی لڑکیاں بھی اس کے قریب آئیں۔ ان میں نسرین بھی تھی جو اس کے بہت قریب آگئی تھی۔ اس نے شراب پینے کے بعد نہایت بے تکلفی سے جمال شاہ کو بوسہ بھی دیا لیکن آج جمال نارمل ہی رہا۔

رات تین بجے اس نے اجازت طلب کر لی۔ ذہن پر سرور طاری تھا لیکن ڈرائیونگ میں اسے کوئی دقت نہیں پیش آئی اور وہ گھر پہنچ گیا اور اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔

دوسرے یا تیسرے دن کوئی نہ کوئی پروگرام بن جاتا۔ نبیلہ کا معمول بھی وہی تھا۔ اسے نبیلہ سے ایک عجیب سی انسیت ہوگئی تھی۔ کہیں بھی ہوتا، پانچ بجے نبیلہ کو اس کے گھر کے قریب چوراہے پر ضرور چھوڑ دیتا۔

پھر ایک دن نبیلہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے بڑی محبت سے نبیلہ کی خاطر مدارات کی۔ نبیلہ خود ہی اس کے پورے گھر میں گھومتی رہی۔ اس نے کچن میں جا کر کھانا پکانے میں بھی مدد کی اور پھر دوپہر کا کھانا بھی اس کے ساتھ کھایا۔

نبیلہ کے والدین مر چکے تھے۔ ماموں اور ممانی نے پرورش کی تھی۔

ممانی کی بھی ایک بیٹی تھی لیکن وہ اسے بھی اپنی بیٹی شبانہ کی طرح ہی چاہتی تھیں۔

پھر نبیلہ چلی گئی اور اس نے شراب کی بوتل نکال لی۔ اب وہ روزانہ پینے لگا تھا۔ اس کے بغیر اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ گناہ و ثواب کا تصور اس کے ذہن سے مٹ چکا تھا۔ شراب پینے کے بعد اسے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اکثر سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ ایسے میں اسے خیال آتا کہ اگر اس کی شادی ہوگئی ہوتی تو......

چچا، چچی کو اس نے رقم بھیجنا بند کر دی تھی۔ اسے اب ان لوگوں پر غصہ آنے لگا تھا۔ آخر یہ خراج وہ کب تک ادا کرتا رہے گا؟ کوئی ٹھیکہ لیا ہوا ہے؟ نبیلہ اسی دوران کئی بار اس کے گھر آ چکی تھی اور وہ یہاں آ کر بہت خوش ہوتی تھی۔

یہ چھٹی کا دن تھا۔ موسم ابر آلود تھا اور اس کے بدن میں انگڑائیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ ارسلان کو فون کیا تو اس کی بیوی نے جواب دیا کہ وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ ریاض اور دوسرے لوگوں سے اتنی دوستی نہیں تھی۔

بہر حال...... اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر پر ہی رہے گا لیکن کوئی ساتھی...... کوئی حسین ساتھی...... شراب کی تلخی، جلن دور کرنے کے لئے کسی ساتھی کی طلب شدت رکھتی تھی اور وہ بڑی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔

''آہ...... زندگی کس قدر تنہا ہے، میں کتنا اکیلا ہوں۔'' اس نے سوچا اور اسے خود پر رحم آنے لگا۔ گھر سے باہر کی دنیا میں بے شمار وقتی ساتھی موجود ہیں لیکن یہ ساتھی...... خود اپنا مذاق ہوتے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اپنے نہیں ہیں، انہیں ہماری ذات سے دلچسپی نہیں ہے۔ بس وہ سکون

کے تاجر ہیں۔ معاوضہ لیتے ہیں، قربت بخش دیتے ہیں......بس۔

وہ نشست گاہ میں پہنچ گیا۔ شراب نکالی اور سامنے رکھ لی اور پھر شراب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ شراب اس کے ذہن پر اثر کرتی رہی لیکن سکون اب بھی نہیں ملا تھا۔ ایک بے چینی، بے کلی، اب بھی باقی تھی۔ گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آ رہی تھیں اور موسم بڑا سرور انگیز ہوگیا تھا۔

آج اس نے کچھ زیادہ پی لی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سارے احساسات شراب میں ڈوب جائیں۔ کوئی محرومی، کوئی طلب باقی نہ رہے لیکن اچانک نہ جانے کون آ گیا تھا؟ بیل کئی بار بجی۔ تب اس نے شراب کی بوتل الماری میں بند کر دی۔ ہونٹ خشک کئے اور دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔

لیکن جونہی دروازہ کھولا۔ اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ ایک حسین نسوانی وجود اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''یہ سونے کا وقت ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ شاید ہی گھر پر ملیں۔'' نبیلہ کی آواز ابھری۔

''آؤ......!'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ آج نبیلہ سے اس کی انسیت، اس کا احساس بدل گیا تھا۔ یہ وہ معصوم اور نوخیز لڑکی نہیں تھی جس کے لئے وہ اپنے ذہن کے خانوں میں تبدیلیاں کر چکا تھا اور اس نے اسے عورت کی حیثیت سے دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ اس کے لئے ایک مقدس جذبہ بن گئی تھی۔ وہ جذبہ جسے کوئی نام نہیں دیا گیا تھا سوائے اس کی نسوانیت کی حفاظت کے لیکن شراب نے اس سے اس کے وہ خیالات چھین لئے۔ اسے ہمت بخش دی اور اس وقت تو اسے کسی حسین ساتھی کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

چنانچہ اس کی نگاہوں کے انداز بدل گئے۔

''سو گئے تھے آپ......؟'' نبیلہ نے حسب معمول بے تکلفی سے پوچھا اور گھر میں داخل ہوگئی۔ اس کے ذہن میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ وہ پہلی بار یہاں نہیں آئی تھی۔ اوّل تو وہ فطرتاً بے باک تھی، دوسرے یہ کہ وہ کئی بار جمال شاہ کے گھر آ چکی تھی۔ اس کے ساتھ کار میں سفر کر چکی تھی۔ ایک مرتبہ بھی اس نے جمال شاہ کے انداز میں کوئی خامی نہیں پائی تھی۔ پھر وہ شک کیسے کر سکتی تھی؟

''سویا نہیں تھا۔'' جمال شاہ نے جواب دیا۔

''آنکھیں تو یہی بتاتی ہیں۔''

''اوہ......آنکھوں پر اعتبار مت کیا کرو نبیلہ......!''

''خوب...... خوب...... موسم ہی شاعری کا ہے۔ آپ کا کیا قصور......؟'' وہ ہنستے ہوئے بولی اور وہ خود بھی ہنسنے لگا پھر اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔

''بیٹھو......!'' اس نے کہا اور وہ بے تکلفی سے اپنا پرس رکھ کر بیٹھ گئی۔

''تو پھر کیا کر رہے تھے جناب......!''

''اپنی الجھنوں سے نبرد آزما تھا۔''

''الجھنوں سے......؟''

''ہاں......!''

''یہ اچانک کون سی الجھنیں پیش آ گئیں......؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''زندگی بذات خود بہت بڑی الجھن ہے نبیلہ......!''

''اوہ...... یہ موسم انسان کو شاعرانہ ذوق ضرور بخش دیتا ہے لیکن اس شاعری میں یاسیت نہیں شامل ہونی چاہئے۔''

''وجہ ہے اس کی......؟''

''کیا وجہ ہے......؟ مجھے بتائیے......!'' نبیلہ نے اس انداز میں کہا جیسے وہ وجہ جاننے کا بہت بڑا حق رکھتی ہو۔

''تمہارے ماموں ممانی کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے......؟''

''بہت اچھا......! وہ مجھے خود سے الگ نہیں سمجھتے۔''

''کیا وہ تمہارے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں......؟''

''کیوں نہیں......! ان کی خواہش ہے کہ میں ایک اچھی زندگی حاصل کر لوں۔''

''تب تم میرا درد نہیں سمجھ سکتیں۔''

''کیا مطلب......؟''

''مجھ میں اور تم میں فرق ہے۔ تم ایک خوش مزاج لڑکی ہو، اچھا گھر اور اچھی زندگی، اچھے ساتھی رکھتی ہو، اس کے برعکس میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرا ماضی زیادہ خوشگوار نہیں ہے اور حال بھی۔ تنہائی کی زندگی میرے لئے موت ہے۔ اس خوشگوار موسم میں بھی میں تنہائیوں میں گرفتار ہوں۔'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوہ...... جمال صاحب......! آپ...... آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے......؟ آپ خود اپنے بارے میں سوچئے......! ایک اچھی شریک زندگی آپ کی تنہائی دور کر دے گی۔''

''میں اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہا۔
نبیلہ......! مجھے کسی ایسے ہمدرد کی ضرورت ہے جو...... جو میرے بارے میں
سوچے...... میرے لئے کچھ کرے اور یوں لگتا ہے جیسے...... جیسے میری زندگی
میں ایسا کوئی ہمدرد نہ ہو۔''

''ایسی بات تو نہیں ہے جمال صاحب......! کیا آپ مجھے بھی
اپنوں میں نہیں سمجھتے......؟'' نبیلہ ہمدردی سے بولی۔

''تم...... تم میرے لئے کیا کر سکتی ہو......؟'' جمال کی آنکھوں
میں آگ جل اٹھی۔ نبیلہ اس وقت اسے ایک حسین دوشیزہ نظر آ رہی تھی۔
شراب کی آگ اس کے رگ و پے میں سلگ رہی تھی۔ سارے پاکیزہ
خیالات جل گئے تھے۔ وہ اس وقت صرف ایک دوشیزہ تھی، ایک نوجوان
دوشیزہ۔

''آپ کے لئے اپنے دل میں ایک عقیدت رکھتی ہوں۔ ایک ایسا
مقام، ایک ایسا جذبہ رکھتی ہوں جمال صاحب......! جو بہت بلند ہوتا ہے۔
شاید میں آپ کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔''

''سب کچھ......؟'' اس نے نبیلہ کو جلتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں...... سب کچھ......!'' نبیلہ نے جواب دیا اور وہ خاموشی سے
اسے دیکھتا رہا۔ اس کے بدن میں سرور انگیز لہریں دوڑ رہی تھیں۔ شراب اس
کے ذہن کو شکنجے میں کستی جا رہی تھی۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھا، آگے بڑھا اور
اس نے نبیلہ کا بازو پکڑ لیا۔

''آؤ...... اٹھو......!'' اس نے کہا اور نبیلہ مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔
وہ اس کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ اپنی خواب گاہ میں پہنچ گیا اور پھر

اس نے خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ نبیلہ بھونچکا سی ہو کر اسے
دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

''کیا سمجھیں......؟'' اس نے خون آلود نگاہوں سے نبیلہ کو گھورا۔

''میں...... میں کچھ نہیں سمجھی......!'' وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''اپنا وعدہ پورا کرو...... سمجھیں......؟ تم نے کہا تھا کہ تم میرے لئے
سب کچھ کر سکتی ہو۔ اس موسم نے میرے ذہن میں آگ لگا دی ہے۔
میں...... میں تمہیں طلب کرتا ہوں، اپنا وعدہ پورا کرو۔''

''جمال شاہ......!'' نبیلہ کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔

''جمال صاحب......! یہ آپ...... آپ کو کیا ہو گیا ہے......؟''

''میں کسی اپنے کی تلاش میں سرگرداں ہوں نبیلہ......! دیکھنا چاہتا
ہوں کون میرے لئے کیا کر سکتا ہے...... بولو......! تمہارا کیا جواب
ہے......؟''

''جمال صاحب......! آپ...... آپ کو کیا ہو گیا ہے......؟ میں تو
آپ کو عظیم انسان کی حیثیت دیتی آئی ہوں۔ آپ تو شرافت میں میرا
آئیڈیل ہیں۔''

''یہ سب خوب صورت الفاظ ہیں نبیلہ......! انسان کچھ ضرورتوں کا
غلام ہے اور یہ ضرورتیں اس کی مجبوری ہیں۔ ابھی تم دعویٰ کر رہی تھیں۔ میں
تمہارا امتحان لے رہا ہوں۔'' شراب نے جمال شاہ کو بہت دلیر بنا دیا تھا۔

''جمال صاحب......! کیا ایک امتحان لینے کے لئے آپ مجھے، اپنی
ہمدرد کو قتل کر دیں گے......؟ جمال صاحب......! مجھے دنیا کا زیادہ تجربہ نہیں
ہے لیکن عورت اسی وقت تک خود پر ناز کر سکتی ہے جب تک وہ پاکباز ہو۔

جب وہ بچی سے جوان ہوتی ہے اس کے ذہن میں کوئی محبوب بھی ہوتا ہے اور جمال صاحب......! مجھے یہ الفاظ نہیں ادا کرنے چاہئیں کیونکہ میرے دل میں آپ کے لئے بڑا احترام ہے۔ بالکل اسی مانند آپ پر اعتماد ہے جتنا اپنے کسی بڑے بھائی پر، اپنے باپ پر اور چچا پر کرسکتی ہوں۔ اسی اعتماد کے سہارے میں بے وقوفی میں یہاں چلی آتی تھی اور جمال صاحب......! یہ اعتماد چند لمحات میں پیدا نہیں ہوگیا تھا۔ ایک عرصہ لگا ہے مجھے یہ اعتماد پیدا کرنے میں......

مجھے آپ کے سامنے ایسے جملے نہیں کہنے چاہئیں لیکن آپ نے مجبور کر دیا ہے۔ ہر لڑکی کے ذہن میں ایک محبوب ہوتا ہے اور ...... اور وہ اسے اپنا شوہر بنانے کے بعد پورے فخر سے خود کو اس کے حوالے کر کے خوشی محسوس کرتی ہے۔ اگر آپ پر کچھ وحشتیں مسلط ہوگئی ہیں تو سوچیں......غور کریں، نبیلہ کے دل میں آپ کے لئے محبت تھی، انسیت تھی، اس لئے وہ یہاں آجاتی تھی۔ آپ اس معصوم اور بے غرض محبت کا یہ صلہ دینا چاہتے ہیں......؟''

''لیکن یہ دعویٰ خود تم نے کیا ہے نبیلہ......! کہ تم میرے لئے سب کچھ کرسکتی ہو۔ یہ دعویٰ کرنے کے بعد تمہاری یہ باتیں بے معنی ہیں۔''

''اگر آپ کی کوئی چھوٹی بہن ہوتی تو وہ اس سے زیادہ دعویٰ کرسکتی تھی لیکن اس وقت کیا آپ اس سے بھی یہی سب کچھ کہتے......؟''

''میں نہیں جانتا کیونکہ میری کوئی چھوٹی بہن نہیں ہے۔''

''مجھے سمجھ لیں......! گناہ کے خیال کو ذہن سے نکال دیں۔''

''نبیلہ......! بارش کی دعا پوری ہوئی ہے۔ ضرورت گناہ نہیں ہوتی۔

میری دعا میری تنہائی تمہیں یہاں لائی ہے اور اس وقت تم صرف ایک نوجوان لڑکی ہو۔ صرف ایک نوجوان لڑکی......''

''جمال صاحب......! میں آپ کی بہن ہوں...... میں آپ کی بیٹی کی عمر کی ہوں۔ جمال صاحب......! آپ کی بیٹی......''

''میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔''

''جمال صاحب......! میں نے آپ کو کیا سمجھا تھا اور آپ کیا نکلے......؟ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... اس سلوک پر...... اگر آپ کی کوئی بیٹی ہوتی، وہ بھی آپ کو گولی مار دیتی۔ مجھے جانے دیں جمال صاحب......! میرے دل میں کوئی اور ہے۔ میری منگنی ارشد سے ہو چکی، میں اسے دل سے چاہتی ہوں۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے گیا ہے۔ میں...... اس کی امانت ہوں۔ جمال صاحب......! اگر بہن اور بیٹی کے لفظ سے آپ کے کان نا آشنا ہیں تو میں آپ کو انسانیت کا واسطہ دیتی ہوں۔''

''بکواس مت کرو۔'' جمال شاہ اب دیوانہ ہوگیا تھا۔ شراب کا نشہ اس پر چڑھ رہا تھا۔

''لیکن میں تمہاری بھینٹ نہیں چڑھوں گی کتے......! میں کمزور ہوں لیکن مرنا تو جانتی ہوں، مر تو سکتی ہوں۔''

''تو مر جاؤ......!'' جمال شاہ نے کہا۔

نبیلہ نے اس کے بازو میں دانت گاڑھ دیئے تھے۔ جمال شاہ نے تلملا کر اس سے اپنا بازو چھڑایا۔ وہ قوی ہیکل تھا اور شراب کے نشے میں غرق تھا۔ اس نے نبیلہ کو اٹھا کر مسہری پر پٹخا لیکن نشانہ خطا ہوگیا۔ نبیلہ مسہری کے بجائے نیچے جا گری۔ اس کی نازک گردن ایک طرف مڑ گئی...... ایک ہلکی سی

آواز اس کے منہ سے نکلی اور پھر وہ برح طرح تڑپنے لگی۔

جمال شاہ نے جھک کر اسے دوبارہ اٹھایا اور بستر پر پٹخ دیا لیکن خوف اور تکلیف سے نبیلہ کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ مسہری پر بھی تڑپ رہی تھی۔

''اداکاری مت کرو نبیلہ......!'' جمال شاہ نے کہا۔ لیکن نبیلہ اب سرد ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور بدن ساکت ہوگیا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اس کا نشہ کم ہونے لگا۔ اس نے نبیلہ کو جھنجوڑا......لیکن معصوم لڑکی نے جان دے دی تھی۔ وہ اپنے اعتماد کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

جمال شاہ کا سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ اسے احساس ہوگیا کہ نبیلہ مر چکی ہے۔ اس نے اس کی نبض دیکھی، آنکھیں دیکھیں اور اس کے پورے بدن سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

''آہ...... یہ مر کیسے گئی......؟ آہ......آہ...... یہ مر کیسے گئی......؟'' اس نے تھوک نگلا۔ پھر اس نے نبیلہ کے پورے بدن کو ٹٹولا۔ گردن اٹھائی، تب اسے احساس ہوا کہ نبیلہ کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

شراب کا سارا نشہ اتر چکا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے؟ اس نے خون کر دیا ہے؟ ایک گھناؤنا قتل......اس نے اعتماد کا قتل کر دیا ہے۔ اس نے پوری دنیا پر تھوک دیا ہے، وہ مجرم ہے......آہ یہ جرم......؟

اس کا سارا وجود پگھل رہا تھا۔ وہ اپنی مکروہ فطرت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''آہ...... یہ کیا ہوگیا......؟ یہ میں نے کیا کیا......؟ نبیلہ......! وہ

معصوم وجود......!'' نبیلہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ در و دیوار اس کی ترجمانی کر رہے تھے۔

''میں آپ کی بیٹی ہوں......!''

''میں آپ کی بہن ہوں......!''

''اگر آپ کی بیٹی ہوتی تو وہ بھی آپ کو گولی مار دیتی......!''

''اللہ......! مجھے جانے دیں۔''

''خون......خون......خون......!''

''پھانسی...... پھانسی...... پھانسی......!'' بے شمار آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''می لارڈ......! نبیلہ معصوم تھی......ملزم جمال شاہ نے اسے ورغلا کر اپنے گھر بلایا اور اس کی عصمت لوٹنے کی کوشش کی لیکن اس معصوم لڑکی نے جان دے دی۔''

''تم قاتل ہو اس لئے عدالت...... زیر دفعہ تین سو دو...... تمہیں موت کی سزا دیتی ہے۔''

''آہ...... آہ......!'' اس نے دونوں کان بند کر لئے۔ سامنے ہی نبیلہ اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھور رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ چیختے ہوئے یہاں سے بھاگ نکلے۔

لیکن......لیکن موت کا پھندا...... آہ...... موت کا پھندا اسے اپنے حلق پر تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی زبان باہر نکل پڑی تھی۔

''اب کیا کروں......؟ اب کیا کروں......؟'' اس نے وحشت سے چاروں طرف دیکھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دیواریں بھی اس پر نفرین کر

رہی ہوں۔ جیسے وہ اسے دھمکی دے رہی ہوں کہ وہ اس کا راز کھول دیں گی۔

''راز......؟ ہاں راز چھپانا ضروری ہے۔ دیواروں کی زبان کہاں ہوتی ہے؟ وہ اس کا کیا بگاڑ سکیں گی......؟ لیکن...... اب کیا کیا جائے......؟ آہ......! اب کیا کیا جائے......؟ میں قاتل ہوں...... میں قاتل ہوں۔'' وہ خود سے دہشت زدہ تھا۔

''آہ......! نبیلہ......! نبیلہ......! تم میرے ہاتھوں ماری گئیں...... مجھے کیا ہوگیا تھا......؟ شراب...... ہاں شراب نے میرے حواس چھین لئے تھے۔ وہی تو بول رہی تھی میرے اندر...... آہ......! کاش میں شراب نہ پیتا...... کاش نبیلہ یہاں نہ آتی۔''

''نبیلہ......!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ وہ نبیلہ کی لاش سے لپٹ گیا۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لیکن اب یہ آنسو نبیلہ کو زندگی نہیں دے سکتے تھے۔

''میں...... میں ارسلان کو قتل کر دوں گا۔ میں ریاض اور دوسرے لوگوں کو بھی قتل کر دوں گا۔ انہوں نے ہی مجھے اس ذلیل شے کا عادی بنایا ہے۔ میں...... میں......''

''لیکن...... لیکن انہیں قتل کر کے بھی کیا ملے گا......؟ دنیا کی کوئی عدالت انہیں مجرم ثابت نہیں کر سکتی۔ قتل میں نے کیا ہے...... پھانسی بھی مجھے ہوگی۔''

''نہیں نہیں......! میں مرنا نہیں چاہتا۔ موت اگر خاموشی سے آجائے تو...... ٹھیک ہے لیکن یہ رسوائی کی موت...... یہ موت مجھے گوارہ نہیں ہے۔ مجھے...... مجھے بھاگ جانا چاہئے...... مجھے فوراً یہاں سے بھاگ جانا

چاہئے۔''

اس کی ذہنی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ ضمیر پوری طرح جاگ رہا تھا اور اب ایسے نشتر چلا رہا تھا کہ پورا وجود پھوڑا بن گیا تھا۔ پورا جسم انگارے کے مانند دہک رہا تھا۔ دماغ ابلا پڑ رہا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ کئی گلاس ٹھنڈا پانی پیا، منہ دھویا۔ حواس مجتمع کر کے انتہائی جدوجہد کی اور پھر ایک صوفے پر گر پڑا۔ سر تھام لیا۔

''میرے معبود......! میرے معبود......! میں سزاوار ہوں لیکن میں اس رسوائی سے نہیں مرنا چاہتا...... لیکن میں کیا کروں......؟'' اس کے منہ سے رُندھی ہوئی آواز نکلی۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

پھر اسے داور یاد آگیا جو چھٹی لے کر گیا تھا...... کہیں داور واپس نہ آجائے۔ اس طرح تو یہ راز کھل جائے گا۔ اسے کیا پڑی ہے کہ وہ یہ راز چھپائے......؟

''اوہ......!'' وہ جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ اسے یہ لاش چھپا دینی چاہئے۔ کسی کو کیا خبر......؟ رات کی تاریکی میں وہ یہ لاش کہیں پھینک دے گا۔

''ہاں اس طرح ...... یہ راز...... راز رہے گا۔''

''لیکن...... لیکن......'' اس کے ذہن پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ پھر کسی قدر حواس قائم ہوئے۔

''کسی کو کیا معلوم کہ وہ یہاں آئی تھی۔ ہاں...... اس بارے میں تو کوئی نہیں جانتا۔ پھر کیوں نہ خاموشی سے اس لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے......؟ کسی ندی...... یا کسی ویرانے میں لاش پھینک دی جائے۔ کوئی

نشان نہ چھوڑا جائے تو کسی کو کیا پتا چلے گا......؟''

وہ اٹھا۔

''جو کچھ ہونا تھا وہ ہوگیا تھا۔ اب اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ رونے اور پچھتانے کے لئے تو عمر پڑی ہے۔'' دل کو کچھ اور تقویت ہوئی۔ وہ اٹھا اور ایک راہ داری میں ٹہلنے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ فوری طور پر نبیلہ کی لاش ڈگی میں چھپا دے۔ تب وہ واپس نبیلہ کی لاش کے قریب پہنچ گیا۔

لاش کو دیکھ کر پھر اس کا کلیجا منہ کو آنے لگا۔ لیکن پھر اس نے دل مضبوط کیا اور نبیلہ کے لباس کی تلاشی لی۔ وہ سادہ لڑکی کسی زیور سے آراستہ نہیں تھی صرف اس کا پرس تھا جسے کھول کر دیکھنے پر صرف چند روپوں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ وہ باہر نکل آیا۔ کار کو دروازے کے بالکل قریب لے آیا۔ اس کی ڈگی کا لاک کھول دیا اور پھر اندر جا کر نبیلہ کی لاش کو اٹھا لایا۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی ہے نبیلہ......! میں نے ظلم کیا ہے...... اس کے علاوہ اور کیا کہوں......؟ سارے الفاظ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔'' وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا اور پھر نبیلہ کی لاش لے کر باہر نکل آیا۔ اس نے لاش ڈگی میں رکھی۔ نبیلہ کا پرس بھی رکھا اور ڈگی بند کر دی۔

دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ڈگی کو لاک کر دیا۔ نبیلہ کا پرس بھی اس نے لاش کے ساتھ ہی رکھ دیا تھا۔ پھر وہ اندر آ گیا۔

اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا تھا، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ نہ جانے کس طرح وہ

خود کو قابو میں کئے ہوئے تھا۔ اذیت کے یہ لمحات بڑے جان لیوا تھے۔ ہر لمحہ یوں لگتا تھا جیسے دل اچھل کر حلق میں آ جائے گا۔ ذرا سی آہٹ پر آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا تھا۔

پھر جب بیل بجی وہ پورے بدن سے کانپ گیا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ کوشش کے باوجود وہ کھڑا نہ ہو سکا۔

''نہ جانے کون ہے......؟ نہ جانے کون ہے......؟ لیکن باہر کا دروازہ بند نہیں تھا۔ آنے والا اندر داخل ہوگیا اور پھر وہ اس کے پاس بھی پہنچ گیا۔ یہ داور تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

''داور...... مجھے پانی پلاؤ......!'' اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ چند ساعت کے بعد وہ پانی لے کر آ گیا اور جمال نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے داور کے حوالے کر دیا۔

''اور لاؤں صاحب......!''

''بس......!'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''صاحب......! طبیعت خراب ہے کچھ......؟''

''ہاں......! کوئی خاص بات نہیں۔ بس سینے میں درد ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ڈاکٹر صاحب کو لاؤں......؟'' داور نے ہمدردی سے کہا۔

''ارے نہیں داور......! ایسی کوئی بات نہیں......! تم جلدی آ گئے......؟''

''ہاں صاحب......! بس شادی میں شریک ہوگیا۔''

''ٹھیک ہے......! آرام کرو......!''

"کھانا تیار کروں صاحب......!"

"نہیں......! کھانا نہیں کھاؤں گا میں ..... ذرا جانا بھی ہے، تم میرے کپڑے وغیرہ نکال دو۔"

"بہت اچھا صاحب......!" داور نے کہا اور باہر نکل گیا۔ وہ گہری سانسیں لینے لگا۔ جیسے کوئی بڑا خطرہ ٹل گیا ہو۔ داور نے لباس تیار کرنے کی اطلاع دی اور وہ باتھ روم میں چلا گیا۔

ٹھنڈے پانی کی پھواروں کے نیچے وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ بال وغیرہ خشک کئے اور پھر لباس تبدیل کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ باہر نکل گیا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب اسے پوری ہمت سے کام لینا ہے۔

دو ہی باتیں تھی یا تو خودکشی کر لے یا پھر ہمت سے کام لے کر جان بچائے۔ ابھی تک اس کے ذہن میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ اس لاش کو ٹھکانے لگا سکے۔ وہ ویرانوں میں گھومتا رہا اور پھر ایک ٹوٹے ہوئے پل کے نزدیک پہنچا اور جگہ کا چاروں طرف سے جائزہ لینے لگا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا، اس نے ڈگی کھولی اور نبیلہ کی لاش نکال لی۔ اس کا پرس ہاتھ میں لیا اور آنسو بہاتے ہوئے پل کے نیچے پہنچ گیا۔

"آہ......نبیلہ......! میرا آخری ظلم......! میں تجھے کفن بھی نہیں دے سکا۔ نبیلہ......! میں تجھ سے معافی نہیں مانگوں گا کیونکہ میرا جرم قابل معافی نہیں ہے۔ تیرا میرا فیصلہ ضرور ہوگا۔ خدا کے حضور بھی میں اپنے جرم کی معافی نہیں مانگوں گا کیونکہ میں نے ناقابل معافی جرم کیا ہے۔"

اس نے نہایت احترام سے لاش کو ایک جگہ رکھا اور اس کا پرس اس کے نزدیک رکھ دیا اور آنسو بہاتے ہوئے واپس چل پڑا۔

اسی وقت دور سے ایک روشنی اس پر پڑی اور وہ اچھل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کار کی طرف چھلانگ لگائی۔ روشنیاں برق رفتاری سے اسی طرف آ رہی تھیں۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور پوری رفتار سے چھوڑ دی لیکن اچانک ہی اس کے کانوں میں سائرن کی آواز گونجی اور اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر کانپ گئے۔

یہ کوئی پیٹرول کار تھی اور سائرن بجا کر اسے رکنے کا اشارہ کر رہی تھی، اس نے روشنیاں بجھا دیں تاکہ کار کا نمبر نوٹ نہ کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی ایکسی لریٹر پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا اور کار رفتار پکڑنے لگی۔ سوئی ستر سے گزر کر اسّی اور پھر نوّے پر پہنچ گئی۔ روشنیاں کافی پیچھے رہ گئی تھیں۔

"ممکن ہے، کار رک گئی ہو...... وہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ میں وہاں کیا کر رہا تھا......؟ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ پہلے وہ مجرم کو پکڑنا پسند کریں گے۔ صورتِ حال بگڑ گئی ہے اور...... اور شاید سزا کا دور شروع ہو گیا ہے۔"

پھانسی کا پھندا اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا اور وہ پوری قوت سے کار دوڑا رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے اس نے سوچا کہ کار کا نمبر دیکھ لیا گیا ہو۔ پولیس اس جگہ کو ضرور دیکھے گی اور...... اور اسے نبیلہ کی لاش مل جائے گی۔ کار کے نمبر سے اس کے بارے میں آسانی سے پتا چل جائے گا اور پھر پولیس اس کے گھر پہنچ جائے گی اور داور سے اس بات کی تصدیق ہو جائے گی کہ نبیلہ یہاں آتی تھی۔

"آہ......! پھندا تیار ہو گیا ہے، اب کیا کروں......؟" جمال شاہ نے اپنی جیب ٹٹولی، اتفاق ہی تھا کہ عادتاً اس نے اپنا پرس جیب میں ڈال لیا

تھا۔ پرس میں کافی رقم موجود تھی۔

''کچھ کرنا ہوگا، کچھ کرنا ہوگا۔''

پولیس کار کو وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب وہ شہر کے ایک بارونق علاقے میں تھا۔ اس نے ایک سینما ہاؤس کے سامنے کار روک دی اور پھر نیچے اتر آیا۔ کار کی چابی ایک گٹر میں پھینک دی اور پھر وہاں سے کافی دور آ کر ایک ٹیکسی روکی اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

اب یہ جگہ چھوڑ دینا ہی مناسب ہے۔ اس کی تقدیر ہمیشہ کے لئے تاریک ہو چکی ہے، اب وہ ایک مجرم ہے، قاتل ہے۔ پولیس اسے قبر میں بھی نہیں چھوڑے گی۔ اسٹیشن پہنچ کر اس نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور اندر پہنچ گیا۔ سب سے پہلی ٹرین کا وقت دیکھا جو صرف دس منٹ کے اندر روانہ ہونے والی تھی۔ اس نے جلدی سے ٹکٹ خرید لیا اور ٹرین میں جا بیٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز تھیں اور اس وقت تک وہ بے سکون رہا جب تک ٹرین چل نہ پڑی۔

کمپارٹمنٹ میں بہت سے لوگ تھے۔ ان کی نگاہیں اس کے بدن میں چبھ رہی تھیں لیکن اس نے خود کو سب سے لاتعلق کر لیا اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔

ابتداء میں کچھ گہما گہمی رہی اور اس کے بعد مسافر اونگھنے لگے۔

ساری رات وہ عجیب سی کیفیت میں رہا۔ آنکھ جھپک جاتی اور عجیب عجیب خواب نظر آنے لگتے۔ وہ چونک پڑتا اور پھر دیر تک نیند نہ آتی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ صبح کو ناشتہ کرنے کو بھی دل نہ چاہا۔ اسٹیشن آتے اور گزرتے رہے۔

اس وقت دن کے دو بجے تھے جب ٹرین ایک اسٹیشن پر رُکی اور وہ باہر جھانکنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے انداز میں وحشت آ گئی۔ اس نے کچھ پولیس والوں کو ریل کے ڈبوں میں جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی کی تلاش میں ہیں۔

اور یہ تلاش...... اس کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے...... ممکن ہے اس کا راز کھل گیا ہو۔

وہ بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔

''کیا کیا جائے......؟ اب کیا کیا جائے......؟'' اس نے سوچا اور دوسرے ہی لمحے وہ وحشت زدہ ہرن کے مانند اٹھ کر کمپارٹمنٹ کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا اور نیچے اتر گیا۔ اس کے بعد اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا حالانکہ یہ ایک احمقانہ حرکت تھی۔ اگر کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا تب بھی اسے بھاگتے دیکھ کر ضرور متوجہ ہو سکتا تھا لیکن اسے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ اس نے انتہائی برق رفتاری سے ایک طرف لگا ہوا جنگلا پھلانگا اور دوسری طرف پہنچ گیا۔

ٹرین کی سیٹی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی اور پھر وہ چل پڑی لیکن وہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کافی دور نکل آیا۔

یہ ایک چھوٹا سا پہاڑی شہر تھا۔ چھوٹی چھوٹی گلیاں اور کچے پکے مکانات تھے۔ وہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے پہنچ گیا اور تنے سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ پھیپھڑے پھٹے جا رہے تھے۔ تیز دوڑنے کی وجہ سے تنفس خراب ہو گیا تھا۔

درخت کے سائے میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد وہ بیٹھ گیا اور

اس نے درخت کے تنے سے ٹیک لگانے کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔

''اب کیا کیا جائے......؟ اب کیا کیا جائے......؟ پوری زندگی ہی دکھ بن کر رہ گئی ہے۔ اب تو اسی طرح پولیس سے چھپ کر یونہی دوڑتے رہنا ہوگا...... لیکن کب تک......؟ آخر کب تک......؟'' اس نے پریشانی سے سوچا۔

تب اسے نقاہت کا احساس ہوا۔ کھانا کب سے نہیں کھایا تھا۔ زندگی گزارنے کے لئے یہ لوازمات تو ضروری ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے حواس بحال کئے۔

''جب موت سے بچ کر زندگی کی تلاش میں بھاگے ہو تو پھر زندگی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑو جمال شاہ......!'' اس نے خود کو سمجھایا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

پہاڑی شہر کے چھوٹے چھوٹے بازاروں میں کھانے پینے کی ایسی چیزیں تو مل ہی سکتی تھیں جن سے وہ پیٹ کی آگ بجھا سکتا۔ ہاں...... نہ تو یہاں عمدہ ہوٹل تھا اور نہ ہی کھانے پینے کا کوئی اچھا انتظام...... چنانچہ اس نے چند چیزیں خریدیں اور ایک جگہ پہنچ کر انہیں کھانا شروع کر دیا۔

اس کی کیفیت ایک ایسے انسان کی سی تھی جو ہوش و حواس سے آری ہو اور زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے پانی تلاش کیا۔ جلد ہی اسے پانی مل گیا اور پانی پینے کے بعد وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ذہن پر غنودگی سی طاری تھی۔ سایہ دار جگہ تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور اس نیند نے اسے کافی سکون بخشا۔

اس وقت وہ بے یار و مددگار ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا۔ ایک

ایسا انسان جس نے زندگی اس قدر تکلیف دہ نہیں گزاری تھی۔ گو اس کا واسطہ کچھ تکلیف دہ حالات سے پڑا تھا لیکن اس کے بعد زندگی ایسی ڈگر پر آگئی تھی جہاں سکون ہوا کرتا تھا لیکن یہ سکون کے راستے اس کی غلط کاریوں کی وجہ سے چھن گئے تھے۔

جاگا تو شام ہو چکی تھی۔ سورج چھپ گیا تھا۔ اس چھوٹے سے شہر میں تو زندگی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے آگے بڑھا جائے۔ اس نے سوچا۔

پھر اس نے اپنے حلیے پر غور کیا۔ عجیب سا حلیہ ہو رہا تھا۔ اسے کوئی شریف انسان نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میلا کچیلا لباس، الجھے ہوئے بال اور چہرے پر یتیمی برس رہی تھی۔ یہ بری بات نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔

''اس طرح میں دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ سکتا ہوں۔'' اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے حلیے کو مختلف انداز میں تبدیل کرتا رہے گا۔ کیوں نہ وہ یہ ملک ہی چھوڑ دے...... اور یہ خیال اس کے لئے سنسنی کا باعث تھا۔

''ہاں...... کیوں نہ یہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ یہ بہتر رہے گا اور اس طرح ممکن ہے کہ زندگی پر سے یہ خطرات بھی ٹل جائیں۔ ہاں...... اپنی زندگی کی حفاظت کرنا ہر ذی روح کا فرض ہے۔'' وہ مجرم تھا لیکن اس کے باوجود وہ خود کو زندگی سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کافی دیر تک غور و خوض کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ہوش و حواس قائم رکھنے کی انتہائی ضرورت ہے ورنہ کتے کی موت مارا جاؤں گا۔ رات کو تقریباً دس بجے وہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر پہنچ گیا اور گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ اسٹیشن پر اس نے معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ٹرین آنے میں

تھوڑی دیر تھی۔ وہ ایک سرحدی علاقے کی جانب جانا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین آگئی اور وہ ٹرین میں سوار ہوگیا۔ وہ سفر کرتا رہا، سوچوں کے لامحدود تانے بانے اسے الجھا رہے تھے۔

''میں ہر حال میں خود کو مضبوط رکھوں گا اور ہمت سے کام لوں گا۔'' اس نے سوچا۔

ٹرین چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔ رات گزر رہی تھی اور وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چونکہ دن میں سو چکا تھا اس لئے فوری طور پر نیند بھی نہیں آئی۔

پھر ایک طویل مسافت طے کر کے وہ مطلوبہ شہر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے اپنے ذہن میں کچھ نئے منصوبے بنائے۔

پیسے جیب میں تھے چنانچہ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچا۔ سب سے پہلے ہیئر ڈریسر کے پاس جا کر اس نے اپنے بالوں کے اسٹائل میں تبدیلی کرائی۔ اس کے بعد ایک ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان سے کچھ لباس خریدے۔ اس طرح اس کے حلیے میں کچھ تبدیلی ہوگئی تھی۔ اس نے آنکھوں پر چشمہ بھی لگا لیا اور اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک نگاہ دیکھنے والا اسے پہچان نہ سکے گا اور یہ سوچ اس کے لئے اطمینان کا باعث تھی۔

وقت کافی گزر چکا تھا اور اس کے احساسات کی شدت کم ہوگئی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں کسی قدر بحال ہوگئی تھیں۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے کسی ہوٹل میں کمرہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر درمیانے درجے کے ایک ہوٹل کے کمرے میں مقیم ہوگیا۔

ہوٹل کا یہ کمرہ بے حد پُرسکون تھا۔ اب تک کا ایک ایک لمحہ اس نے وحشت کے عالم میں گزارا تھا۔ لیکن اب اسے کسی قدر سکون محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم وہ کمرے سے نہیں نکلا۔ کھانا بھی کمرے ہی میں منگوا لیا۔ اب وہ صرف آئندہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''اب کیا کرنا چاہئے......؟'' ملک چھوڑنے کا خیال اس کے ذہن میں پوری طرح جاگزیں ہوگیا تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رقم بھی اتنی نہیں تھی کہ وہ اعلیٰ پیمانے پر کچھ کر سکتا۔

افسوس......! زندگی کیسی مصیبت میں آ پڑی ہے۔ رات کو اس خاموشی سے اکتا کر وہ باہر نکلا اور پھر شہر کے بازاروں میں گشت کرنے لگا۔ تقریباً دس بجے واپس آیا اور ابھی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا ہی رہا تھا کہ اس کے کمرے سے تیسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی باہر نکل آئی۔

دوسرے ہی لمحے اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ نبیلہ تھی...... ہاں...... وہ نبیلہ تھی۔

''نبیلہ......!'' اس نے خوفزدہ سی آواز میں پکارا اور لڑکی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''نبیلہ......! تم زندہ ہو......؟'' وہ لرزتے قدموں سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ دوسرے ہی لمحے لڑکی نے ایک خوفزدہ سی چیخ ماری اور غڑاپ سے کمرے میں گھس گئی۔

''کیا بات ہے......؟'' اندر سے ایک بھاری آواز ابھری۔

''بابو......! بابو......! وہ ایک پاگل...... پاگل......'' لڑکی نے کہا۔

"کہاں ہے......؟ کیا کہہ رہا ہے......؟"

"کہتا ہے نبیلہ......! تم زندہ ہو......؟"

"ہوں...... دیکھتا ہوں۔ ابھی اس کا پاگل پن دور کر دوں گا۔" اس نے یہ آوازیں سنیں لیکن وہ لڑکی نبیلہ ہی تھی۔ اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ پھر ایک قوی ہیکل ہاتھ نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔

"اکیلا سمجھا تھا لڑکی کو......غنڈے...... بدمعاش......!" ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔

"م...... میں...... مجھے غلط فہمی...... یہ نبیلہ...... یہ نبیلہ کی......" اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے...... اس طرح تو وہ خود کو پھنسا رہا تھا۔

"میں ابھی تیری ساری غلط فہمی دور کیے دیتا ہوں۔" اس بار کے گھونسے نے اس کی آنکھوں کو تاریک کر دیا تھا۔ پھر کئی لاتیں اس کے بدن پر پڑیں، ضربیں شدید تھیں لیکن اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکی۔

پھر قوی ہیکل ہاتھ نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا۔

"جاؤ......! پولیس کے حوالے نہیں کر رہا، آئندہ کسی کو مت چھیڑنا۔" اسے باہر دھکیل دیا گیا اور وہ بری طرح گر پڑا۔

دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ یہیں پر پڑا رہے لیکن تماشا بن جائے گا۔ وہ اٹھا اور اپنے کمرے میں آ کر مسہری پر گر پڑا۔

"یہ کیا تھا......؟ نظر کا دھوکا......؟ ہاں...... نبیلہ اس کے حواس پر سوار ہے لیکن یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ اس طرح تو...... اس طرح تو وہ خود اپنے راز کھول کر پھنس جائے گا۔" اس نے سوچا۔

اور پھر وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بدن دکھ رہا تھا لیکن دوسری صبح حالت بہتر تھی۔ نہا دھو کر باہر نکل آیا۔ وہ ملک چھوڑنے کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ ہوٹل واپس جانے کا خیال بھی نہ آیا۔ پھر ایک علاقے میں اس نے آوارہ گرد ہپیوں کا ایک گروہ دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر ان کی طرف بڑھ گیا۔

ہپی مختلف مشاغل میں مصروف تھے۔ دنیا کی فکروں سے آزاد۔ کیا میں ان میں شامل ہو سکتا ہوں؟ اس طرح زندگی بچ جانے کی امید بھی ہو جائے گی اور تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔ اس نے ایک شخص سے بات کی۔ نہ جانے کس ملک کا باشندہ تھا۔ انگریزی روانی سے بول رہا تھا اور اس کا نام ڈگلس تھا۔

اس نے ڈگلس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ہاں...... دنیا کے ہنگاموں سے تنگ آئے ہوئے انسانوں کو نجات کا راستہ ہی ڈھونڈنا چاہئے۔ یہاں سکون ہے، بے فکری ہے۔" ڈگلس نے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔

"تو مجھے اپنے گروپ میں شامل کر لو۔" اس نے التجا کی۔

"بس...... ہم میں شامل ہونے کے لئے کسی خاص چیز کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خود کو دنیا کے ہنگاموں سے الگ کر لو۔ دم لگاؤ اور عیش کرو۔ کچھ مال ہے......؟" ڈگلس نے پوچھا اور اس نے اپنا پرس نکال کر ڈگلس کے حوالے کر دیا۔

"کیا دنیا اس قدر اعتماد کی جگہ ہے......؟" ڈگلس نے پوچھا۔

"میں اس کی حقیقت بھول بیٹھا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟''

''جمال...... جمال شاہ......!''

''میرے لئے مشکل ہے۔ وکٹر کہہ لوں تمہیں۔ میرا ایک دوست تھا وکٹر، نمونیہ سے مر گیا۔''

''ٹھیک ہے......!'' اس نے جواب دیا اور پھر رات کو اس نے زندگی میں پہلی بار چرس پی اور ہنگاموں میں شریک ہو گیا۔ خود کو بھول جانے کا بہترین ذریعہ اور وہ خود کو بھول گیا تھا۔ یہ زندگی اسے بہت پسند آئی تھی۔

ڈگلس بلاشبہ بہت اچھا ساتھی ثابت ہوا تھا۔ رات کے ہنگاموں کے بعد وہ پڑ کر سو گیا جہاں دوسرے آوارہ گرد سوئے ہوئے تھے۔ چرس کے نشے نے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا اور یہ بے گانگی اسے کافی دلکش لگی تھی۔

دوسری صبح جب وہ جاگا تو ذہن بھاری بھاری سا تھا لیکن ڈگلس کی صحبت اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی دلچسپیاں اس کے لئے بہت بہتر ثابت ہوئیں۔ وہ ان دلچسپیوں میں کھو گیا تھا۔

تین دن تک وہ اس گروہ میں شامل رہا۔ ڈگلس کے بارے میں اسے کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں...... وہ یقیناً ایک بہترین انسان تھا پھر اس نے ڈگلس سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں......؟'' ڈگلس نے پوچھا۔

''جہاں تم جاؤ...... مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بس میں بھی اپنی دنیا کو بھول جانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......! ہمارا پروگرام یہاں سے سری لنکا جانے کا ہے لیکن کیا تمہارے پاس پاسپورٹ ہے......؟''

''نہیں......! میرے پاس کوئی پاسپورٹ نہیں ہے۔''

''نہیں ہے......؟'' ڈگلس پرُخیال انداز میں ٹھوڑی کھجانے لگا اور پھر اس نے چونک کر جمال شاہ کی صورت دیکھی۔ چند لمحات وہ اسی طرح دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''حیرت انگیز...... واقعی حیرت انگیز......!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''بس...... مطلب کی بات نہ کرو...... تم تیار کر لو۔ ہم بہت جلد سیلون کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔''

''وہ کیسے مسٹر ڈگلس......! میرا پاسپورٹ اور دوسرے لوازمات......؟''

''میں نے تمہیں بتایا ناں کہ اتفاقات بعض اوقات عجیب عجیب کہانیاں ترتیب دیتے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے دوست وکٹر کے بارے میں بتایا تھا ناں...... جو مر گیا......؟''

''ہاں......!''

''تم...... اگر تمہارے بال بڑھ جائیں تو تم وکٹر سے کافی مشابہت رکھتے ہو۔ اس کا پاسپورٹ تمہارے کام آ سکتا ہے۔''

''لیکن جس جگہ وکٹر کا انتقال ہوا تھا۔ اس جگہ اس کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کو جمع نہیں کیا گیا......؟''

''نہیں......! ہم نے اس کی اطلاع بھی کسی کو نہیں دی۔ مر گیا اور ہم

نے اسے قبر میں دفن کر دیا۔''

''اوہ......!'' اس نے گہری سانس لی۔

''لیکن میرے بال......؟''

''اوہ......! تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟ مسٹر وکٹر......! بال بڑھ بھی سکتے ہیں اور تبدیل بھی کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاڑھی کٹوائی بھی جا سکتی ہے۔ کوئی مشکل بات تو نہیں ہے اور تم اس بات کی فکر مت کرو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی......!'' اس نے شانے اُچکائے۔ یہ کام بھی بہتر طریقے سے ہوگیا تھا۔ ورنہ وہ سوچ رہا تھا کہ ملک سے باہر نکلنے کے لئے پاسپورٹ کا حصول اس جیسے شخص کے لئے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ مجرم تھا اور کسی ایسی جگہ نہیں جا سکتا تھا جہاں اس کی شناخت کی جا سکے۔

تقریباً ایک ہفتہ ڈگلس اور اس کا گروہ یہاں پر رہا۔ آوارہ گرد سب اپنے اپنے رنگوں میں مصروف تھے، کوئی کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ سب ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔

ڈگلس کو اس نے چونکہ اپنی ساری رقم دے دی تھی اس لئے وہ مکمل طور پر اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ فطری طور پر بھی ایک اچھا انسان تھا۔

گروہ میں لڑکیاں بھی تھیں جو عجیب عجیب انداز میں اس کی طرف راغب ہوئیں لیکن وہ تو اب بالکل ہی تبدیل ہوگیا تھا۔ ان کی تحریک جمال کے اندر کوئی جذبہ پیدا نہیں کرتی تھی اور وہ خاموشی سے اور ویران نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہ جاتا۔ نبیلہ اس کی زندگی کا زخم بن گئی تھی اور یہ زخم اسے ہر

وقت تکلیف دیتا رہتا تھا۔ ہاں...... اس وقت جب چرس کا نشہ اس کے ذہن پر طاری ہوتا تو وہ نبیلہ سے بے خبر ہو جاتا تھا۔

پھر وہ وہاں سے روانہ ہوگئے۔ وہ ڈگلس کے ساتھ تھا اور ڈگلس ہر لحاظ سے اس کا مربی اور نگران تھا۔ وہ اپنی خود ارادی بالکل کھو چکا تھا۔ ڈگلس کے اشاروں پر چلنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ سری لنکا میں ایک جگہ انہوں نے پڑاؤ کیا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر چوڑی سی ایک نہر بہہ رہی تھی جس میں آبی مکانات تیر رہے تھے۔ ان مکانوں میں زندگی بڑی مجہول مجہول سی تھی۔ چراغ جلتے تھے اور ان کی روشنی میں بیمار چہرے اکثر نظر آ جاتے تھے۔

یہیں اس کی ملاقات اروشی سے ہوگئی۔ میلی سی دھوتی میں ملبوس مدقوق سی لڑکی، جس کے چہرے کے نقوش اچھے خاصے تھے۔ اس کی آواز کافی پُرکشش تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھنے لگی اور وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟'' اس نے پوچھا۔

''اروشی......!'' اس نے جواب دیا۔

''کہاں رہتی ہو......؟''

''سامنے پانی میں میرا مکان ہے۔'' اس نے سامنے ہی ایک چھوٹے سے بجرے کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ...... پانی میں رہتی ہو......؟''

''ہاں......!''

''کیا کرتی ہو......؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''کچھ نہیں بابو......! رات کو آؤ ناں......!'' اس نے عجیب سے

انداز میں جمال شاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''رات کو......؟''

''ہاں......! ہم تمہاری راہ دیکھیں گے۔'' اس نے کہا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ عجیب وغریب حالات سے گزر رہا تھا۔ ذہن میں جنس کا کوئی خاص تصور نہیں تھا۔ پھر بھی نہ جانے کون سی قوت اسے اروشی تک لے گئی۔

پانی کے بجرے میں اس کا بوڑھا باپ موجود تھا۔ اس نے جمال شاہ کا استقبال کیا۔ اروشی اندر اس کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ پرُخلوص انداز میں مسکرائی اور اس کے ساتھ جمال شاہ نے جو رات گزاری، اس پر وہ حیران رہ گیا۔

اروشی بلاشبہ ایک ایسی عورت کی حیثیت رکھتی تھی جو خالص گھریلو اور ہر قسم کی مصیبت سے دور ہوتی ہیں لیکن نہ جانے کیوں اسے گندی زندگی گزارنا پڑ رہی تھی۔ جمال شاہ نے اس سے اس کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔

''اروشی......! تم یہ زندگی کیوں گزارتی ہو......؟''

''کیا کریں......؟ پیٹ پالنے کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔'' اس نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا اور وہ پرُسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

''اپنی زندگی کسی سے وابستہ کیوں نہیں کر لیتیں اروشی......! کسی سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں......؟'' پرانی خواہشیں پھر عود کر آئی تھیں۔

''شادی......؟ ہمارے ہاں شادی نہیں ہوتی بابو......! ہم انسان تھوڑی ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس ہے ہی کیا......؟ یہ ایک مکان اور بس......

اگر کسی روز گاہک نہ ملے تو دوسرے دن فاقہ کرنا ہوتا ہے۔''

''کوئی مرد تمہارا سہارا نہیں ہے......؟''

''ہوتا تو شاید ہم بھی عام انسانوں جیسے ہوتے۔''

''مجھے اپنا سہارا بناؤ گی......؟'' اس نے پوچھا۔

''ایں......؟'' وہ چونک پڑی۔

''میں تم سے شادی کروں گا اور تمہارا بوجھ اٹھاؤں گا۔'' اس نے کہا اور وہ اس طرح بے یقینی کے انداز میں اسے دیکھنے لگی جیسے اپنی اس بات پر وہ خود ہی ہنس پڑے گا۔

''بابو......!''

''جواب دو اروشی......! میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔''

''ہمیں ایسے خواب نہ دکھاؤ بابو......!''

''تب پھر کل صبح اس خواب کو حقیقت بنا دو۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور درحقیقت اس نے یہی کیا۔ ڈگلس اور اس کے ساتھیوں کو اس نے خاموشی سے چھوڑ دیا تھا اور اپنا حلیہ بھی بدل لیا۔

اروشی کی حالت عجیب تھی۔ اس نے اپنا بجرہ کاروبار کی نہر سے ہٹا لیا اور جمال کے ساتھ خوشی خوشی فاقے کئے لیکن بہت جلد وہ بازار میں نکل آیا۔ پہلے مچھلیوں کے ٹوکرے ڈھوئے، رکشہ چلایا پھر سمندر سے سیپیاں نکالنے والی ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ اس کی زندگی کو ایک وقتی سکون مل گیا تھا۔ اس وہ شدید محنت کرتا تھا۔ اروشی کی رنگت بھی تبدیل ہوگئی تھی۔ پانی کے مکان کو بیچ کر انہوں نے کچھ اور رقم ملا کر ایک مکان خرید لیا اور سکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔

لیکن یہ سکون دائمی نہیں تھا۔ جب بھی نبیلہ یاد آتی تو اس کے ذہن کے زخموں میں سوزش ہونے لگتی۔ وہ کرب سے تڑپتا رہتا۔ کسی کل سکون نہیں ملتا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنا پڑتا تھا...... اروشی اس کی اس کیفیت سے پریشان ہو جاتی تھی لیکن وہ تو پجارن تھی۔ وہ تو اسے دیوتا مانتی تھی۔ وہ بھلا کوئی باز پرس کیسے کر سکتی تھی۔

پھر ایک سال کے بعد اروشی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی اور اس کا بوڑھا باپ مر گیا۔ بچی کا نام اروشی کی پسند سے منیشا رکھا گیا۔ ان کے حالات اب کافی بہتر ہو گئے تھے۔ جمال شاہ نے خود سمندری مصنوعات کی تجارت شروع کر دی تھی۔ اس طرح سے اب وہ ایک مقامی شہری ہی بن گیا تھا۔ لوگ بھول گئے کہ وہ کہیں باہر سے آیا تھا۔

منیشا کی پرورش اچھی طرح ہونے لگی۔ ان کے پاس اب کافی رقم جمع ہو گئی تھی اور اب وہ کھاتے پیتے شہریوں میں شمار ہونے لگے تھے لیکن سکون...... حالانکہ اس واقعے کو نو سال گزر چکے تھے۔ لیکن نبیلہ آج بھی اس کے ذہن میں زندہ تھی، اس کی معصومیت سوال بن کر اس کے سامنے آجاتی تھی اور اس سوال کا اس کے پاس جواب نہ تھا۔

آٹھ سالہ منیشا بے حد ذہین تھی۔ اپنی ماں کی ہم شکل، پڑھنے لکھنے میں بے حد تیز اور لباس بھی مقامی ہی استعمال کرتی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر اس کا ہیجان اور بڑھ جاتا۔

''میں تمہاری بیٹی ہوں......!''

''جمال شاہ......!''

''میں تمہاری بہن ہوں۔''

نبیلہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔

اور نتیجے میں وہ منیشا سے خوفزدہ رہنے لگا۔ وہ پیار سے اس کی گردن میں باہیں ڈالتی تو اسے لگتا جیسے اس نے منیشا کی گردن توڑ دی اور...... اور اس کے منہ سے خون نکل رہا ہو۔ کئی بار خوف سے چیخ پڑا اور پھر اسے عجیب عجیب خواب نظر آنے لگے۔ اب اکثر وہ خواب میں منیشا کو دیکھتا۔ جس کی قمیص اس نے پھاڑ دی ہوتی اور منیشا اس کے ہاتھوں میں دم توڑ دیتی۔

اروشی اس کی اس کیفیت سے پریشان تھی اور جوں جوں منیشا بڑی ہوتی جا رہی تھی، اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر لمحے کی اذیت، ہر لمحے کا کرب اس نے محسوس کیا کہ منیشا اس کی اس کیفیت سے لرزیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتی اور اس کا دل شدت غم سے پھٹنے لگتا تھا۔

آہ...... اس کے گناہ کی سزا کتنی طویل تھی اور یہ خواب...... یہ خواب بھیانک سے بھیانک ہوتے جا رہے تھے۔ ہر وقت منیشا اس کے ہاتھوں قتل ہوتی رہتی تھی۔

صبح جب وہ اس کے سامنے آتی تو وہ وحشت سے سفید پڑ جاتا۔ اس کی صحت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اروشی اس کے لئے بے حد پریشان رہتی۔ وہ ساری ساری رات جاگتا رہتا تا کہ وہ بھیانک خواب نہ دکھائی دے۔ سوچتا رہتا کہ کیا کروں اور جب وہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا تو اس نے ایک فیصلہ کیا۔

''نبیلہ کو قتل کرنے کے بعد میں ایک طویل زندگی گزار چکا ہوں۔ اب مجھے...... مجھے اس جرم کی سزا بھگتنا چاہئے۔ ہاں مجھے سزا ملنا ضروری

ہے۔ یہ سزا ہی میرے دکھوں کا علاج ہوگی۔'' گویا فیصلہ دیر سے ہوا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس فیصلے کے بعد اسے سکون مل گیا تھا۔ اس نے اس پر عمل کرنے کے لئے کارروائی شروع کر دی۔

سب سے پہلے اس نے اپنی بیش قیمت جائیداد اپنی بیٹی منیشا کے نام کر دی اور اسے اپنے تمام مفادات کا نگراں بنا دیا۔ اب وہ ایک مطلق العنان کی حیثیت سے اس کی ساری جائیداد کی مالک تھی اور اپنی تمام تر زندگی بہتر طور پر گزار سکتی تھی۔

اس کے بعد اس نے اروشی سے کہا کہ وہ ایک طویل عرصے کے لئے باہر جانا چاہتا ہے۔ کچھ کاروباری معاملات ہیں لہٰذا وہ نہایت سکون سے اپنی بیٹی کے ساتھ زندگی گزارے۔

اروشی جو اس کی دیوانی تھی اور جسے اس نے مصیبت کے گہرے غاروں سے نکال کر عزت کی بلندیوں پر بٹھا دیا تھا، وہ اسے بے پناہ چاہتی تھی اور وہ اس کے اس طرح جانے پر بہت پریشان تھی لیکن اس نے اروشی کو تسلیاں دیں اور کہا کہ بہرحال اسے آرام دہ زندگی گزارنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ وہ سکون سے زندگی گزارے اور وہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد واپس آجائے گا۔

اروشی اس کے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتی تھی۔ وہ رو کر خاموش ہوگئی اور اس نے ساری تیاریاں مکمل کر لیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس نے اپنے وطن واپسی کا پروگرام بنایا اور بالآخر ایک جہاز اسے لے کر چل پڑا۔

اپنے وطن پہنچنے کے بعد اس نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ رات بھر

سوچنے کے بعد پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ وہاں اس نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔

''میں جمال شاہ ہوں۔'' پولیس آفیسر نے اس سے کافی رکھائی سے گفتگو کی تھی۔

''فرمایئے جناب......! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں......؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''آج سے تقریباً دس سال پہلے میں نے ایک قتل کیا تھا۔'' اس نے جواب دیا اور پولیس آفیسر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''قتل......؟''

''ہاں......! میں آپ کو اس قتل کی تفصیلات بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر نبیلہ کے بارے میں ساری تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔

پولیس آفیسر اس کی شکل دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اسے پاگل سمجھ رہا ہو۔ بہرصورت ساری تفصیلات سن کر وہ مسکرانے لگا اور بولا۔

''تو پھر اب آپ کس لئے تشریف لائے ہیں......؟''

''کیوں......؟ کیا قاتل کو سزا نہیں ملنی چاہئے......؟''

''ضرور ملنی چاہئے...... لیکن محترم......! دس سال پہلے تو میں اس محکمے میں آیا بھی نہیں تھا۔ بتایئے......! اب میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں......؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟ اس قتل کی فائل ضرور موجود ہوگی۔'' اس نے کہا۔

”لیکن دس سال تک آپ کہاں رہے......؟“

”بس...... یوں ہی اپنے ضمیر سے چھپتا پھرا تھا لیکن کوئی کب تک ضمیر کی کسک سے محفوظ رہ سکتا ہے......؟“

”بے شک......! لیکن اب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں......؟“

”مجھے سزا دی جائے......!“ اس نے کہا۔

”خوب......! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہ سزا کہیں اور سے حاصل کر لیں......؟“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نہیں......! میں آپ سے درست کہہ رہا ہوں۔ آپ اس فائل کو تلاش کریں اور جب میں مجرم ثابت ہو جاؤں تو مجھے سزا دی جائے۔“

”بہت بہتر......! اس وقت تک آپ کا قیام کہاں رہے گا......؟“ پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔

”قانون کے مطابق تو مجھے حوالات میں ہونا چاہئے۔“

”جی نہیں......! میرا خیال ہے، آپ کوئی بیکار آدمی ہیں اور اس طرح حوالات میں آکر اپنے نان و نفقہ کا بندوبست کرنا چاہتے ہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیں اور اپنا ایڈریس نوٹ کرا دیں۔ اگر آپ قاتل ثابت ہو گئے تو میں آپ کو فون کر دوں گا۔“

اس وقت تو وہ وہاں سے چلا آیا لیکن اس کے بعد بھی وہ مستقل انسپکٹر کی جان کھاتا رہا اور انسپکٹر اس بات پر مجبور ہو گیا کہ وہ پرانی فائل نکلوائے۔ آخرکار خاصی تگ و دو کے بعد پولیس انسپکٹر نے فائل نکلوائی اور اسے فون کیا۔

”مسٹر......! کیا نام بتایا تھا آپ نے......؟ جمال شاہ......!“

”جی......!“

”براہ کرم ذرا میرے پاس تشریف لے آئیں۔“ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”بہتر ہے......! میں پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے دل میں سکون کی ایک لہر اٹھی تھی۔ جس کا احساس رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور وہ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ پولیس انسپکٹر نے اس کا استقبال کیا۔

”جی...... یہ وہ فائل ہے، جو ایک کالج کی طالب مس نبیلہ کے قتل کے سلسلے میں ترتیب دی گئی تھی۔ اس کے قاتل کو آج سے چھ سال پہلے سزائے موت ہو چکی ہے۔ چار سال تک اس کا کیس چلا تھا۔ اس کے بعد وہ سزا پا گیا۔“

”قاتل......؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”جی ہاں......!“

”لیکن وہ کون تھا......؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس کا ایک عزیز تھا جو اس کا رشتہ چاہتا تھا لیکن اس کا رشتہ نہ ملنے پر اس نے لڑکی کو قتل کر کے اس کی لاش کسی جگہ چھپا دی۔ بعد میں اس نے اعتراف جرم بھی کر لیا تھا۔“

”یہ غلط ہے انسپکٹر......! یہ غلط ہے آفیسر......! یہ غلط ہے...... اس کو میں نے قتل کیا تھا۔ افسوس کہ ایک بے گناہ کو پھانسی دی گئی۔“

”اچھا جناب......! اب آپ شرافت سے اس بات کو مان جایئے اور آئندہ اس جگہ کا رخ مت کیجئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

''میں سزا چاہتا ہوں انسپکٹر......! آپ نے کسی بے گناہ کو پھانسی دے دی۔ اس کا قاتل میں ہوں۔'' اس نے چیخ کر کہا اور پولیس انسپکٹر کا گریبان پکڑ لیا۔ دوسرے ہی لمحے پولیس انسپکٹر کا ڈنڈا اس کی کمر پر پڑا اور پھر کئی پولیس والوں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے اسے مخبوط الحواس سمجھ لیا تھا۔ اس کی ایک نہ چل سکی اور پولیس والوں کی طرف سے اسے ایک دماغی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

لیکن وہ دماغی مریض تو نہیں تھا۔ یہاں اس کا کیا علاج ہوتا؟ ایک سال تک اسے دماغی اسپتال میں رہنا پڑا۔ اکثر اس پر دورے پڑنے لگے تھے۔

''ارے ظالمو......! قاتل میں ہوں۔ تم نے کس بے گناہ کو سزا دے دی۔ آہ......! اب میری گردن پر دو خون ہو گئے۔ نہ جانے کون موت کے گھاٹ اُتر گیا۔'' اور اس بات پر اسے خوب مار پڑتی، کوئی یقین نہیں کرتا تھا۔

تب ایک دن اس نے ڈاکٹر سے کہا۔

''ڈاکٹر......! اب میں ٹھیک ہوں۔''

''واقعی......!''

''ہاں......! مجھے اجازت دے دو......!''

''نبیلہ کو کس نے قتل کیا تھا......؟''

''جس نے قتل کیا تھا، اسے سخت سزا مل چکی ہے۔ براہ کرم مجھے جانے دو۔'' لیکن کئی دن تک اسے مزید اسپتال میں رکھا گیا اور پھر بالآخر اجازت مل گئی۔ وہ اسپتال سے نکل آیا لیکن اب اس کے سامنے کوئی منزل

نہیں تھی۔ وہ واپس سری لنکا نہیں جانا چاہتا تھا۔ اب تو اس کے دل پر دو زخم ہو گئے تھے۔ پھر اس نے ریلوے لائن پر لیٹ کر خودکشی کی کوشش کی لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا اور خودکشی کے الزام میں سزا ہو گئی۔

دوسری بار زہر کھایا اور پھر ایک سال کی سزا کاٹی۔ موت بھی اس سے نفرت کرتی تھی۔ پھر وہ کئی سالوں تک سڑکوں پر پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔ لوگ اس پر قہقہے لگاتے لیکن وہ ارسلان اور ریاض کی تلاش میں تھا جنہوں نے اسے شرافت کے راستے سے ہٹا کر یوں دربدر کر دیا تھا۔ اگر وہ اسے مل جاتے وہ انہیں قتل کر دیتا۔

یوں تقریباً سات سال گزر گئے اور سات سال کے بعد اس کے ذہن میں خیالات کا ایک اور جھونکا آیا۔ اس نے واپس اروشی کے پاس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اپنا حلیہ درست کیا۔ پاسپورٹ وغیرہ درست کرایا اور چل پڑا۔

اس کا مکان جوں کا توں تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کو دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ منیشا کی خواب گاہ اس کے سامنے تھی۔ اس کے دل میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ اس نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔

منیشا شب خواب کے لباس میں مست نیند سو رہی تھی۔ وہ جوان ہو گئی تھی۔ جوانی کے آثار اس کے بدن پر نمایاں تھے۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر جھکا لیکن دوسرے ہی لمحے منیشا بجلی کی طرح تڑپی اور پھر اس نے تکیے کے نیچے سے پستول نکال لیا۔

اس نے دونوں ہاتھ آگے کیے لیکن دوسرے ہی لمحے منیشا کے

پستول سے دو فائر ہوگئے اور دونوں گولیاں اس کے پہلو میں اتر گئیں۔

''ذلیل......! کمینے انسان......! تو یہاں تک آ گیا......؟ لیکن سمجھا تھا تو نے مجھے......؟'' منیشا کی آواز بھرا گئی۔

''منیشا......! میری بچی......!'' وہ زمین پر گر گیا اور منشیا اس کی آواز سن کر چونک پڑی۔

''پاپا......! پاپا......!'' اس بار اس کی آواز ایک دلخراش چیخ بن گئی۔ وہ اچھل کر اس سے آ لپٹی۔

''پاپا......! پاپا......! یہ کیا ہوگیا......؟ یہ کیا ہوگیا......؟ میرے پاپا......! میرے پاپا......! میں...... میں نے یہ کیا کیا......؟ وہ...... کمینہ اکثر میرا پیچھا کرتا تھا...... ایک دو بار اس نے مجھے اپنی کار میں لفٹ دی ہے پاپا......! مگر اب اس کی حقیقت مجھ پر کھل گئی تھی...... میں سمجھی اس وقت اس نے یہاں گھسنے کی جرأت کی ہے پاپا......!'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''اس نے کہا تھا...... اگر تمہاری بیٹی ہوتی تو وہ...... بھی تمہیں گولی مار......'' اسے ایک بڑی سی خون کی قے ہوئی اور پھر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ شاید اس کی بددعا پوری ہو چکی تھی۔



نئی منزل

صوفی عظمت اللہ بستی کے ہر دلعزیز لوگوں میں سے تھے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ نیک اور دیندار آدمی تھے۔ بستی کے ہر شخص کے کام آنے کو تیار۔ کریانے کی ایک چھوٹی سی دُکان کرتے تھے۔ سچ بولتے تھے اور پورا تولتے تھے۔ کسی کو کبھی ان کی ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ دُکان پر اور دُکان بند کرنے کے بعد جو وقت ملتا تھا، وہ مذہب کی تبلیغ میں صرف کرتے تھے۔ عالم نہیں تھے لیکن سچی باتوں پر باعمل ضرور تھے اور یہی سب کچھ دوسروں کو بتاتے تھے۔ اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا منور تھا جس کی عمر اب سات برس کے قریب تھی۔ چنانچہ اس چھوٹی سی دُکان کی آمدنی دونوں باپ بیٹوں کی بہتر کفالت کے لئے کافی تھی۔ ایک بھائی تھے جو بستی کی ایک مسجد کے مؤذن تھے اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ مسجد سے ملحق مکان میں رہتے تھے۔ قدرت اللہ بھائی کی بہ نسبت دینی تعلیم سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے لیکن عظمت اللہ کی ہر دلعزیزی سے کبیدہ خاطر رہتے تھے اور بھائی کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کی ملاقاتیں رسمی سی تھیں۔

بھائیوں والی یگانگت موجود نہیں تھی۔ صوفی عظمت اللہ کی نیک فطرت کی بہ
سے بستی والوں کو ان کے اختلاف کی خبر نہیں تھی۔

صوفی عظمت اللہ صبح ہی صبح نئی گڑھی سے دُکان کے لئے سو
خریدنے گئے تھے۔ بارش کا موسم تھا اور اس موسم میں بستی والے بستی سے
باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ راشتے میں ایک برساتی ندی پڑتی تھی
جسے پار کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ذرا سی بارش میں ایسی چڑھتی کہ ہاتھی ڈباؤ پانی
ہو جاتا اور اسے عبور کرنا ناممکن۔

کریم علی نے منع کیا کہ اس موسم میں نہ جائیں لیکن وہ مسکرا کر
بولے۔

"دُکان میں بہت سی چیزیں ختم ہوگئی ہیں کریم بھائی......! بارش کا
کیا ...ٹھیک ہے اگر جھڑی لگ گئی تو ہفتوں پر بات جائے گی اور دُکان بند
کرنی پڑے گی۔ بس صبح جاؤں گا اور دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔"

لیکن ان کے جاتے ہی بارش شروع ہوگئی اور پھر تیز سے تیز ہوتی
گئی۔ گھر میں منور کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ معصوم بچہ کسی خطرے سے بے
نیاز اپنے مشاغل میں مصروف رہا۔ صوفی صاحب دوپہر تک واپس نہیں
آئے، شام کو بھی نہیں آئے، رات کو بھی نہیں آئے اور سہا ہوا منور پڑوس کے
ایک گھر میں پہنچ گیا۔

"ابا جی ابھی تک نہیں آئے کریم چچا......!" اس نے پریشانی سے
کہا۔

"ارے......! کیا وہ صبح کو چلے گئے تھے......؟"

"ہاں......! کہہ گئے تھے کہ دوپہر تک آ جاؤں گا۔"

"فکر مت کرو بیٹے......! بارش کی وجہ سے ندی چڑھ گئی ہوگی۔ اس
لئے وہ دوسری طرف رُک گئے ہوں گے۔ بارش رُکی تو ندی اُتر جائے گی اور
ممکن ہے وہ کل ہی آ جائیں۔ تم کھانا وغیرہ کھاؤ اور آرام سے یہاں سو
جاؤ۔"

"بیوی......! منور کو کھانا کھلا دو۔" کریم علی نے اپنی بیگم سے کہا اور
منور بہل گیا۔

بارش رات میں کسی وقت رُک گئی تھی۔ دوسری صبح آسمان صاف
تھا۔ منور باپ کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے روزمرہ کے معمول کے مطابق گھر
اور دُکان کی صفائی کر لی تھی لیکن دوپہر کو ایک روح فرسا خبر بستی میں پہنچی اور
بستی کے لوگ غم و اندوہ میں ڈوب گئے۔ کنہیا اپنی بیل گاڑی میں بستی پہنچا
تھا۔ اس نے بستی والوں کو بتایا کہ کل دوپہر کو وہ بستی واپس آ رہا تھا لیکن ندی
چڑھی دیکھ کر اسے ندی عبور کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اسی وقت صوفی عظمت
اللہ بھی ندی کے کنارے پہنچے تھے۔ وہ ندی عبور کرنے کے لئے بے چین
تھے۔ کنہیا نے انہیں روکا تو انہوں نے کہا کہ ابھی ندی زیادہ نہیں چڑھی
ہے۔ بستی میں منور ان کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اگر وہ نہ پہنچے تو منور پریشان ہو
جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ پانی میں اُتر گئے۔ تھوڑی دُور تک وہ تیرتے رہے لیکن
پھر پانی کا ایک پُرشور ریلا آیا۔ اس وقت وہ عین درمیان میں تھے، پھر دو تین
بار وہ پانی میں اُبھرے اور اس کے بعد غائب ہو گئے۔ کنہیا دوبارہ انہیں نہیں
دیکھ سکا تھا۔

یہ خبر پوری بستی میں پھیل گئی۔ چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تو
صوفی صاحب کی لاش کی تلاش بھی فضول تھی۔ تاہم بستی کے گھوڑا سوار ندی

کے کنارے کنارے میلوں دُور تک گئے۔ ندی کی کیچڑ میں بھی عظمت اللہ کی لاش کی تلاش کی گئی لیکن بے سود۔ ان کا کوئی نشان نہیں مل سکا۔

بستی اندوہ میں ڈوب گئی۔ جس نے سنا افسوس کیا۔ قدرت اللہ بھی تڑپ کر پہنچ گئے اور دھاڑیں مارنے لگے۔ اختلافات اپنی جگہ تھے لیکن وہ بھائی کی موت کے خواہاں نہیں تھے۔ تنہا منور کو انہوں نے سینے سے لگا لیا۔ بستی کے بے شمار لوگ منور کو سینے سے لگانے کے لئے تیار تھے لیکن چچا کی موجودگی میں کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ تھا۔ چنانچہ منور ان کی تحویل میں پہنچ گیا۔ بیگم قدرت اللہ نے البتہ ان کے اس اقدام پر سخت اختلاف کیا تھا۔

''ہُن برس رہا ہے ناں...... جیسے ہمارے گھر میں...... بچوں کی پرورش جیسے تیسے کر رہی ہوں، میں ہی جانتی ہوں۔ اب ایک اور فرد کا اضافہ کر لیا تم نے...... کھانا، کپڑے، بیماری...... میں کہتی ہوں یہ سب کہاں سے ہوگا......؟''

''کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جائے گا۔ میں اس کا چچا ہوں۔ آخر بستی والوں کی شرم و حیا بھی کوئی چیز ہے۔ لوگ کیا کہتے اگر ہمارے ہوتے ہوئے یہ دوسروں کے ہاں پلتا......؟'' قدرت اللہ نے جواب دیا۔

''بڑے چہیتے بھائی تھے ناں......! ہمیشہ تمہاری کاٹ میں رہے۔ کبھی پنپنے نہ دیا۔ صوفی بن گئے تھے اور ہمارا حق مارتے تھے۔ میں کہتی ہوں بچیاں جوان ہو رہی ہیں۔ پیسے پیسے کی بچت ضروری ہے۔ ہم اس کا خرچ کہاں سے برداشت کریں گے......؟ کیا لڑکیوں کو گھر میں بٹھا کر بوڑھا کر دو گے......؟''

''خدا کی بندی......! بھائی صاحب اس قدر قلاش بھی نہیں تھے۔

تھوڑی سی عقل سے بھی کام لو۔ منور اگر ہمارے ساتھ رہے گا تو بھائی صاحب کی چھوڑی ہوئی ہر چیز ہماری ملکیت بن جائے گی۔ اس غریب کا ہمارے علاوہ اور کون ہے......؟ دُکان میں اگر کچھ بھی نہیں تو ہزار پانچ سو کا سامان ضرور ہوگا۔ اس کے علاوہ ان کا مکان بھی ہے اور بھی کچھ رکھا ہی ہوگا انہوں نے۔''

''ایں......؟'' بیگم قدرت اللہ ایک دم سنبھل گئیں۔ پھر بولیں۔

''ہاں......! یہ تو ٹھیک ہے لیکن اب دُکان کون چلائے گا......؟ جو سامان اس میں ہے اسے گھر لے آؤ۔ وہاں پڑے پڑے خراب ہوگا۔''

''افوہ......! چند روز تو رُکو۔ فوراً ہی یہ سب کچھ کر لوں گا تو بستی والے کیا کہیں گے......؟'' قدرت اللہ نے جواب دیا۔ اور ان کی بیگم خاموش ہوگئیں۔

صوفی عظمت اللہ کی طرح ان کے بھائی صاف دل نہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ زن مرید قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ خود ان کو اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ جس طرف بیگم کا اشارہ ہوتا، اسی طرف چلتے۔ چنانچہ اس گفتگو کے بعد وہ بھی اسی انداز میں سوچنے لگے۔

بھائی کی موت کے بعد دل میں ان کی محبت اُبھری تھی لیکن رو دھو کر ٹھیک ہوگئے تھے۔ بھتیجے کو لائے تو خلوص سے تھے لیکن بیگم کی مخالفت اور دلائل سے گھبرا گئے۔ جان چھڑانے کے لئے دُکان اور مکان کا ذکر بادل ناخواستہ کر دیا تھا۔ لیکن اب سوچ رہے تھے کہ ٹھیک ہی تو ہے۔ منور کہاں پرورش پائے گا......؟ خرچ بھی ہوگا۔ دُکان چلانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سات سالہ منور کیا کرے گا......؟ چنانچہ سامان لے آنا ہی بہتر ہوگا۔ رہ

گیا مکان تو اس کی فروخت کے سلسلہ میں جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں ہوگا۔ جب بچیوں کی شادی ہوگی تب اسے فروخت کر کے کام چلایا جائے گا۔ بیگم کو بھی یہی سمجھانا مناسب ہے۔

بیگم قدرت اللہ زمانہ ساز خاتون تھیں۔ صوفی صاحب سے ہمیشہ سے کینہ رکھتی تھیں۔ منور کو سینے سے لگانے کا کیا سوال تھا لیکن دُکان اور مکان کا معاملہ ایسا تھا جو انہوں نے اب سے چند لمحات قبل نہیں سوچا تھا لیکن اب بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ انہوں نے شوہر سے وعدہ کیا کہ وہ مطمئن رہیں۔ منور کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔

معصوم بچہ ان زمانہ ساز بولوں کے ساتھ رہنے لگا اور چند ہی دنوں میں اس کے دل سے باپ کی جدائی کا اضطراب ختم ہوگیا۔ چچی امی کی صحبت اور چچا کی شفقت نے اس کے معصوم دِل کو مطمئن کر دیا۔

بستی کے لوگوں کو کافی عرصے تک صوفی عظمت اللہ یاد رہے۔ منور پر بھی نگاہ رکھی گئی لیکن چچی اور چچا کے سلوک سے مطمئن ہوگئے۔ ظاہر ہے خون خون کے درمیان تھا اس میں کسی کھوٹ کی کیا گنجائش تھی۔

لیکن بیگم قدرت اللہ مطمئن نہیں تھیں۔ منور انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس کا اُٹھنا بیٹھنا انہیں زہر لگتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ منور سے گھر کے کام لئے جانے لگے اور اس نے خوش دلی سے یہ فرائض سنبھال گئے۔ لیکن پھر ان کاموں کی تعداد بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ بچہ بچہ منور کا محتاج ہوگیا۔ اب بکریوں کے لئے چارہ لانے سے رات کو قدرت صاحب کے پاؤں دبانے تک کی ذمہ داری منور کے کاندھوں پر آ پڑی۔ کمزور شانے اس بوجھ سے چور چور ہو جاتے تھے۔ زُبان کھولی تو مار پڑنے لگی۔

قدرت اللہ صاحب بھی دوسروں سے پیچھے نہیں تھے۔ جب بیگم منور کی مخالف تھیں تو پھر وہ اس کے ہمدرد کس طرح رہ سکتے تھے۔ چنانچہ منور کی بدبختی کا دور شروع ہوگیا۔ اسے اس ماحول سے نفرت ہونے لگی۔ لیکن اس کی سوچ محدود تھی اور اپنے طور پر وہ بالکل بے بس تھا۔

باپ کے بتائے ہوئے چند اُصول اسے اب بھی یاد تھے۔ چنانچہ سچ بولتا تھا اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا، سیدھے راستے اپناتا تھا لیکن ان دنوں وہ شدید کشمکش کا شکار تھا۔ کئی واقعات ہوتے تھے جن میں اس نے سچ بولا تھا اور مار کھائی تھی۔ اگر وہ سچ نہ بولتا تو شاید مار نہ کھاتا۔ اس نے اس بارے میں بارہا سوچا لیکن جھوٹ کے لئے زُبان ہی نہیں کھلتی تھی۔ سچ بات ہمیشہ منہ سے نکل جاتی تھی۔

جمعہ کے دن قدرت اللہ لوگوں کو مسائل سمجھاتے تھے۔ عبادت کرنے، سچ بولنے اور یتیموں بیواؤں کے ساتھ اخوت و عدل کا درس دیتے تھے۔ سچ بولنے کی ہدایت کرتے تھے لیکن ان میں سے بہت سی باتیں منور کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

''چچا میاں......!'' ایک رات پاؤں دباتے ہوئے اس نے قدرت اللہ کو آواز دی۔

''ہوں...... پیشاب لگ رہا ہوگا۔ دو منٹ پاؤں دبائے نہیں کہ لگا پیشاب...... چل پاؤں دبا ذرا زور سے...... لگ رہا ہے تو لگنے دے۔'' قدرت اللہ نے ڈانٹ پلائی اور وہ زور زور سے پاؤں دبانے لگا۔

''پیشاب نہیں لگ رہا چچا میاں......!'' تھوڑی دیر کے بعد وہ بولا۔

''تو پھر......؟''

"ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"پوچھ......! مگر پاؤں دبائے جا......!" قدرت اللہ نے کہا۔

"اخوت وعدل کسے کہتے ہیں......؟" اس نے پوچھا اور قدرت اللہ چونک پڑے۔ انہوں نے گردن اُٹھا کر منور کو دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تیرا......؟"

"یتیموں کے ساتھ عدل کرنا چاہئے یا اخوت......؟" اس نے معصومیت سے سوال کیا لیکن قدرت اللہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

"ظلم ہو رہا ہے تجھ پر یہاں......؟ گوشت کاٹا جا رہا ہے تیرا...... کیوں......؟ ذرا سے گھر کے کام کر لیتا ہے تو طنز کر رہا ہے...... کمینے......! حرام خور......!" قدرت اللہ نے ایک لات رسید کی اور منور اُچھل کر چارپائی سے نیچے جا پڑا۔ کافی چوٹ لگی تھی اس کو۔ لیکن اس مار کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اگر یہ الفاظ اتنے برے تھے تو قدرت اللہ صاحب مسجد میں دوسرے لوگوں سے کیوں کہتے تھے......؟ وہ رونے لگا اور قدرت اللہ نے اُٹھ کر مزید دو لاتیں اس کے رسید کر دیں پھر کمرے سے باہر نکال دیا۔

اس دن کے بعد سے ان لوگوں کا روّیہ اس کے ساتھ اور سخت ہوگیا۔ قدرت اللہ اب اس سے پاؤں نہیں دبواتے تھے لیکن انتہائی نفرت کا سلوک کرتے تھے اس کے ساتھ۔ سارے گھر سے الگ ڈیوڑھی میں وہ زمین پر سوتا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں لحاف وغیرہ کا بھی بندوبست نہیں تھا اس کے لئے۔ لیکن تنہا سوتے ہوئے اسے بڑا خوف محسوس ہوتا تھا۔ اپنے باپ صوفی عظمت اللہ کے الفاظ اسے یاد تھے۔

"انسان کو صابر وشاکر ہونا چاہئے۔ برا وقت گزر ہی جاتا ہے۔"

چنانچہ خوف سے بچنے کے لئے وہ زور سے آنکھیں بھینچ لیتا تھا اور اس طرح اسے نیند آجاتی تھی۔

اس دن وہ بکریوں کے لئے چارہ لینے گیا تھا۔ قبرستان کے اس طرف کھیتوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ ایک پگ ڈنڈی کسی دوسری بستی کو گئی تھی۔ چارے کا گٹھر باندھ کر اس نے سر پر رکھا اور واپس پلٹ پڑا۔ پگ ڈنڈی سے ایک گھوڑا سوار گزر رہا تھا۔ یہ چودھری گوپال شرما تھے۔ بستی کے سب سے بڑے زمیندار۔ کئی بار منور نے انہیں گھوڑے پر سوار جاتے ہوئے دیکھا اور سوچا تھا کہ نہ جانے لوگوں کے پاس گھوڑے کہاں سے آجاتے ہیں۔ کتنے اچھے لگتے ہیں چودھری صاحب گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اور کیسا مزہ آتا ہوگا انہیں۔

دُور تک وہ چودھری صاحب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئے تو وہ بھی چارے کا گٹھر سنبھال کر پگڈنڈی پر ہولیا لیکن ابھی چند قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک چیز پر نگاہ پڑی۔ کپڑے کی تھیلی سی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور تھیلی کے قریب پہنچ گیا۔ گٹھر اُتار کر ایک طرف رکھا اور جھک کر تھیلی اُٹھالی۔ اس کا منہ کھولا تو اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

"یہ تھیلی ضرور چودھری صاحب کی ہے۔ وہی ابھی ادھر سے گزرے ہیں۔" اس نے سوچا۔

وہ اتنا تیز نہیں دوڑ سکتا تھا کہ بھاگ کر چودھری صاحب کو پکڑ لے اور تھیلی انہیں دے دے۔ پھر......؟ اور اسے یاد آیا کہ ایک دن مسجد میں ایک شخص کچھ رقم لایا تھا اور اس نے مولوی قدرت اللہ سے اعلان کرایا تھا کہ جس کی رقم ہو وہ نشانی بتا کر لے لے۔ یہی ترکیب اچھی ہے۔ چچا میاں یہ تھیلی

چودھری صاحب کو پہنچا دیں گے۔ اس نے تھیلی اپنے لباس میں رکھ لی اور پھر گٹھڑ اُٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے چارہ ایک طرف رکھا۔ بہت سے برتن دھونے کے لئے رکھے تھے۔ قدرت اللہ صاحب موجود نہیں تھے۔ وہ برتن دھونے میں لگ گیا۔

پھر جب اس نے قدرت اللہ صاحب کی آواز سنی تو جلدی جلدی باقی برتن رکھ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

''چچا میاں......! یہ...... یہ......'' اس نے تھیلی لباس سے نکال کر ان کی طرف بڑھا دی۔

''کیا ہے یہ......؟'' قدرت اللہ صاحب اب اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔

''پیسے ہیں چچا میاں......!''

''کیسے پیسے......؟'' قدرت اللہ صاحب نے تھیلی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اور پھر اسے کھول کر دیکھنے لگے۔ لیکن اس کے اندر نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر ان کی سانس رُکنے لگی تھی۔ انہوں نے سراسیمہ نگاہوں سے منور کو دیکھا۔

''یہ...... یہ کہاں سے آئے ہیں......؟''

''چودھری گوپال شرما جی قبرستان والی سڑک سے اپنی گھوڑی پر گزر رہے تھے ان کی گر گئی۔ مگر ان کی گھوڑی اتنی تیز دوڑتی ہے کہ میں بھاگ کر ان کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تو میں اسے لے آیا تا کہ آپ اسے چودھری جی کو دے دیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان کے گھر دے آؤں......؟'' منور نے پوچھا۔

لیکن قدرت اللہ صاحب کے ذہن میں تو سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ یہ رقم...... یہ رقم تو ان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اس رقم سے تو ان کے سارے دلدر دُور ہو سکتے ہیں۔ بچیوں کی شادی ہو سکتی ہے۔ نیا مکان بن سکتا ہے۔ وہ کسی دوسری بستی میں جا کر کوئی کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ مسجد کی روٹیاں کھاتے کھاتے دل بھر گیا تھا لیکن کچھ اور کر بھی تو نہیں سکتے تھے۔ لیکن آج...... آج موقع مل گیا تھا۔

''دے آؤں چچا میاں......!'' منور کے سوال نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے زور سے ہتھیلی بھینچ لی اور پھر آہستہ سے بولے۔

''نہیں ......! میں خود پہنچا دوں گا۔ میں خود دے آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے چچا میاں......!'' منور نے کہا اور وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔

مولوی صاحب اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

منور...... کہیں وہ ان کے اور ان کی اولاد کے مستقبل کا قاتل نہ بن جائے۔ اگر اس نے کسی سے اس رقم کا تذکرہ کر دیا تو...... تو رقم ان سے چھن جائے گی۔ اتنی بڑی دولت تو وہ پوری زندگی میں نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ ساری زندگی کولہو کے بیل کی طرح محنت کرتے رہیں تب بھی اتنی بڑی دولت

''لیکن منور کا کیا کریں......؟'' انہوں نے تھیلی جلدی سے اپنے بستر میں چھپا دی اور بستر پر لیٹ گئے۔ بہت سے کام کرنے تھے انہیں، لیکن اب تو ہاتھ پاؤں ہل بھی نہیں رہے تھے۔ پورا بدن اینٹھ رہا تھا۔

''اس وقت کیوں لیٹے ہو......؟'' ان کی بیگم نے اندر داخل ہو کر

پوچھا۔

''بس ایسے ہی......طبیعت ٹھیک نہیں ہے رقیہ......!''

''کیا بات ہے......؟''

''بخار محسوس ہو رہا ہے......!'' انہوں نے رقیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس عورت کو اپنا راز بتایا جائے یا نہ......کہیں یہ بھی کسی سے نہ کہہ دے۔ لیکن رقیہ ان کی بیوی تھی، ان کے دُکھ سکھ کی ساتھی...... وہ بھلا کسی سے کیوں کہے گی......؟

''دوا منگوا لوں تمہارے لئے......؟''

''ارے نہیں......! ٹھیک ہو جاؤں گا بس......کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' قدرت اللہ بولے۔

پھر رقیہ جانے لگی تو انہوں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

''سنو رقیہ......!'' اور رقیہ رُک گئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے قدرت اللہ کو دیکھ رہی تھی۔

''ایک اُلجھن آ پڑی ہے۔''

''کیا بات ہے......؟''

''رقیہ......! اسے دیکھو۔'' انہوں نے بستر کے نیچے سے تھیلی نکال کر رقیہ کے ہاتھ میں دے دی۔ رقیہ نے تھیلی لے کر اسے کھولا اور اس کی بھی بری حالت ہو گئی۔

''ارے...... ارے یہ تو بہت ہیں...... یہ تو بہت ہیں...... یہ...... یہ......''

''میں اسی وجہ سے پریشان ہوں رقیہ......! یہ تھیلی منور کو ملی ہے۔

کہہ رہا تھا کہ چودھری شرما گھوڑی پر جا رہے تھے ان کی گری ہے۔ میں اسے واپس کر آؤں۔ رقیہ......! اتنی رقم ہے یہ کہ ہماری تقدیر بدل جائے گی۔ اس بستی کو چھوڑ کر کسی دوسری بستی میں جا رہیں گے اور......اور......'' قدرت اللہ ہانپنے لگے۔

رقیہ بیگم کا چہرہ بھی دہکنے لگا۔ دولت کی آگ ان کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ تب وہ آہستہ سے بولیں۔

''مگر تم اس رقم کو دبا جاؤ۔ واپس کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے......؟''

''منور کا کیا کرو گی رقیہ......! کسی سے کہہ دیا کم بخت نے تو......تو کتے کی موت مارے جائیں گے۔ جو کچھ ہے وہ بھی چھن جائے گا۔''

''تو چپکے سے گردن دبا دو ناس پیٹے کی...... کسی ندی میں پھینک آؤ...... اس کے دم سے مصیبتیں ہی مصیبتیں ملی ہیں ہمیں...... پھل کیا ملا......؟'' رقیہ نے کہا۔

''کوسنے سے کام نہیں چلے گا رقیہ......! کچھ کرنا ہوگا۔ اگر تھیلی شرما جی کو پہنچا دی تو واہ واہ تو ہو جائے گی لیکن اس سے کیا ملے گا......؟ جب کہ ابھی یہ رقم ہماری ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا کہ یہ رقم ہم تک پہنچ گئی ہے۔''

''نفیسہ کے ابا......! جو میں کہہ رہی ہوں، وہی کرو۔ ایمان سے ہمت کر جاؤ، پوری زندگی سکون سے گزرے گی۔ اس وقت ہمت کر جاؤ اپنے بچوں کے لئے۔ دُنیا تو اولاد کو پالنے کے لئے نہ جانے کیا کیا کرتی ہے۔'' رقیہ نے کہا اور قدرت اللہ سوچ میں ڈوب گئے۔

''دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے اسے باز رکھنے کا۔'' وہ پھسپھسی آواز میں بولے۔

''ممکن ہی نہیں ہے، سانپ کے بچے سنپولئے ہوتے ہیں۔ زہر پھیلانے سے باز نہیں آئیں گے۔ نہیں نفیسہ کے ابا.....! اگر منور بچ گیا تو ضرور پھنسا دے گا۔ یا تو رقم واپس کرآؤ یا پھر..... دوسرا کام کرو۔''

''خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا رقیہ.....! اور پھر قتل..... اگر پتہ چل گیا ہو..... تو پولیس لے جائے گی۔''

''پتہ چلے گا ہی کیسے.....؟ گردن دبا کر رات کو نکل جانا اور ندی میں ڈال آنا۔ صبح کہیں سے کہیں پہنچے گا۔ ہم جھوٹ موٹ کو تلاش کریں گے اور رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنی محبت کرنے والے چچا چچی بھلا کوئی غلط حرکت کر سکتے ہیں۔''

''ہوں.....!'' قدرت اللہ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے رقیہ سے کہا۔

''تم اسے ذرا میرے پاس بھیج دو..... اور ہاں..... ذرا احمد اللہ کو علی مدد کے ہاں بھیج دو۔ کہلوا دینا مجھے بخار آ گیا ہے۔ آج اذان وغیرہ وہی دے اور نماز پڑھا دے۔''

''ٹھیک ہے.....!'' رقیہ نے کہا اور باہر نکل گئی۔ قدرت اللہ نے تھیلی پھر چھپا دی تھی اور پھر وہ منور کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دی کے بعد وہ ہاتھ پونچھتا ہوا پہنچ گیا۔ قدرت اللہ اسے بغور دیکھ رہے تھے۔

''منور.....! رستم کی یہ تھیلی تم نے کہیں سے چرائی تو نہیں ہے.....؟''

''نہیں چچا میاں.....! اگر چراتا تو آپ کو کیوں دیتا.....؟ یہ میں نے پگ ڈنڈی سے اُٹھائی ہے اور آپ اسے چودھری شرما کو دے دیں۔''

''تم نے کس کس کو یہ بات بتائی ہے.....؟''

''کسی کو نہیں چچا میاں.....! کیوں.....؟''

''کیا یہ ممکن ہے منور.....! کہ تم اس کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤ.....؟ اس میں کافی دولت ہے۔ ہم لوگ یعنی تم بھی اسے مزے سے خرچ کریں گے۔ عمدہ عمدہ کپڑے بنائیں گے۔ کسی دوسری بستی میں چل کر رہیں گے۔''

''ایں.....!'' منور حیران رہ گیا۔

''لیکن یہ پیسے تو شرما جی کے ہیں۔''

''انہیں پتہ ہی نہیں چلے گا۔ کون کہے گا ان سے۔ دیکھا ہی کس نے ہے.....؟''

''یہ گناہ ہے چچا میاں.....! میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ابا نے کہا تھا کہ دوسرے کی دولت پر کبھی نگاہ نہ رکھو۔''

''تم بس زُبان بند رکھنا۔ بھول کر بھی کسی کو مت بتانا کہ تمہیں ایسی کوئی تھیلی ملی تھی۔'' قدرت اللہ صاحب کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تھیلی مجھے ملی تھی چچا میاں.....! میں شرما جی کو ضرور بتا دوں گا۔ یہ تو بڑا گناہ ہے۔''

''ہاں.....!'' قدرت اللہ صاحب ہنس پڑے۔

''شاباش.....! تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ میں تو صرف تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ تم امتحان میں پاس ہو گئے۔ کیا کر رہے تھے.....؟''

''جی...... جھاڑو دے رہا تھا۔''

''تم یہاں بیٹھو...... آج جھاڑو کوئی اور دے دے گا۔ میری طبیعت خراب ہے...... ہاں...... ذرا سر دباؤ۔'' قدرت اللہ نے کہا۔

شام کا کھانا بھی انہوں نے منور کو اپنے کمرے ہی میں کھلایا تھا۔ رقیہ کئی بار ان کے پاس آ چکی تھی اور ایک دفعہ قدرت اللہ صاحب سے سرگوشیوں میں اس سے کچھ کہا تھا۔

شام ہوئی تو بستی تاریک ہوگئی۔ سرِ شام ہی لوگ گھروں میں جا گھسے تھے۔ یوں بھی سردیوں کے دن تھے۔ بستی کا ہر گھر بند ہوگیا تو قدرت اللہ نے منور کو دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر زمین پر پڑا سو رہا تھا۔ گھٹنے سر میں دیئے ہوئے تھے۔ بدن پر پتلی سی چادر پڑی ہوئی تھی۔

قدرت اللہ نے سارا دن اسے گھر سے باہر نہیں جانے دیا تھا اور رات کا کھانا کھاتے ہی وہ اونگھنے لگا تھا۔ پھر وہیں زمین پر لیٹ کر سو گیا تھا۔ قدرت اللہ اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ باہر نکل کر انہوں نے رقیہ کو آواز دی اور وہ جلدی سے پہنچ گئی۔

ذرا باہر کا چکر لگا کر آؤ اور ہاں...... مسجد میں بھی دیکھ لینا کوئی ہے تو نہیں۔''

''ابھی آئی......!'' رقیہ نے جواب دیا اور باہر نکل آئی۔

''کسی چڑیا کے بچے کا بھی پتہ نہیں ہے۔ مسجد خالی پڑی ہے۔ اتنی سردی میں کون ہے جو مسجد میں نظر آئے......؟'' اس نے واپس آکر جواب دیا۔

''بوری کہاں ہے......؟''

''باہر موجود ہے۔''

''اُٹھا لاؤ......!'' قدرت اللہ بولے اور کانپتے بدن کے ساتھ سوتے ہوئے منور کی طرف بڑھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور دوسرے لمحے منور کی پتلی سی گردن ان کے آہنی ہاتھوں میں تھی۔ انہوں نے دانت کچکچا کر پوری قوت اس کی گردن پر صرف کر دی اور منور کا کمزور بدن پھڑکنے لگا۔ اور پھر بدن ساکت ہونے کے بعد ہی انہوں نے گردن چھوڑ دی۔ اب ان کے دل کی دھڑکنیں معتدل ہوگئی تھیں۔ کپکپاہٹ بھی کم ہوگئی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک نگاہ انہوں نے مردہ منور پر ڈالی اور پھر باہر نکل آئے۔

رقیہ بوری لئے کھڑی تھی۔

''اندر آ جاؤ......!'' انہوں نے اسے آواز دی اور شقی القلب عورت اندر داخل ہوگئی۔ دونوں نے مل کر منور کو بوری میں ٹھونسا اور اس کا منہ باندھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر قدرت اللہ بوری لئے دروازے پر آ گئے۔ جھانک کر باہر دیکھا اور پھر بوری کندھے پر لاد کر باہر نکل آئے۔ ان کا رُخ بستی سے باہر ندی کی جانب تھا جو تقریباً ایک میل دُور تھی۔ اس وقت ان کے بدن میں بلا کی چستی تھی۔ وہ بہت تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے۔ بستی کے کتوں سے خطرہ تھا لیکن سردی کی وجہ سے کتے بھی دبکے ہوئے تھے۔ البتہ قدرت اللہ صاحب کو سردی کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے بدن میں دولت کی گرمی بھری ہوئی تھی۔

انتہائی برق رفتاری سے انہوں نے ندی تک کا فاصلہ طے کیا اور ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ پانی پُرشور آواز کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ انہوں نے بوری ندی میں اُچھال دی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تیزی سے بہتے

ہوئے دیکھنے لگے۔ لاش آن کی آن میں بہتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ تب قدرت اللہ واپس چل پڑے۔ ان کا ذہن متضاد خیالات کا شکار تھا۔ ایک اچھا مستقبل ان کی نگاہوں میں تھا۔ اور وہ اس بڑی رقم کی حفاظت کے لئے کوئی عمدہ ترکیب سوچ رہے تھے۔ اس کے علاوہ منور کی گمشدگی کے لئے کوئی عمدہ ترکیب بھی سوچ رہے تھے۔ اور اسی سوچ میں وہ گھر پہنچ گئے۔

رقیہ جاگ رہی تھی۔ ان کا انتظار کر رہی تھی، انہیں دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''کام ہوگیا......؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں......! کوئی بچہ تو نہیں جاگا......؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں......! سب سو رہے ہیں۔'' رقیہ نے جواب دیا اور قدرت اللہ صاحب گہری گہری سانسیں لینے لگے۔ پھر انہوں نے بستر کے نیچے سے تھیلی نکالی اور اسے کھول کر دیکھنے لگے۔

''رقیہ......! اسے کہیں زمین میں دفن کر دو۔ انتہائی احتیاط سے۔ میرا خیال ہے یہیں میرے پلنگ کے نیچے...... ہم اسے کچھ دنوں کے لئے بھول جائیں گے اور جب بات دب جائے گی تو پھر یہ بستی چھوڑ دیں گے۔

دونوں میاں بیوی نے تھیلی ایک صندوقچے میں رکھ کر زمین میں دفن کر دی۔ اس کے بعد قدرت اللہ لیٹ گئے۔ لیکن نیند......آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ایک عجیب سی بے کلی، ایک انوکھی بے چینی تھی۔

رقیہ بھی جاگ رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ تب قدرت اللہ صاحب اُٹھ گئے۔ اذان کا وقت ہوگیا تھا۔ معمول کے مطابق انہیں اذان دینی تھی۔ انہوں نے وضو کیا اور مسجد کی طرف بڑھ گئے لیکن مسجد میں قدم رکھتے ہی ان پر ایک عجیب سی دہشت طاری ہوگئی۔ وہ

اذان دیئے جا رہے تھے۔ اذان......

''اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔''

ان کا بدن کانپنے لگا۔ لرزتے قدموں سے وہ ممبر کی طرف بڑھے اور پھر کانوں میں اُنگلیاں دے کر آواز نکالی۔

''اللہ اکبر......! اللہ......''

لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے بدن پر شدید کپکپی طاری ہوگئی۔ ان کی آواز کانپنے لگی۔ ان کے پورے وجود میں درد کی لہریں اُٹھنے لگیں۔ وہ بے چین ہوگئے۔

''میرے...... میرے معبود......! میرے معبود......! میں بہک گیا تھا...... مجھے...... مجھے شیطان نے......'' لیکن پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے ہوش و حواس سنبھالے اور اذان دے کر نیچے اُتر آئے۔ ایک سنہرا مستقبل ان کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔



صبح ہو چکی تھی اور تیز رفتار ندی میں ایک بوری ڈوبتی اُچھلتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن جوں جوں اس کا سفر طے ہو رہا تھا، بوری کی رفتار سست ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ ندی اپنے کناروں کو پھیلا رہی تھی اور جوں جوں کنارے پھیلتے جا رہے تھے، پانی کو سکون مل رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی گہرائی ختم ہونے لگی اور رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ تب ہی ایک جاندار کی آواز اُبھری جو کسی کو مخاطب کر رہا تھا اور ناک اور منہ سے خرخر کی آواز نکال رہا تھا اور جسے وہ مخاطب کر رہا تھا وہ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک درخت سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔

بوسیدہ لباس، بازو خون سے تر، چہرے پر نقاہت، بال بکھرے ہوئے، داڑھی بکھری ہوئی، لیکن گھوڑے کی آواز پر وہ اس طرح تڑپ کر اُٹھا جیسے بچھو نے ڈس لیا ہو۔

وحشیانہ انداز میں اس نے نزدیک ہی درخت سے ٹکی کھڑی بندوق گرفت میں لی اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ رُخ اس کا گھوڑے کی جانب ہی تھا جو ندی کے اتھلے کنارے کھڑا تھوڑی دیر قبل پانی میں منہ ڈالے پانی پی رہا تھا اور پھر اچانک منہ اُٹھا کر ہنہنانے لگا تھا۔ گویا اس نے کوئی خاص چیز دیکھ لی ہو۔ اونگھنے والا کسی اور ہی جذبے کا شکار تھا۔

اس کی نگاہ اس جانب تو نہ اُٹھی جس طرف دیکھ کر گھوڑا ہنہنایا تھا بلکہ وہ تیزی سے اُچھل کر گھوڑے کی پشت پر چڑھ گیا اور پشت ہی پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں دُور دُور تک بکھری چٹانوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ایک جانب درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ لیکن تاحد نگاہ پہاڑیاں سنسان تھیں اور کوئی ان کے درمیان حرکت نہیں کر رہا تھا۔

تب اس نے حیرانی سے گھوڑے کو دیکھا اور معاً اس کی نگاہ اس بوری پر پڑی جو گھوڑے سے تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر ایک اُبھرے ہوئے پتھر کے نزدیک رُکی ہوئی تھی۔

"اوہ......! یہ کیا ہے......؟" اس کے منہ سے بڑبڑاہٹ نکلی اور وہ گھوڑے کی پشت سے نیچے کود آیا۔ چند ساعت وہیں کھڑا بوری کو دیکھتا رہا اور پھر بندوق اس نے ایک طرف پھینک دی اور پانی میں داخل ہو گیا۔ پانی اس کی پنڈلیوں سے اونچا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اطمینان سے بوری کے نزدیک پہنچ گیا۔ بوری کے بندھے ہوئے منہ کو کھولتے ہوئے کئی بار اس کے حلق

سے کراہ کی آواز نکل گئی اور بازو کے زخم سے خون دوبارہ رسنے لگا۔ لیکن اس نے بوری کھول لی اور اس کے اندر دیکھ کر چونک پڑا۔

"ارے......!" اس کے منہ سے دوسری آواز نکلی۔

منور کی معصوم صورت، مظلومی کی تصویر بنی اس کے سامنے تھی اور یہ بے بسی کا کچھ ایسا انداز تھا کہ درد ناآشنا دِل بھی پگھل گیا اور اس نے بوری سے اس نیم مردہ جسم کو نکال لیا۔ پھر اُسے بازوؤں میں اُٹھائے کنارے پر آ گیا۔ کنارے کی نرم ریت پر منور کو آہستگی سے لٹا کر اس نے اس کے سینے پر کان رکھ دیا اور ننھے سے دل کی مظلوم آواز سن کر اس کے موٹے ہونٹوں پر خوشی سے مسکراہٹ پھیل گئی۔

چند لمحات کے لئے وہ اپنے بازو کی تکلیف بھول گیا تھا۔ اس نے بچے کا سینہ کھول کر اس کے دل پر مالش شروع کر دی اور پھر اس کے اعضاء کو جنبش دینے لگا۔ بدن پر جگہ جگہ پتھروں سے ٹکرانے کی خراشیں پڑ گئی تھیں۔ خون کی روانی بحال ہونے لگی اور چہرے کی سفیدی سرخی میں تبدیل ہونے لگی۔ جوں جوں بچے کے بدن میں زندگی کے آثار اُبھرتے آ رہے تھے، وحشی صفت آدمی کی آنکھوں میں خوشی اُبھر رہی تھی۔

پھر اس نے اعضاء کی حرکت روک دی کیونکہ سب اعضاء خود جنبش کرنے لگے تھے۔ ننھے ننھے ہونٹ وا ہو رہے تھے۔ خشک زُبان بار بار ہونٹوں پر آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھ گیا۔ کنارے سے چلو میں پانی بھر کر لایا۔ ایک ہاتھ کے انگوٹھے اور اُنگلی سے ننھا سا منہ چیرا اور پانی اس میں آہستہ آہستہ ٹپکانے لگا۔ آبِ حیات کے چند قطروں نے حیات کو جلا دی اور آنکھوں کے دریچے کھل گئے۔ زندگی نے اپنے وجود کا اعلان کیا تھا لیکن کوئی

احساس ان میں موجود نہ تھا۔

اس دوران وحشی انسان کے بازو کا زخم پھر سے خون اُگلنے لگا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کی طرف بھی توجہ دی اور زخم پر بندھی ہوئی پٹی درست کرنے لگا۔ اس طرح خون کی روانی تو رُک گئی لیکن چھوٹے چھوٹے قطرے زمین پر ٹپکتے رہے۔ وہ دوبارہ اس ننھے وجود کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ اس شکل کو دیکھنے سے بازو کے زخم کی تکلیف کا احساس کم ہو جاتا تھا۔ پھر اس کی آواز اُبھری۔

''پانی کی اولاد......! اب تو ٹھیک ہے۔ اُٹھ کر بیٹھ کلیجے......! ذرا تجھ سے باتیں کروں اور پوچھوں کہ سیر کا، اور وہ بھی ندی کی سیر کا یہ کون سا طریقہ ہے......؟ ایں......! ابے بولے گا نہیں......؟'' اس نے پیار سے بچے کا گال نوچ لیا۔ لیکن زمین پر پڑا بچہ ٹکرٹکر اسے دیکھتا رہا۔ تب وحشی انسان کی بھنویں سکڑ گئیں۔ اس کی نگاہ بچے کی گردن پر پڑے نشانات کی طرف اُٹھ گئی تھی۔ اور پھر وہ ان نشانات پر جھک گیا۔

''اوہ......! اس کا مطلب ہے کہ تو کسی کے انتقام کا شکار ہوا ہے۔ چچ چچ...... لوگ انتقام لیتے ہوئے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ہوگا کوئی عورت، دولت یا زمین کا کھیل۔ زمین کے چپے چپے پر یہی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ ایک ہی قسم کی کے کھلاڑی ہیں۔ یہ دُنیا والے...... ہا......!'' اس نے ایک جماہی لے کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر چونک پڑا۔

''اب تیری وجہ سے بستی جانا ضروری ہوگیا ہے کلیجے......! میں ان سسروں کو ساری زندگی ان پہاڑوں میں نچا سکتا ہوں۔ مجال ہے چھولیں مجھے۔ جنگل کی جڑی بوٹیوں سے علاج بھی کرلوں گا اپنا مگر...... تیری حالت

دیکھ کر اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ کوئی ترکیب کرنی ہی ہوگی...... مگر کیا ترکیب کی جائے......؟ کیا ترکیب ہوسکتی ہے......؟ ویسے تو ہی کچھ بتا دے چھچھوندر......!'' وہ زمین پر پڑے بچے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا اور دیر تک ہنستا رہا۔

''دھت تیرے کی...... ہنسنا رونا تو اپنا سب کچھ بھول گیا۔ پر کوئی پرواہ نہیں...... ہم سب کچھ سکھا دیں گے...... سب بتا دیں گے تجھے...... کیا سمجھا پانی کی اولاد......!'' وہ پھر ہنسنے لگا۔ اس کی ایک ایک ادا سے وحشت ٹپکتی تھی۔

پھر وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ سورج پہاڑیوں سے اُبھر رہا تھا۔ پھر جب سورج بلند ہوا تو وحشی صفت انسان کوئی ترکیب سوچ چکا تھا اور اس ترکیب پر اسے خود ہنسی آ رہی تھی۔ پھر اس نے بچے کی طرف دیکھا۔ سورج کی حرارت نے اس کے بدن کو بھی تقویت بخشی تھی لیکن خوف کی وجہ سے اس کی سمجھ بوجھ، اس کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی تھی۔

وحشی صفت انسان کے سہارے سے وہ اٹھ کر تو بیٹھ گیا لیکن اس کے حواس بے جان تھے۔ تب وہ اٹھ کر اس درخت کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ تھوڑی دیر قبل بیٹھا تھا۔ درخت کے نیچے کچھ سامان پڑا ہوا تھا۔ اس نے اس سامان میں سے ایک لمبا سا چاقو نکالا اور پھر اپنے بازو کا زخم دیکھنے لگا۔ گولی کا سوراخ صاف نمایاں تھا۔ لیکن گولی گوشت میں داخل ہو کر گوشت سے باہر نکل گئی تھی اور ہڈی بچ گئی تھی۔ وہ چند ساعت ہمت کرتا رہا اور پھر اس نے چاقو سے اپنے بازو کے گوشت کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ اس کے دانت بھینچے ہوئے تھے اور خون اس کے لباس پر پھیل رہا تھا۔ حلق سے کسی درندے

کی سی غراہٹ نکل رہی تھی۔

اس کام سے فارغ ہوکر اس نے چاقو ایک طرف ڈال دیا اور پھر لڑکے کی طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھ کیا رہا ہے خرگوش......! ایک ایک قطرے خون قیمت وصول کریں گے تجھ سے۔ سمجھا...... بھول مت جانا ہماری بات کو......!" وہ ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا۔ زخم کی تکلیف سے اس کا چہرہ بہت خوف ناک ہو رہا ہے۔ پھر اس نے اپنے کرتے سے کپڑے کا ایک اور ٹکڑا پھاڑا اور اسے زخم پر کس لیا۔ نہ جانے کس دل گردے کا انسان تھا۔ یہ سب کچھ عام لوگوں کا کام نہیں تھا۔

اس کے بعد اس نے ندی کے قریب آکر اپنا چہرہ پانی میں بھگویا اور تیز دھار چاقو کو اپنے چہرے پر آزمانے لگا۔ وہ اپنی داڑھی صاف کر رہا تھا۔ کافی بڑھی ہوئی داڑھی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کا چہرہ صاف ہو سکا۔ بڑے جاندار چہرے کا مالک تھا۔

اس کام سے فارغ ہوکر اس نے پانی میں اپنی شکل دیکھی اور پھر ہنس پڑا۔

"اب ٹھیک ہوگیا سب کچھ ...... بالکل ٹھیک ہوگیا...... سن بے طوفان...... ادھر آ بیٹا......! ادھر آ......!" اس نے گھوڑے کو چمکارا اور گھوڑا اس کے نزدیک آ گیا۔

"ہم تو جا رہے ہیں پوت......! اب یہ تیرا کام ہے کہ کس طرح ڈیرے پہنچے گا۔ پیچھا مت کرنا سسرے......! ورنہ پکڑے جائیں گے...... سمجھ گیا نا...... جا بھاگ جا......!" اس نے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ مارا اور گھوڑا

آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ تب اس شخص نے اپنی بندوق، چاقو اور دوسری چیزیں پانی میں پھینک دیں۔ پھر بچے کو اُٹھا کر کندھے پر اس طرح بٹھایا کہ اس کے پاؤں وحشی صفت انسان کے سینے پر لٹکے ہوئے تھے اور اس کے بعد وہ جنگلوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی چال میں کوئی لغزش نہیں تھی اور وہ بڑے اعتماد سے چل رہا تھا۔

درختوں تک کا فاصلہ اس نے کافی تیزی سے طے کیا اور ان کے قریب پہنچ کر لڑکے کو کندھے سے اُتار دیا۔

"بس...... تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جا چندا......! ابھی چلتے ہیں۔ صرف تھوڑی سی دیر...... نظریں کام اور کرلیں تاکہ ان سالوں کو شبہ نہ ہو۔"

وہ درختوں میں گھس کر درختوں کی سوکھی ٹہنیاں توڑنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں اس نے ٹہنیوں کا خاصا ڈھیر اکٹھا کرلیا۔ ایک گیلی ٹہنی سے اس نے اس ڈھیر کو درمیان سے باندھا اور لڑکے کے قریب پہنچ کر دوبارہ اسے کاندھے پر بٹھا لیا۔ ٹہنیوں کے ڈھیر کو گھسیٹتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔ سفر گو سست رفتاری سے ہو رہا تھا لیکن وہ کسی جانی بوجھی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے انداز میں اطمینان تھا۔

درختوں کے سلسلہ کو عبور کر کے وہ ایک میدان میں پہنچا۔ دھوپ پوری طرح پھیل چکی تھی اور دُور دُور تک کے مناظر نمایاں تھے۔ ناہموار زمین کے اختتام پر بلندی تھی اور جب وہ ان بلندیوں کو عبور کر رہا تھا تو اس نے پولیس کے بہت سے جوان دیکھے جو گھوڑوں پر سوار اس طرف آ رہے تھے۔ گویا امتحان کا وقت آ گیا تھا۔ پولیس کے جوان بھی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے اور دوسرے لمحے انہوں نے منتشر ہو کر اس کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ بہت

سوں نے تو بندوقیں بھی تان لی تھیں۔ وہ ٹھٹک گیا اور اپنی جگہ رُک کر انہیں دیکھنے لگا۔ پولیس کے جوان بندوقیں تانے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ان میں سے کئی گھوڑوں سے اُتر گئے تھے اور انہوں نے اس کا نشانہ لے لیا تھا۔ اس کے چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت اُبھر آئی اور وہ معصوم نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''تمہارا خیال تھا تم ہمارے ہاتھوں سے بچ جاؤ گے منگل سنگھ......!'' ایک پولیس افسر اس کے نزدیک پہنچ کر گھوڑے سے اُترتے ہوئے بولا۔

''جے رام جی کی مہاراج......!'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''یہ لڑکا کہاں سے اُٹھا لائے...... ؟ کون ہے یہ......؟'' پولیس افسر نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''ہمارا بالک ہے مہاراج......! گپتی ہے اس کا نام اور ہم اندھیرا ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو......؟'' پولیس افسر نے غرا کر کہا۔

''بپتا پڑی ہے ہم پر مہاراج......! باگھی بستی میں رہویں ہیں۔ روز لکڑیاں لینے آتے ہیں یہاں پر...... کبھی ایسا نہیں ہوا۔ باگھ نے حملہ کر دیا ہمارے اوپر اور ہمارے بالک کو اٹھا کر لے جانے لگا۔ پر مہاراج سنتان کے لئے تو جیون ہووے ہے، ہم بھی ڈٹ گئے۔ ہاتھ چبا گیا جالم ہمارا۔ پر ہم نے اسے اپنے بالک کو نہ لے جانے دیا۔ یہ دیکھو......!'' اس نے لکڑیوں کا گٹھر زمین پر ڈال کر اپنا بازو سامنے کر دیا۔ پولیس افسر کی آنکھوں میں کسی قدر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

''تم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو ڈاکو منگل سنگھ......!''

''ہم اندھیرا ہیں مہاراج......! بھگوان کی سوگند ہم پر بپتا پڑی ہے۔'' وہ رونے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''دیکھ لو...... باگھ نے ہمارے بالک کو بھی زخمی کر دیا ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے مہاراج......! ہمیں بستی پہنچا دو۔ بھگوان تمہیں سکھی رکھے۔'' اس نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

پولیس افسر نے پریشانی سے اپنے ساتھیوں کی شکل دیکھی۔ سارا معاملہ اُلٹا ہو گیا تھا۔ لکڑیوں کا ڈھیر، زخمی بازو اور پھر لڑکا...... یہ ساری باتیں اس شخص کو سچا ثابت کر رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر پوچھا۔

''تم میں سے کوئی اسے نہیں پہچانتا......؟''

''وہ تو داڑھی والا ہے سر......! اور پھر لڑکا...... نہ اس کے پاس ہتھیار ہیں نہ گھوڑا...... یہ کسی طور منگل سنگھ نہیں ہو سکتا۔''

''پھر یہ گدھا یہاں کیا کر رہا ہے......؟'' افسر نے غصے سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''باگھی بستی یہاں سے صرف دو کوس ہے۔ ممکن ہے یہ سچ کہہ رہا ہو۔''

''منگل سنگھ بھی تو پولیس کی گولیوں سے زخمی ہو گیا ہے۔'' افسر نے کہا اور پھر بولا۔

''اس کا زخم کھول کر دیکھو۔'' چنانچہ دو جوان آگے بڑھ آئے۔ اس نے لڑکے کو نیچے اُتار دیا۔ اور لڑکا زمین پر بیٹھ گیا۔ جوانوں نے اس کا زخم کھول کر دیکھا۔ افسر نے بھی دیکھا، یہ کسی طرح گولی کا زخم نہیں تھا۔ پولیس افسر نے گہری سانس لی۔

""تو تم منگل سنگھ نہیں ہو......؟""

""اندھیرا ہے ہمارا نام مہاراج......! گھر والی مر چکی ہے ہماری۔ اس لئے ہم اپنے بالک کو ساتھ ہی لے آویں ہیں۔ پر آج...... بھگوان......!"" اندھیرا نے جھک کر لڑکے کو گود میں اُٹھا لیا اور اس کے بازو سے خون رسنے لگا۔

""تم نے یہاں کسی آدمی کو تو نہیں دیکھا......؟ گھوڑے پر سوار تھا۔"" افسر نے کہا۔

""نہیں مہاراج......!""

""ہوں......جگی رام......تم اس آدمی کو ساتھ لے جاؤ۔ باگھی کی چوکی جا کر اس کی شناخت کراؤ اور پھر اسے جانے کی اجازت دے دینا۔ اگر شناخت نہ ہو سکے تو اسے چوکی پر ہی رکھا جائے۔ کنول رام......! تم اپنا گھوڑا اسے دے دو۔"" افسر نے دوسرے آدمی سے کہا اور اس نے اپنا گھوڑا چھوڑ دیا۔

""چلو......گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔"" جگی نے کہا اور اندھیرا پولیس افسر کو دُعائیں دینے لگا پھر بولا۔

""مہاراج......! ہم نے گھوڑے کی سواری کبھی ناہیں کی......ہمیں سوار کرا دو۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے۔""

""اوہ......! آؤ...... یہ مصیبت کہاں گلے پڑ گئی۔ چلو کنول سنگھ...... اسے گھوڑے پر بٹھا دو۔ اور جگی......! تم لگامیں پکڑ لینا۔ ذرا دیر تو لگے گی مگر شناخت کئے بغیر اسے چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔""

پولیس والوں نے لڑکے اور اندھیرا کو گھوڑے پر سوار کرا دیا۔ اس

نے لکڑی کا گٹھر بھی مانگا۔

""ارے بے وقوف......! اسے کہاں لے جائے گا......؟"" پولیس افسر دانت پیس کر بولا۔

""روزی ہے ہماری سرکار......! شام کو کھانے کو بھی ناہیں ملے گا۔ رحم کرو سرکار......! ہمارے اوپر۔"" اندھیرا ہاتھ جوڑ کر بولا۔

لکڑی کا گٹھر اس نے اپنے سر پر ہی رکھ لیا تھا۔ جگی نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور وہ دوسری طرف اترائی میں چلنے لگے۔ پولیس افسر اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔ جو شخص اس دیہاتی کو لے کر چلا تھا، اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ خواہ مخواہ یہ کم بخت درمیان میں آ گیا۔ ڈاکو منگل سنگھ کی تلاش میں کافی لطف آ رہا تھا۔

پچھلی رات اسے بستی میں گھیرا گیا تھا۔ اس وقت وہ گروہ کے ساتھ نہیں تھا لیکن کم بخت نے زبردست مقابلہ کیا اور بستی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن پولیس افسر جوگندر سنگھ نے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کالی ٹیکری میں ایک بار پھر اسے گھیرا گیا اور اس بار اسے زخمی کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ دوسری بار نکلنے میں کامیاب ہو یا اور ان اطراف میں داخل ہو گیا۔ رات ہو جانے کی وجہ سے پولیس اس کا تعاقب مناسب طور پر جاری نہ رکھ سکی تھی لیکن تگ و دو ساری رات جاری رہی تھی۔ منگل سنگھ کی گرفتاری پر بہت بڑا انعام تھا اس لئے سب جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔

چلو ٹھیک ہے۔ جگی نے سوچا۔ یہ شخص تو بے ضرر ہے۔ چوکی سے شناخت کرانے کے بعد واپس آنے کی ہدایت تو کی نہیں گئی تھی۔ چنانچہ وہیں کہیں سو جائے گا۔ رات کی کسل بھی دور ہو جائے گی۔ وہ اطمینان سے چلتا

رہا۔تقریباً ایک کوس کا فاصلہ طے ہو چکا تھا۔ تب اچانک ایک زبردست ضرب اس کے بدن پر پڑی اور وہ گھوڑے کی پشت سے اُچھل کر نیچے آ گرا۔اندھیرا کے سر پر لدا ہوا لکڑیوں کا گٹھر بھی اس کے اوپر ہی آ گرا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اندھیرا نے اپنے گھوڑے سے اس پر چھلانگ لگا دی اور نہایت مہارت سے اس کی بندوق پر ٹھوکر لگائی اور بندوق دُور جا گری۔ شناخت کرائے لے جا رہا تھا ہماری سسرے......! موت کو بھول گیا تھا اپنی......ابے یا منگل سنگھ اتنا ہی چوہا ہے کہ تم جیسے گیدڑوں کے پھیر میں آ جائے گا۔کیا کریں تیرا، ابول......!''

جگی کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزنے لگے۔ وہ لرزتی آواز میں بولا۔

''تم ... تم ... منگل سنگھ ہی ہو......؟''

''ہاں......! ہم ہی ہیں تیرے باپ......!'' وہ بولا اور پھر خوفناک آواز میں ہنسنے لگا۔

''میں...... میں تو ایک معمولی سپاہی ہوں منگل سنگھ......! حکم کا غلام...... میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دو۔''

''بزدلی سکھا رہا ہے سسرے......! منگل سنگھ معاف کرنے کا گُر ہی نہیں جانتا۔گولیاں خوب چلائی ہوں گی ساری رات...... یہ بھی تو ہو سکتا ہے تیری ہی گولی لگی ہو ہمیں اور ہم تجھے معاف کر دیں۔ سن رہا ہے پوت......! کیا کہہ رہا ہے یہ گیدی......؟'' منگل سنگھ نے گھوڑے پر بیٹھے لڑکے کی طرف دیکھا اور پھر ایک ٹھوکر جگی کے سر پر رسید کر دی۔

بڑی طاقتور ٹھوکر تھی۔ جگی کا سر پھٹ گیا اور وہ زمین پر تڑپنے لگا۔ منگل سنگھ ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے سپاہی کی بندوق اُٹھائی اور پھر وہیں سے اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی جگی کے سر میں گھس گئی تھی۔ دوسرا فائر اس نے جگی کے دل کا نشانہ لے کر کیا تھا۔ پھر وہ تڑپتے ہوئے سپاہی کے قریب پہنچا اور بے دردی سے اس کے بدن سے کارتوس کی پیٹی اُتار لی۔ پیٹی اپنے بدن پر سجانے کے بعد اس نے بندوق سنبھالی۔ اسے اپنے شانے سے بہتے ہوئے خون کی کوئی پراوہ نہیں تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور پھر اس نے سمت بدل کر گوڑھے کو سرپٹ چھوڑ دیا۔



ویران پہاڑیوں میں شام جھک آئی تھی۔ غیر معمولی قوتِ برداشت کا مالک منگل سنگھ مسلسل سفر کرتا رہا تھا۔ گھوڑے پر سوار لڑکا نڈھال ہو گیا تھا۔ بھوک اور زخموں سے اس کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ چنانچہ منگل سنگھ نے اسے خود سے چمٹا لیا تھا۔ پھر سورج بالکل غروب ہو گیا۔ لیکن منگل سنگھ کی منزل آ گئی تھی۔ اس وقت وہ ایک پہاڑی کے دامن میں تھا کہ ایک طرف سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

پھر ایک انسانی آواز اُبھری اور منگل سنگھ نے بھی ویسی ہی آواز نکالی۔ گھوڑے سوار برق رفتاری کے ساتھ اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔

''سردار......! کیا آپ زخمی ہیں......؟'' ایک گھوڑے سوار نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! مگر پرواہ نہیں ہے۔ تم جلدی جاؤ اور وید جی کو بلا لو۔

ان سے کہنا سارا سامان لے کر آئیں۔'' منگل سنگھ نے کہا اور گھوڑ سوار برق رفتاری سے ایک پہاڑی دراڑ کی طرف دوڑنے لگے۔ دوسرے چند سوار ان کے ساتھ ہی رہے تھے۔

غاروں کی عظیم الشان دُنیا آباد تھی۔ بے شمار لوگ تھے اور انہوں نے اپنی آسائش کے سارے انتظامات کر رکھے تھے۔ منگل سنگھ ایک لمبی سرنگ سے گزر کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچا اور پھر خود ہی گھوڑے سے اُترا۔ لڑکے کو دوسرے لوگوں نے اُتار لیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ منگل سنگھ کون سا معرکہ سر کر کے اور کیا لوٹ کر لایا ہے۔ سب اس لڑکے کو تعجب سے دیکھ رہے تھے جو اب بے ہوش ہو چکا تھا۔

وید جی آگئے اور تیزی سے منگل سنگھ کی طرف بڑھے لیکن اس نے ہاتھ اُٹھایا۔

''پہلے اس دیکھو وید جی......! میری چنتا مت کرو۔ اسے ٹھیک کرو جلدی۔'' وہ بولا اور وید جی کا رُخ بدل گیا اور وہ اپنی کارروائیوں میں مصروف ہوگئے۔ لڑکے کی بیماری بھوک اور خوف تھا۔ چنانچہ وید جی نے پہلے اسے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کیں اور جب وہ ہوش میں آگیا تو اسے گرم دودھ پلوایا اور اس کے بعد وہ منگل سنگھ کے زخموں کو دیکھنے لگے۔ اتنا خون بہہ جانے کے باوجود یہ دیو ہیکل انسان پوری طرح توانا تھا۔



''مار مار کر بھرکس نکال دیں گے اس سسرے کا......تو خود اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دینا منو......! بول مارے گا گولی اسے......'' منگل نے پیار بھری نگاہوں سے منور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر گولی مارنے سے تو انسان مر جاتا ہے۔'' منور نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''جیتا رکھے گا تو اسے ...... جس نے تیرا جیون لینے کی کوشش کی تھی......؟ بوری میں بند کر کے ندی میں پھینک دیا تھا...... کیوں جیتا رکھے گا تو اسے......؟''

''کسی کی زندگی لینا گناہ ہے منگل بابا......! یہ کام تو خدا کا ہے۔ اس نے انسان کو انسان کی زندگی لینے کا حق نہیں دیا۔ اگر چچا میاں نے مجھے مارنے کی کوشش کی تو خدا انہیں مارے گا۔''

''بڑے کام ہیں اسے ارے پگلے......! بہت مصروف رہتا ہے وہ، کون کون سے کام کرے۔ اس سنسار میں تو سب ایک دوسرے کی جان کے لاگو ہیں۔ اس لئے اپنے کام خود کرنے چاہئیں۔ خدا کو نہ جانے کب وقت ملے۔ اس قوت تک کون انتظار کرے گا۔ ترا پاگل ہے تو بھی۔''

''مگر میرے ابا تو کہتے تھے منگل چاچا......! کہ خدا کے کاموں میں انسان کو دخل نہیں دینا چاہئے۔''

''وہ بھی تو انسان کے کاموں میں دخل نہیں دیتا۔ سب کو چھوٹ دے رکھی ہے اس نے۔ جس کا جو من چاہتا ہے کرتا ہے۔ ابھی تو چھوٹا ہے۔ باہر نکل کر دیکھے گا تو پتہ چلے گا کہ سنسار کیا ہے۔ ابھی جانے دے ان باتوں کو۔ میں آہستہ آہستہ تجھے سکھاؤں گا کہ اس سنسار میں کیسے جیا جاتا ہے......؟''

''تم مجھے سکھا دو گے تو جان لوں گا منگل بابا......!'' منور نے کہا اور منگل ہنس پڑا۔

''ہاں......! میں تجھے سب کچھ سکھاؤں گا۔ مگر جو کچھ میں سکھاؤں گا اچھی طرح سیکھ لینا۔ کچھ بولا تو پھر تیرے لئے اچھا نہیں ہوگا۔'' منگل سنگھ کی غراہٹ بے حد خوفناک تھی۔

''سب کچھ سیکھ لوں گا...... سب کچھ۔'' منور نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

منگل سنگھ نے دیہات کے اس معصوم لڑکے کا حلیہ ہی بدل دیا۔ پہاڑوں کی کھلی فضا، ایک سے ایک عمدہ لباس، اور اعلیٰ ترین غذاؤں نے منور کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ منگل سنگھ نے اس کی تربیت بھی شروع کر دی تھی۔

گروہ کے ایک ایک فرد کو بتا دیا تھا کہ آنے والے وقت میں ان کا سردار منور ہوگا۔ اس کی اطاعت کی جائے۔ اس کا مقام بنایا جائے۔ منور کی ابتدائی تربیت اسے بے رحم بنانے کے لئے کی گئی۔ اسے پستول اور بندوق چلانا سکھائی گئی۔ خنجر زنی کی مشق کرائی گئی۔ جنگل سے معصوم جانور پکڑ کر لائے جاتے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں بے بس کر دیا جاتا تھا اور پھر منور ان پر نشانہ بازی کی مشق کرتا تھا۔

جب اس نے پہلے جانور کو ہلاک کیا تو اسے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا تھا لیکن منگل سنگھ کی خوفناک آنکھیں اس کی نگران تھیں۔ اسے منگل سنگھ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ منگل سنگھ جو اپنے لمبے چاقو سے ہر اس شخص کی گردن کاٹ دیتا تھا جو اس کے احکامات کی سرتابی کرتا تھا۔ منور نے کئی آدمیوں کا حشر اس کے ہاتھوں دیکھا تھا اور یہ منگل سنگھ کے اپنے آدمی تھے۔ چنانچہ منور کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس کی کسی بات

سے انکار کرے۔ لیکن معصوم جانوروں کی کربناک چیخیں ساری رات اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھیں۔ دوسرے دن پھر اسے یہی کام سونپا گیا۔ اور پھر روزانہ...... رفتہ رفتہ وہ ان جانوروں کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ منگل اسے دھمکی بھی دیتا تھا۔

''اگر میں ان جانوروں کو کھول دوں تو یہ آن کی آن میں تیرا تیاپانچہ کر دیں گے اس لئے کلیجے......! ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے انہیں ہلاک کر دو۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو...... دشمن ہر جگہ موجود ہے۔ کہیں سے تاک کر نشانہ لگائے گا اور تمہارے بدن میں سوراخ ہی سوراخ ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے ان کا بدن داغدار کر دو۔''

منور اب بے تکان گولیاں چلاتا تھا۔ وہ نشانہ بازی میں کمال حاصل کر چکا تھا اور اس وقت اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ پھر ایک شام غاروں میں ایک دلچسپ ڈرامہ ہوا۔ منگل سنگھ کہیں ڈاکہ مار کر آیا تھا۔ بے انتہا مال و اسباب کے ساتھ اس کا ایک آدمی ایک لڑکی بھی لے آیا تھا۔ خود منگل سنگھ دو آدمیوں کو پکڑ کر لایا تھا جنہیں اس نے ایک جگہ قید کر دیا۔

رات کا وقت تھا۔ غار کی دیواروں میں مشعلیں جل رہی تھیں۔ شراب لنڈھائی جا رہی تھی۔ ڈاکو جشن منا رہے تھے۔ منور بھی اس جشن میں شریک تھا۔ دفعتہً ایک طرف ہنگامہ ہوگیا۔ دو ڈاکو آپس میں لڑ پڑے تھے۔ منگل کے کانوں میں آواز پہنچی تو اس نے ہاتھ بلند کر دیا اور شور وغوغا رُک گیا۔

''کیا بات ہے......؟ تم دونوں آگے آؤ......!'' اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور دونوں لڑنے والے آگے آگئے۔

"کیوں لڑ رہے ہو سسرو......! زیادہ چڑھ گئی کیا......؟ میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ اتنی پیا کرو جتنی ہضم کر سکو۔"

"یہ بات نہیں ہے سردار......!" ان میں سے ایک بولا۔

"پھر کیا بات ہے......؟" منگل انہیں گھورنے لگا۔

"سردار......! میں بستی سے ایک لڑکی اُٹھا لایا تھا۔" ان میں سے ایک بولا۔

"ہاں پھر......؟"

"میں نے اس کے گھر والوں کو مار کر اسے اُٹھایا تھا سردار......! مگر یہ چھدو اس پر اپنا حق جتا رہا ہے۔"

"اس کی وجہ ہے سردار......!" چھدو نے آگے بڑھ کر کہا۔

"وجہ بھی بتا دے پوت......! کیا وجہ ہے......؟" منگل ہنس پڑا۔

"لڑکی چھپ گئی تھی سردار......! میں نے اسے دیکھا اسی وقت پچھائی پلہ بھاری ہو گیا اور میں نے گدی سے کہا کہ وہ لڑکی کو سنبھال لے میں پیچھے جا رہا ہوں۔ گدی لڑکی کو نکال لایا۔ مگر وہ تو میری امانت تھی سردار......! اس کا حق کیسے بن گیا......؟"

"آ گئی سالوں کے بیچ عورت...... بن گئے ایک دوسرے کے دشمن...... اور اب کیا ہوگا جانے ہے چندو......!" وہ منور کی طرف رُخ کر کے بولا۔

"دونوں لڑتے رہیں گے اور ایک دوسرے کی دُشمنی میں پولیس کے ہاتھوں جا لگیں گے اور پورے گروہ کی مصیبت آ جائے گی۔ تم سے کتنی دفعہ کہا ہے ماں کے خصموں......! کہ عورت مت لایا کرو...... بولو...... جواب

دو......!" منگل سنگھ کا رنگ بدل گیا اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کے چہروں پر خوشی نظر آنے لگی۔

"بھول ہو گئی سردار......!" دونوں بولے۔

"کیا سزا ہو اس بھول کی...... خود تجویز کر لو......!"

"معاف کر دو سردار......! اس جیت کی خوشی میں معاف کر دو۔ اپنے دُشمنوں کی شکست کی خوشی میں معاف کر دو۔" دونوں گڑگڑانے لگے اور سردار ان کی شکلیں دیکھنے لگا۔ پھر ایک دم ہنس پڑا۔

"بڑے عورت باز بنتے ہیں سسرے......! لاؤ کہاں ہے وہ گانٹھ......! جاؤ لے کر آؤ۔" اس نے حکم دیا اور دونوں دوڑ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک خوب صورت لڑکی کو پکڑ لائے جو بری طرح خوفزدہ نظر آ رہی تھی۔

"ہوں...... تو یہ ہے زہر کی پڑیا۔ ہٹو اسے جگہ دو ذرا سی...... جھگڑا ختم ہونے دو۔ چل بے گدی نکال چاقو...... تو بھی چھیدو...... جلدی کرو سسرو...... یا میں نکالوں چاقو۔" منگل نے لاپرواہی سے کہا۔ دونوں ایک لمحے کے لئے ٹھٹکے لیکن پھر آگے بڑھے اور دوسرے لمحے لڑکی کی دلخراش چیخ گونج اٹھی۔ دونوں کے خنجر اس کے بدن میں اُتر گئے تھے اور پھر یکے بعد دیگرے انہوں نے کئی وار کر کے اسے زندگی کے بوجھ سے نجات دلا دی۔

"اب اسے لے جاؤ حرامیو......! آدھی آدھی بانٹ لو تم دونوں، اٹھاؤ......!" وہ پھر دہاڑا۔ اور دونوں نے لڑکی کی خون آلود لاش اُٹھائی اور غار سے باہر نکل گئے۔ ہنگامے جو چند ساعت کے لئے رُک گئے تھے، دوبارہ جاری ہو گئے۔ لیکن یہ مدت منور پر بھاری گزری۔ حالانکہ وہ ظلم و بربریت

کے ان مناظر کا عادی ہوگیا تھا لیکن نہ جانے کیوں لڑکی کی موت اس کے
ذہن پر اثر انداز ہوئی تھی۔

دوسرا دن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اس بار منگل سنگھ نے
ایک ایسے شخص کے ہاں ڈاکہ ڈالا تھا جو اس کا دشمن تھا۔ اس نے اس کی بستی
تاراج کر دی تھی اور اپنے دشمن اور اس کے نوجوان بیٹے کو پکڑ لایا تھا۔
چنانچہ دوسری صبح ان دونوں کے لئے قتل گاہ تیار کرائی گئی اور سورج چڑھے ان
کی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کیا گیا۔ دونوں باپ بیٹوں کو قتل گاہ میں لے جایا
گیا۔ ایسے موقعوں پر منور کو ضرور ساتھ رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ منور بھی موجود تھا۔

''رگھو لال چوہان......! تم نے دیکھ لیا منگل کی دشمنی کو...... میں نے
تم سے کہا تھا رگھو لال......! کہ مجھے چھیڑ کر تم نے پوری بستی کی تباہی خریدی
ہے۔ جھوٹ تو نہیں کہا تھا۔''

''برا کیا تو نے منگل......! دشمنی ہماری تمہاری تھی۔ دوسروں کا کیا
دوش تھا......؟'' رگھو لال نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

''دوش ان کا بھی تھا کہ وہ تیری بستی والے کیوں تھے......؟ دو چار
سے منگل سنگھ کا دل نہیں بھرتا۔ پھر اب کیا خیال ہے تیرا......؟''

''کیا تو رحم کرنا جانتا ہے منگل......؟'' رگھو لال نے پوچھا۔

''ارے......رے......رے......بس ایک یہی کام نہیں آتا منگل کو،
باقی سارے کام جانے ہے۔ مگر تم نے کیوں پوچھا ہے......؟''

''میرے بیٹے کو چھوڑ دے...... میں تجھ سے اپنے لئے رحم نہیں
مانگوں گا۔ پر اسے ضرور معاف کر دے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔
بڑے ارمان سے یہ اپنا بیاہ رچا رہا ہے۔''

''اوہو...... تو یہ سہرا باندھے گا کھوپڑی پر...... کیوں رے شادی
کرنے جارہا ہے......؟''

''ہرگز نہیں منگل سنگھ......! میں تیری بھیک دی ہوئی زندگی کبھی قبول
نہیں کروں گا۔ اور جب میرے پتا ہی اس سنسار میں نہیں رہیں گے تو میں
شادی کر کے کیا کروں گا......؟''

''ارے......تو بھیک دے ہی کون رہا ہے کلیجے......! پر تم دونوں نے
سوچی خوب ہے۔ تم اس کے جیون کی بھیک مانگو...... وہ تمہارے جیون کی۔
اور منگل سنگھ تو ایسے ہی دھرماتما ہیں کہ دونوں کو بھیک دے دیں......
واہ......!'' منگل سنگھ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''ایک کام تو تم کر ہی سکتے ہو منگل سنگھ......!'' رگھو لال پھر بولا۔

''وہ کیا چندا......؟'' منگل سنگھ نے پوچھا۔

''پہلے مجھے قتل کر دو تا کہ میں اس کی موت نہ دیکھ سکوں۔'' رگھو لال
کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اور منگل سنگھ ہنس پڑا۔

''رو رہا ہے بزدل کہیں کا...... بڑی بات کہی تھی تو نے...... یاد کر اور
بڑی بات کی سزا بھی بڑی ہی ہووے ہے سسرے......! اور آج تو میرا شیر
پہلا بڑا شکار کرے گا۔ اس طرح اس کی مہارت بھی ہو جائے گی۔ آج
ہمارے ہاں رحم نہیں ہوگا رگھو لال......! آج کسی کی کوئی بات نہیں مانی جائے
گی رگھو لال......! آجا رے میدان میں۔'' اس نے منور کو اشارہ کیا اور منور
اس کے سامنے پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے منگل بابا......!'' اس نے پوچھا۔

''لے مار دے ان دونوں کو گولی...... ہمارے پستول سے۔ بس ان

کا جیون ختم ہوگیا۔'' منگل سنگھ نے اپنا پستول نکال کر منور کو دے دیا اور منور کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے منگل سنگھ کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر ان دونوں باپ بیٹوں کی طرف۔ دوسرے لمحے اس کے پستول سے دو گولیاں نکلیں اور رگھو لال کے دل میں پیوست ہوگئیں۔ رگھو لال نے دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ لیا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے احسان مند نگاہوں سے منور کو دیکھا اور زمین پر گر پڑا۔ منور نے دوبارہ فائر کئے اور اس بار نوجوان لڑکا ڈھیر ہوگیا۔ لیکن منگل سنگھ غور سے منور کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار تاثرات نہیں تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کے تاثرات بدلے اور وہ ہنسنے لگا۔

''چلو بے...... جشن کی تیاریاں کرو۔ شیر کے منہ خون لگ گیا ہے آج۔ آج مہندی لگ گئی اپنے منور کے ہاتھوں میں۔ اب مزہ آئے گا ڈاکے مارنے کا۔ چلو جشن مناؤ......!'' اور ڈاکو شور مچانے لگے۔ وہ خوشی سے ناچ رہے تھے۔

''پر تو نے گھائل کر دیا ہمیں چندا......! کیا تیرے من میں رحم آ گیا تھا ان سالوں کے لئے......؟'' سب کے چلے جانے کے بعد منگل نے منور سے پوچھا۔

''کیوں منگل بابا......!''

''تو نے پہلے بوڑھے کو کیوں مارا......! کیا تو نے اس کی آخری خواہش مان لی تھی......؟''

''نہیں منگل بابا......! تم نے اس بارے میں تو کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے اسے پہلے اس لئے مارا کہ اس نے تم سے بڑی بات کہی تھی اور تمہارا

اصل دشمن وہ تھا۔'' منور نے جواب دیا۔

''ابے...... سچ کہہ رہیا ہے کیا...... ابے کالیجے......! یہ بات تھی تو ٹھیک ہے۔ میں تو غلط ہی سمجھ بیٹھا تھا۔'' منگل سنگھ خوش ہو کر قہقہے لگانے لگا۔



بستیوں کا سکون غارت ہوگیا تھا۔ کون کون سے جتن نہ کئے گئے تھے ان ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لئے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران نے زندگیاں قربان کر دی تھیں۔ متعدد سپاہی موت کی آغوش میں جا سوئے تھے اور آج بھی منگل سنگھ کے خلاف پولیس کی مہمات جاری تھیں لیکن وہ اور اس کے ساتھی اس قدر چالاک تھے کہ ہاتھ ہی نہ آتے تھے۔ اس چالاکی سے کام کرتے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ قتل و غارت گری کے رسیا، جدھر سے گزرتے خون ہی خون پھیل جاتا اور اس کے بعد جو المیے ہوتے وہ تاریخ بن جاتے۔

اور بدبختی کی یہ رات احمد پور پر بھی چھا گئی۔ سرِ شام ہی بادل گھر آئے تھے۔ کئی بار ہلکی بوندا باندی ہوئی تھی اور بند ہوگئی تھی۔ فضا میں عجیب سا حبس تھا اور دلوں میں انجان سی بے چینی۔ لیکن رات کے دوسرے پہر یہ بے چینی بے سبب نہ رہی۔ چاروں طرف سے گولیوں کا شور ابل پڑا۔ سوتے ہوئے لوگ پہلے تو اسے تیز اور طوفانی بارش کا شور سمجھے لیکن پھر چاروں طرف سے منگل سنگھ کی جے جے کار ابھری اور دل دھڑکنا بند ہوگئے۔ منگل سنگھ کا نام ان علاقوں کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ جو سنا تھا وہ سامنے آ گیا۔ مکان لوٹے جانے لگے، زندگیاں ختم کی جانے لگیں۔ آہ و بکا کی آوازیں ہر گھر سے بلند ہونے لگیں۔

ایک چھوٹے سے خوب صورت مکان کے برآمدے میں جاءنماز پر بیٹھے ہوئے باریش شخص نے جلدی سے سلام پھیرا۔ گھر کے خوفزدہ لوگ برآمدے میں نکل آئے تھے۔

''جلدی اندر چلیں ماموں جان......! ڈاکو منگل سنگھ نے حملہ کیا ہے۔'' ان میں سے ایک شخص نے چیخ کر کہا۔

''میری نماز پوری نہیں ہوئی ہے تم جاؤ......!'' پُروقار آواز ابھری۔

''ماموں جان ......! خدا کے لئے...... اندر چلیں۔'' اب سارا ایک نسوانی آواز نے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی کئی چیخیں بلند ہوئیں کیونکہ برآمدے کے سامنے کی دیوار سے اندر کوئی کود رہا تھا۔ بلند و بالا قد، سیاہ لباس کے درمیان سفید چہرہ، بڑی بڑی حسین آنکھیں لیکن خون کی وحشت لئے ہوئے، ہاتھوں میں موت برسانے والا ہتھیار، وہ برق رفتاری سے برآمدے میں آ گیا۔ اور ساری آوازیں بند ہوگئیں۔ سہمی ہوئی آنکھیں خوف سے پھیلی رہ گئی تھیں۔

وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ آیا اور باریش شخص نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، پھر بدحواس ہو جانے والوں کی طرف اس کی متین آواز ابھری۔

''فرشتہ اجل......! لوٹ مار کی خواہش ہے تو اندر چلے جاؤ اور اپنا مقصد پورا کرو۔ روحیں قبض کرنے آئے ہو تو یہ جاندار تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ جب تک انہیں ہلاک کر دو اور مجھے دو نفل ادا کر لینے دو۔ اگر فریضۂ خداوندی کی ادائیگی میں مجھے دیر ہو جائے اور تم اپنے کام سے جلد فارغ ہو جاؤ تو مجھے سجدے کے عالم میں گولی مار دینا کہ میری روح خدا کے حضور جائے گی اور اس سے بڑی سعادت کسی اور کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

میں اس وقت درِ معبود پر ہوں اور خدائے قدوس کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ موت کا خوف میرے وجود کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔ اللہ اکبر......!'' بزرگ نے نیت باندھی اور نوافل کی ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔

وہ برآمدے میں کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی خونیں آنکھوں میں ایک عالم لرزاں تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے مرحوم باپ صوفی عظمت اللہ کی تصویر روشن ہوگئی تھی۔ وہ بھی تہجد گزار تھے اور دورانِ نماز کسی شئے سے رغبت نہ رکھتے تھے۔ وہ بھی موت کی جانب سے اسی قدر بے پرواہ تھے۔ عالم نماز میں ان کے چہرے پر بھی یہی تقدس ہوتا تھا۔ وہ بھی ہر خطرے سے اسی طرح بے نیاز ہوتے تھے۔ بستی کا مکان، اپنی دُکان اور نہ جانے کیا کیا اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا۔

اسی وقت مکان کی دیوار پر اس کے تین ساتھی نظر آئے اور پھر وہ بھی بھد بھد کر کے اندر کود آئے۔ تب نوجوان نے ہاتھ اُٹھا دیا۔

''گولی مت چلانا۔'' اور بندوقوں کی نالیں جھک گئیں۔

''کیا اندر کام ہو رہا ہے سردار......!'' آنے والوں میں سے ایک نے پوچھا۔

''جاؤ......! اپنا کام کرو۔'' اس کی گرجدار آواز ابھری اور تینوں جس طرح اندر آئے تھے، اسی طرح واپس چلے گئے۔ برآمدے میں ساکت و جامد کھڑے لوگوں کے چہروں سے اب بھی خوف عیاں تھا۔ وہ ہر لمحہ موت کو اپنے قریب محسوس کر رہے تھے۔ آنے والوں کے منہ سے وہ سردار کا لفظ سن چکے تھے اور سوچ رہے تھے تو یہ ہے منگل سنگھ...... لیکن وہ خاموش کیوں ہے......؟ کیا نماز ختم ہو جانے کا انتظار کر رہا ہے......؟ لیکن وہ ہندو ہے۔

نماز کا احترام کیوں......؟

بزرگ نہایت اطمینان سے نماز پڑھتے رہے اور کافی دیر گزر گئی۔ باہر کے ہنگامے بدستور جاری تھے پھر ایک تیز سیٹی کی آواز اُبھری، یہ واپسی کا اشارہ تھا۔ نوجوان نے اسے سنا لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آج وہ جس تقدس کو دیکھ رہا تھا اس تقدس سے اس کی روح کی گہری وابستگی تھی اور وہ یہ منظر نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ سیٹی کی آواز کے بعد ہر شخص کو واپسی لازمی ہوتی تھی اور اس ہنگامے میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوتا تھا۔ لیکن نوجوان ڈاکو نے اس کی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ اطمینان سے کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ باہر شور تھم گیا۔ اب آوازیں صرف رونے پیٹنے کی تھیں۔

بزرگ نے دوبارہ سلام پھیرا اور پھر ڈاکو کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ان کی آنکھوں میں بھی تعجب تھا۔

''تم نے اپنا کام شروع نہیں کیا......؟'' انہوں نے پوچھا اور نوجوان آگے بڑھ آیا۔ اس نے اپنی بندوق ایک ستون سے ٹکائی اور بزرگ کے سامنے پہنچ گیا۔ پھر اس نے اپنا سینہ کھول دیا۔

''کیا آپ میرے سینے پر پھونک نہیں ماریں گے......؟'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''کیا مطلب......؟'' بزرگ حیرت سے بولے۔

''آپ...... آپ تو ہمیشہ ایسا کرتے تھے۔'' اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔

''میں......؟'' بزرگ نے تعجب سے اسے دیکھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ سب کے سب متعجب کھڑے ہوئے تھے۔

''میرا سینہ کھلا ہوا ہے۔ میں آپ کے گھر سے آپ کی عبادت کا ایک حصہ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں وہ دُعائیں لے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے میرا ماضی دے دو۔ ان بابرکت کلمات کی ہوا میرے سینے کو پہنچا دو۔ اس میں بڑی جلن ہے۔ خدا کی قسم بڑی سوزش ہے اس میں۔ طویل عرصہ سے جل رہا ہوں۔ میں اس نعمت کو تمہارے گھر سے لے جاؤں گا۔ جلدی کرو، وہ سب جا چکے ہیں، جلدی کرو۔'' نوجوان پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

باریش بزرگ خود بھی حیرت زدہ تھے اور نوجوان کے الفاظ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس کا چوڑا سینہ کھلا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ آنکھوں کے موتی ان بالوں میں اٹک کر جھلملا رہے تھے۔ تب بزرگ نے آسمان کی جانب دیکھا اور ان کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔

''بار الٰہا......! میں عاصی اس قابل کہاں کہ ایک بھٹکے ہوئے کو راہِ راست پر لا سکوں۔ لیکن تیرے کلام میں اتنی قوت ہے کہ پہاڑوں کو سنگریزہ بنا دے۔ سو اس بابرکت کلام کے سہارے یہ کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ بسم اللہ......!'' انہوں نے کہا اور نوجوان کے سینے پر پھونک دیا۔

نوجوان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ بے حد جذباتی ہوگیا تھا۔ دیر تک وہ آنکھیں بند کئے کھڑا رہا۔ پھر اس نے سینہ بند کر لیا اور آنسو خشک کرتا ہوا واپسی کے لئے مُڑ گیا۔ تبھی باریش بزرگ کی آواز ابھری۔

''گناہ کی جس آگ کی سوزش سے تڑپ کر تم نے کلام الٰہی کی ٹھنڈک طلب کی تھی کیا پھر اسی آگ کی جانب جا رہے ہو نوجوان......!''

اور نوجوان کے قدم رُک گئے۔

''جہنم میں رہنے والے کو اگر جنت کے قریب سے گزرنے کا موقع مل جائے تو جنت اس کا حق تو نہیں بن سکتی۔ میرے لئے اس جہنم کے سوا اور کوئی پناہ نہیں ہے۔'' اس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

''رحمت خداوندی سے مایوسی کفر کی منزل سے جا ملتی ہے۔ گناہ کے بعد توبہ کی رعایت دی گئی ہے۔ کیا تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاؤ گے......؟''

''میں ڈاکو ہوں محترم......! ایک بے رحم قاتل ہوں۔ اتنے گناہ کئے ہیں میں نے کہ رحمت کی طلب کا تصور میری گردن شرم سے جھکا دیتا ہے۔''

''اور اسے شرم سے جھکی گردنیں پسند آتی ہیں۔ وہ الرحم الراحمین ہے اور اس کی رحمت کے خزانے لامحدود ہیں۔ تمہاری طلب پر اگر وہ دینے پر آجائے تو اس کی رحمت کے خزانے کا ایک ذرّہ کائنات کے گناہوں کو ڈھانپ لے، تم کیا حیثیت رکھتے ہو......؟ آؤ میں تمہیں توبہ کے راستوں پر آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ ممکن ہے میری یہ کوشش میرے اپنے گناہوں کی طویل فہرست میں کمی کا باعث بن جائے اور عاقبت میں میری بہتری کا سامان بن جائے۔'' بزرگ کی آواز پُراثر تھی۔ نوجوان آنسو بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا اور پھر اس نے گردن جھکا دی۔ تب بزرگ نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔

''رحمتِ ایزدی لامحدود ہے۔ اس نے تمہارے دل میں یہ کیفیت بیدار کر کے تمہیں نیکیوں کی طرف بلایا ہے اور جب تم نے نیکیاں اپنالی ہیں تو آؤ بدی کے اس لبادے کو اُتار دو۔ عرفان میاں......! کیا تم اس نوجوان کو ایک سادہ لباس مہیا کر دو گے......؟'' اس بار انہوں نے دوسرے لوگوں میں

سے کسی کو مخاطب کر کے کہا۔

''کیوں نہیں ماموں جان......!'' آواز میں جھجک تھی۔ یہ ڈرامائی صورتِ حال کسی کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔ بھلا ایک ڈاکو اور ڈاکو بھی منگل سنگھ نیکیوں کے راستے پر کس طرح آ سکتا ہے۔ لیکن بزرگ کی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ کوئی ان کے حکم سے سرتابی کر سکتا۔ چنانچہ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ تب نوجوان ہی بولا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں گناہوں کی اس یادگار کو یہاں سے دُور دھکیل آؤں۔'' اس نے بندوق کی طرف اشارہ کیا۔

''باہر میرا گھوڑا بھی موجود ہے۔''

''میں تمہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دوں گا اس وقت تک جب تک کہ تم اس لباس سے چھٹکارا حاصل نہ کر لو۔ عرفان میاں......! تم گئے نہیں......؟'' انہوں نے پھر دوسرے آدمی کو مخاطب کیا۔

''جی ابھی ماموں جان......!'' وہ اندر دوڑ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنا ایک جوڑا لے کر باہر آ گیا۔ بوڑھے نے نوجوان کو وہ لباس دیا اور اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔

''یہ ماموں جان نے کیا کیا......؟''

''وہ تو مذہباً بھی ہندو ہے۔''

''اور ڈاکوؤں کا سردار ہے۔''

''یہ بھی اس کی کوئی چال تو نہیں ہے......؟''

''دادا جان بھی بس جذباتی ہیں۔ بھلا ایک ڈاکو پر اعتبار کیا جا سکتا ہے......؟''

''دیکھ لینا نانا میاں کسی خطرناک حادثے سے دوچار کریں گے سب کو۔''

''افوہ......! آہستہ بولو......! اگر دونوں میں سے کسی نے سن لیا تو شامت آجائے گی۔''

''لیکن پھوپھا میاں......! اب کیا ہوگا......؟ وہ تو ہمارے ساتھ قیام کے لئے بھی تیار ہوگیا ہے۔''

''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔'' عرفان کی آواز ابھری اور اسی وقت وہ دونوں باہر آگئے۔ نوجوان نے اپنے ڈاکوؤں کے لباس کی ایک گٹھری بنائی ہوئی تھی۔ اس میں اس کا پستول اور خنجر بھی اڑھا ہوا تھا۔ پھر اس نے بندوق اٹھائی اور اسے بھی ساتھ لے لیا اور پھر دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ عرفان بھی بے اختیار ساتھ ہولیا تھا۔ دیوار سے ملحق گھوڑا کھڑا ہوا تھا۔ نوجوان نے اپنا سامان گھوڑے پر رکھا۔ بندوق زمین میں ٹھونس دی اور پھر اس نے گھوڑے کو ایک مخصوص انداز میں ہاتھ مارا اور گھوڑا اُچھل کر سرپٹ ہوگیا۔ آن کی آن میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

بزرگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ شور وغوغا کی آوازیں اب بھی چاروں طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ وہ گھر میں واپس آگئے۔ تب بزرگ اسے لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گئے۔

''لوٹ مار شاید ابھی جاری ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''نہیں......! وہ واپس جا چکے ہیں۔'' نوجوان نے متانت سے کہا۔

''تم شاید ڈاکو منگل سنگھ ہو......؟'' اس بار عرفان زبان کھولے بغیر نہ رہ سکا۔

''نہیں......!'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن اندر آنے والوں نے تمہیں سردار کہہ کر مخاطب کیا تھا۔'' عرفان بولا۔

''میں اس کا نائب تھا۔ اس کے بعد ہونے والا سردار......!''

''تمہارا نام کیا ہے......؟''

''ٹھہرو عرفان......! پہلے مہمان سے ہم اپنا تعارف کرائیں گے۔ پھر ان سے ان کے بارے میں پوچھیں گے۔ تو میاں خاکسار کا نام عبداللہ ہے۔ میں شہر میں رہتا ہوں اور یہ جو تم سے سوالات کر رہے ہیں میرے بھانجے عرفان ہیں۔ عرفان اسی بستی میں رہتے ہیں اور میں شہر سے انہیں کے ہاں آیا تھا۔ یہ میرا نواسا ارشد ہے اور یہ پوتی شمائل۔ یہ عرفان کی اہلیہ ہیں اور یہ اس کے دونوں بچے محمود اور عاقل۔ حج کر کے آیا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں سے ملنے چلا آیا کیونکہ عرفان بہت مصروف رہتے ہیں۔ تو یہ ہے ہماری تفصیل اور اب تم بھی اپنا نام بتا دو۔''

''میرے والدین نے میرا نام منور رکھا تھا لیکن تقدیر نے میرے وجود کو سیاہ کر دیا۔'' منور آہستہ سے بولا اور بزرگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''الحمد للہ تم مسلمان ہو۔ مجھے یقین تھا۔ رہی تاریکی کی بات تو نور ہمیشہ نور رہتا ہے۔ تاریکی کی بدنما چادر کتنی ناپائیدار ہے تم اس سے اندازہ لگاؤ کہ وہ آناً فاناً آتی ہے اور ماحول کو اپنے مہیب بازوؤں میں سمیٹ لیتی ہے لیکن پھر تارے اس کا طلسم توڑ دیتے ہیں اور پھر ان کے مدد کے لئے چاند نکل آتا ہے اور تاریکی کی چادر تار تار ہو جاتی ہے۔ وہ کونوں کھدروں

میں منہ چھپاتی پھرتی ہے۔ ساری رات چاند اس پر حاوی رہتا ہے اور پھر اپنے فرائض سورج کے حوالے کر کے خود آرام کرنے چلا جاتا ہے کہ دوسری رات تاریکی سے نبردآزما ہو جائے۔ یہ نظامِ قدرت ہے اور تاریکی شکست خوردہ رہتی ہے۔ چنانچہ تمہاری تقدیر کی تاریکی چھٹ گئی ہے اور تم پھر سے منور بن گئے ہو۔ روشنی کے راستے اپناؤ، ہم سب تمہارے مددگار ہیں۔ ایک آدھ دن میں ہم یہاں سے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا۔ میرا بیٹا بہت بڑا وکیل ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ہم لوگوں کے درمیان خوش رہو گے۔ یوں محسوس کرو کہ تم اپنے بچھڑے ہوئے خاندان میں آ گئے ہو۔'' منور نے سر جھکا لیا تھا۔

''اب تم آرام کرو۔ کل صبح ملاقات ہوگی اور بچو......! تم سے یہ کہنا فضول ہے کہ اپنے مہمان کی حقیقت کسی سے نہیں بتاؤ گے۔''

''جی......!'' سب نے جواب دیا۔

منور کے لئے ایک آرام گاہ تجویز کر دی گئی اور سب اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن منور کے پورے بدن میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کا دل ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ جذبہ تو کبھی کا اس کے سینے میں دم توڑ چکا تھا۔ ان راستوں سے تو وہ بہت دُور نکل چکا تھا۔ منگل سنگھ نے اسے اپنے خوابوں کی انتہا بنا لیا تھا۔ وہ اس پر بے پناہ فخر کرتا تھا۔ اس کے ہر کارنامے کو خود سے منسوب کر لیتا تھا کہتا تھا۔

''سالو......! منگل سنگھ کے دو روپ ہیں۔ اس کی جوانی منور ہے اور

بڑھاپا وہ خود ہے۔ چنانچہ منگل سنگھ کی عمر چالیس سال اور بڑھ گئی ہے۔ ان سالوں کا مقدر ہی خراب ہے جو منگل سنگھ کو ختم کرنے کے لئے دن رات ایک کر چکے ہیں۔ پیدا ہوئے تو منگل کا نام سنا، بوڑھے ہوں گے تو یہی حسرت لے کر اسے گرفتار کر لیں۔''

خود منور نے اس زندگی سے علیحدہ ہونے کا تصور نہیں کیا تھا۔ صوفی عظمت علی کی موت کے بعد اس نے چند لمحات کے لئے چچا کا گھرانہ دیکھا تھا۔ جہاں اس کے لئے محبت کا کوئی نقش نہیں تھا۔ اس کے بعد منگل سنگھ کے ڈیرے پر اسے چاہت ملی تو اس نے وہی زندگی سمجھ لی۔ اس سے الگ زندگی کا تصور ہی ختم ہو گیا تھا۔ لیکن آج کوئی آ گیا تھا۔ وہ جس نے کان سے پکڑ کر اسے آگے جانے سے روک دیا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے وہ گولیاں کھیل رہا ہو اور صوفی عظمت علی اسے کان سے پکڑ کر گھر لے آئے ہوں۔

''نہیں بیٹے......! اچھے بچے شیشے کی گولیوں سے نہیں کھیلتے۔ اس کھیل کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔''

ہاں! وہ بھی تو صوفی عظمت علی ہی کی طرح تھے ورنہ وہ ان کے سامنے موم کیوں بن جاتا۔ وہ تو ڈاکو منگل سنگھ کی ناک تھا۔ لیکن اب...... اب کیا ہوگا......؟ منگل سنگھ اس کے گم ہو جانے کے بعد کیا کرے گا......؟ اور آئندہ زندگی، آئندہ زندگی......؟

درحقیقت وہ معصوم تھا۔ اس کا ایک بھی قدم اس کی اپنی مرضی سے نہیں اٹھا تھا۔ وہ جو کچھ بن گیا تھا اس میں اس کا اپنا ہاتھ نہیں تھا۔

دوسری طرف ایک بڑے کمرے میں وہ سب عبداللہ صاحب کے گرد جمع تھے۔ عرفان کہہ رہا تھا۔

"میں آپ کے کسی اقدام پر نکتہ چینی تو نہیں کر سکتا ماموں جان......! لیکن یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔"

"کیوں بیٹے......!" بزرگ نے شفقت سے پوچھا۔

"وہ ڈاکو ہے۔"

"ہے نہیں...... تھا۔" بزرگ نے کہا۔

"یہ ممکن نہیں ہے ماموں جان......! کیا وہ ایک دن میں ڈاکو بن گیا ہوگا......؟"

"ہرگز نہیں......!"

"پھر وہ ایک دن میں نیکیوں کے راستے پر کس طرح آ سکتا ہے......؟"

"وہ ننگی تلوار لے کر گھر میں داخل ہوئے تھے اور قتل کرنے آئے تھے انہیں جو ایمان لا چکے تھے۔ تب کلام الٰہی ان کے کانوں میں پڑا اور اسے سن کر وہ ساکت ہوگئے اور پھر ان کا سینہ نورِ ایمان سے منور ہوگیا اور انہوں نے کلمہ حق پڑھ لیا۔ مثال موجود ہے۔" بزرگ نے حلیمی سے جواب دیا۔

"لیکن ماموں جان......! بڑا فرق ہے ان دونوں میں۔" عرفان پریشانی سے بولا۔

"انسانوں میں ضرور فرق ہے لیکن جذبۂ ایمان ایک ہی ہے۔ اس سے انکار کرو گے......؟"

"وہ سیاہ دل اور سفاک انسان ہے۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا اسکیم ہے......؟" عرفان بولا۔

"کیا ڈاکو منگل سنگھ اس طرح اسکیمیں بناتا ہے۔ وہ لوٹنے آیا تھا۔

بندوق اس کے ہاتھ میں تھی۔ جس طرح پوری بستی میں گولیاں چل رہی تھیں، یہاں بھی چلتیں۔ ہم میں سے کچھ خون میں نہا جاتے۔ وہ لوٹ مار کرتے اور یہاں سے چلے جاتے۔ بچو......! جو کچھ ہوا ہے میں اس سے مشکوک نہیں ہوں۔ ذاتِ باری تعالیٰ پر میرا ایمان ہے۔ تم بھروسہ کرو۔ اس کی ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"لیکن ماموں جان......! ہم اس کے خلوص کو آزما بھی تو سکتے ہیں۔" عرفان نے پرُخیال انداز میں کہا۔

"وہ کس طرح......؟" عبداللہ صاحب بولے۔

"پولیس ڈاکو منگل سنگھ کی تلاش میں ہے اور وہ یقیناً اس کے ٹھکانوں سے واقف ہوگا۔ وہ منگل سنگھ کو گرفتار کروا دے۔"

"لغو اور بیہودہ خیال ہے۔ تمہیں علم ہے کہ وہ منگل سنگھ کی ناک کا بال ہے اور اس کے آدمیوں نے اسے سردار کہہ کر پکارا تھا۔ اس سے اس کی حیثیت کا اندازہ کرلو اور یہ حیثیت بلاوجہ بھی نہیں ہوگی۔ اگر اس کے سینے میں جذبۂ ایمان جاگ اٹھا ہے تو ہم اس سے اس کے اس جذبے کی اتنی بڑی قیمت طلب کریں جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو، اور وہ کشمکش کا شکار ہو جائے۔ اس طرح وہ واپس بھی لوٹ سکتا ہے۔ عرفان میاں......! میری دُعا ہے کہ لوگوں کی جان و مال کا دُشمن فنا ہو جائے۔ لیکن منور کو بھول جاؤ۔ اب اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"جیسا آپ پسند کریں ماموں جان......!" عرفان نے کہا۔

"ویسے عرفان میاں......! محسوس نہ کرنا۔ میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہر قیمت پر منور کی حفاظت چاہتا ہوں۔

ممکن ہے تمہارے ذہن میں کوئی اور جذبہ جاگ اٹھے۔''

''نہیں ماموں جان......! آپ کے احکامات سے انحراف کی جرأت نہ کبھی کی ہے اور نہ کر سکوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں ہم میں سے کوئی اب دوبارہ زبان نہیں کھولے گا۔''

''میں نے یقین کر لیا۔ لیکن مجھے کل جانے کی اجازت دے دو۔ بس میں جانا چاہتا ہوں۔ یہ میری خواہش ہے۔''



''بالکل بچہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس نے دُنیا میں کچھ نہیں دیکھا ہو۔ ہر چیز سے ناآشنا، آنکھوں میں فرشتوں کی سی معصومیت ہے۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ وہ ڈاکے کس طرح ڈالتا تھا......؟'' شمائل نے کہا۔

''نانا میاں کے پالتو کی بات کر رہی ہو۔ میرا مطلب ہے اس بوڑھے بچے کی جو نانا میاں کی نقل ہو بہو اتار لیتا ہے......؟'' ارشد بولا۔

''کیا مطلب......؟'' شمائل ہنس کر بولی۔

''تم نے دیکھا نہیں نانا میاں نماز پڑھتے ہیں تو وہ بھی نماز پڑھتا ہے۔ وہ کلامِ پاک پڑھتے ہیں تو وہ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔''

''بڑے ذلیل ہو تم ارشد......! مذہب کا مذاق اڑا رہے ہو۔'' شمائل بولی۔

''تم خود بتاؤ......! بڑھاپے کے کام جوانی میں کرنے والے نقال نہیں کہلائیں گے تو پھر اور کیا کہا جائے گا انہیں......؟''

''خیر عبادت نوجوانی ہی میں کرنی چاہئے۔ بڑھاپے کی عبادت بھی کوئی عبادت ہے......؟''

''تم کرتی ہو......؟''

''کرتی تو نہیں ہوں لیکن......''

''جی لیکن کیا......؟'' ارشد حیرت سے بولا۔

''تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو......؟ اپنی بات کرو۔'' شمائل چڑ کر بولی۔

''میں تو عبادت کرتا ہوں۔ پورے دل سے کرتا ہوں۔ کسی حسن کی دیوی کی پوجا کسی عبادت سے کم ہوتی ہے......؟''

''آ گئے ناں اوقات پر......!'' شمائل ہنس پڑی۔

''حالانکہ جانتے ہو اس پوجا سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔''

''اُمید پر دُنیا قائم ہے۔ دیکھ لو ہم تو تمہارے پیچھے احمد پور تک گئے لیکن ابھی تقدیر نہیں بنی...... ویسے ایک بات لکھ لو شمائل......!''

''وہ کیا......؟''

''آج نہیں تو کل ہمارے بزرگوں کو سوچنا پڑے گا کہ ہم دونوں کی جوڑی عرش سے اُتری ہے اور ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔''

''ممکن ہے......!'' شمائل نے کہا۔

''اس کے بعد تم مجھ سے اجتناب کس طرح کرو گی......؟''

''میرا خیال ہے اس کے بعد اجتناب کی ضرورت ہی نہیں رہ جائے گی۔'' شمائل اٹھلا کر بولی۔

''تو شمائل......! آج کا کام کل پر کیوں اٹھا رکھا جائے......؟ بزرگوں کو یہ فیصلہ کرنا ہی ہے۔ ہم ان کے فیصلے کا کیوں انتظار کریں......؟

شمائل......! یقین کرو میں تمہیں بے پناہ چاہتا ہوں۔ میری تنہائیاں تصور سے پُر ہوتی ہیں۔ تمہارے سامنے آ کر میں کائنات کو بھول جاؤں میری کائنات......! مجھ سے دُور نہ رہو۔ مجھے خود میں کھو جانے دو میں......'' ارشد نے آگے بڑھ کر شمائل کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے مسکرانے لگی۔

''نہیں...... نہیں مسٹر ارشد......! باقی آئندہ...... ویسے تم چالاک انسان ہو۔ میں کچھ اور باتیں کر رہی تھی۔ تم نے چالاکی سے داخل کر دیا۔ ہٹاؤ ہاتھ...... خود بھی رُسوا ہو گے اور مجھے بھی بدنام کر چھوڑو بھی......!''

''شمائل......! میں رُسوائی ہی تو چاہتا ہوں۔ یہ رُسوائی ہی ہم چلیں'' کے ملاپ کا باعث بن جائے گی اور ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے میرے لئے یہ رُسوائی اپنا لو شمائل......!''

''مجھے تمہاری یہ بدحواسی ہی ناپسند ہے ارشد......! شادی سے پہلے وہ......؟'' یہ قربت ممکن نہیں ہے اور نہ ہی میں اسے پسند کرتی ہوں۔ برائے کرم چھوڑ دو۔'' شمائل نے سخت لہجے میں کہا اور ارشد نے اسے چھوڑ دیا۔

''میرے ساتھ تمہارا رویّہ بہت سخت ہے شمائل......!'' وہ اداس بولا۔

''میں نے کہا ناں ارشد......! میں لاکھ ترقی پسند سہی لیکن اپنی حد میں رہنا بہتر ہوتا ہے۔ اگر ہم اخلاق کی حدود سے گزر گئے تو خود بھی ذلیل رہیں گے۔''

''حالانکہ میں تمہاری زندگی کا ساتھی ہوں۔ میری قربت سے

پشیمانی نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن خیر...... تمہاری مرضی...... میں کوشش کروں گا کہ تمہاری اس بے رُخی کو برداشت کر سکوں۔'' ارشد نے کہا اور دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

باہر کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔

''اوہ...... فروزاں......! تم کب آئیں......؟'' شمائل ایک شوخ و شنگ لڑکی کی طرف بڑھ گئی۔

''ابھی ابھی......! امی اور خالہ جان بھی آئی ہیں لیکن آپ بڑی مشکوک حالت میں برآمد ہوئی ہیں۔'' فروزاں نے ارشد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ارشد ظہیر عبداللہ کو دیکھ کر سنبھل گیا۔ ورنہ شاید وہ ان لوگوں کا پیچھا نہ چھوڑتا۔

''اونہہ......! چھوڑو کیا فضول باتیں لے بیٹھیں۔ آؤ کمرے میں

''ہائے شمائل......! تیرے گھر میں تو قیامت آئی ہوئی ہے۔ اللہ کی پناہ......! میرے تو حواس کھوئے ہوئے ہیں۔ بتا تو اے کم بخت......! کون

''لعنت ہے تم پر...... اب کس کو دیکھ کر حواس کھو گئے تمہارے......؟'' شمائل نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''وہ سفید چہرہ، مخمور آنکھیں جن میں نہ جانے کیسی سرخی چھائی ہوئی ہے۔ خدا کی قسم......! یوں لگتا ہے جیسے ٹیں خون کر کے آیا ہے لیکن دلوں کیونکہ اس کا معصوم چہرہ خونیوں کا چہرہ نہیں لگتا۔ بلند و بالا تر...... چوڑے سینے پر سیاہ گھنے بال......''

''سفید قمیص پتلون...... کیوں......؟'' شمائل نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں ہاں......! اسی کی بات کر رہی ہوں۔''

''کہاں دیکھا تم نے......؟''

''باہر برآمدے میں...... پھولوں کا گملا اٹھائے ہوئے تھا۔ خال
آفت کی پرکالہ ہیں۔ ورنہ میں تو وہاں اس سے پوچھ گچھ کر لیتی۔ دل پ
رکھے رکھے تم تک آئی ہوں۔''

''مولوی منور......!'' شمائل ہنس پڑی۔

''کیا مطلب......؟''

''وہ دادا جان کا اسسٹنٹ ہے اور شاید ان کا ولی عہد بھی۔ دونوں
میں عشق چل رہا ہے۔'' شمائل نے بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

''کن دونوں میں......؟'' فروزاں نے چونک کر پوچھا۔

''دادا جان اور اس میں......!''

''قتل کر دوں گی تمہارے دادا جان کو...... انہیں اس سے عشق کر
کا کیا حق پہنچتا ہے میری موجودگی میں......؟'' فروزاں نے مصنوعی جوش
کہا اور شمائل قہقہے لگاتی رہی۔

''ہائے شمائل......! تم ہنس رہی ہو۔ تم نے اسے غور سے نہیں د
شاید۔ خدا کی قسم......! خوابوں کا شہزادہ لگتا ہے۔ ہر لحاظ سے ایک مک
مرد...... گریگوری پیک اس کے سامنے کچھ نہیں۔ مگر ہے کون......؟''

''بس یونہی......!''

''یہیں رہتا ہے......؟''

''ہاں......!''

''کوئی رشتہ دار ہے تمہارا......؟''

''یہی سمجھ لو......!''

''خدا کے لئے ٹالنے کی کوشش مت کرو۔ میں تو مر مٹی ہوں اس
پر...... ارے...... مگر ایک بات تو بتاؤ......!''

''ہوں......!''

''کہیں تم خود تو...... میرا مطلب ہے...... اگر ایسی بات ہے
شمائل......! تو...... تو یقین کرو میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔ تم نے
ہمیشہ میرے اوپر اعتماد کیا ہے۔ کیا میں نے کبھی تمہارے اعتماد کو دھوکہ
دیا......؟''

''کہاں کی ہانک رہی ہو یار......! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن
فروزاں......! اس کے بارے میں میں تمہیں سچ نہیں بتا سکتی۔''

''کیوں......؟''

''بس میں نے دادا جان سے وعدہ کیا ہے۔''

''فروزاں اور شمائل الگ الگ ہیں۔ اگر اقرار کر لو گی تو پھر کچھ
پوچھوں گی۔'' فروزاں نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن دادا جان سے کیا ہوا وعدہ......؟''

''تمہیں میری جان کی قسم ہے شمائل......! مجھے بتا دو اور میں تمہاری
جان کی قسم کھا رہی ہوں کہ تمہارے وعدے کی لاج رکھوں گی۔'' فروزاں
بولی۔

شمائل چند ساعت کشمکش کا شکار رہی اور پھر اس نے پوری تفصیل
فروزاں کو بتا دی۔ فروزاں دنگ رہ گئی تھی۔

''خدا کی پناہ......! تو اس کی آنکھوں میں خون کی سرخی ہے......؟''

"لیکن اتنا معصوم انسان ہے فروزاں......! کہ یقین نہیں آتا۔ ہر چیز سے اجنبی، بھٹکا بھٹکا سا...... جیسے کسی کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔"

"ہائے......! کتنا پُرکشش ہے۔ کتنا رومینٹک...... کیا کروں شمائل......! بتاؤ اس کے لئے کیا کروں......؟"

"تفصیل جان کر بھی اسے پسند کرتی ہو......؟"

"ارے......! یہ تو اور بھی حسین بات ہے۔ غور تو کرو۔ وہ برائیاں چھوڑ کر نیکیوں کی جانب آیا ہے۔"

"اور تم اسے پھر برائیوں کی جانب لے جانا چاہتی ہو......؟" شمائل نے ہنس کر کہا۔

"اتنی بری ہوں میں......؟" فروزاں برا مان گئی اور شمائل اسے منانے لگی۔ لیکن فروزاں روٹھی رہی۔

"ایک شرط پر مانوں گی۔" وہ بولی۔

"بکو بابا......! بکو......!"

"اسے یہاں بلاؤ......!"

"خدا کی قسم......! مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ آج تک میں اس سے مخاطب نہیں ہوئی۔ ہمت ہی نہیں پڑتی۔ جو روپ اس کا دیکھ چکی ہوں وہ بہت خوفناک تھا۔"

"جانے وہ ڈاکے کیسے ڈالتا ہوگا......؟ اسے دیکھ کر تو اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینے کو جی چاہتا ہے۔" فروزاں آنکھیں بند کر کے بولی۔ اور شمائل بھی ایک لمحے کے لئے اس کے تصور میں کھو گئی۔ فروزاں کی آنکھیں بند تھیں اور شمائل چشم تصور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ چونک

پڑی۔ فروزاں ٹھیک ہی تو کہتی ہے، وہ مردانہ حسن کا شاہکار ہے۔ ایک پُراسرار شخصیت کا مالک۔ لیکن اب تک میں نے اس کی طرف توجہ کیوں نہیں کی تھی......؟ شمائل کو اپنے آپ پر حیرت ہوئی۔ فروزاں اس کے بارے میں جانے کیا کیا کہتی رہی۔ شمائل نے ٹھیک سے سنا بھی نہیں تھا۔ وہ تو تصور کی آنکھ سے مسلسل منور کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی ہر جنبش پُرکشش تھی۔ اس کی ہر ادا بے مثال تھی۔

فروزاں شام تک شمائل کے ساتھ رہی اور مختلف بہانوں سے منور کے سامنے آتی رہی۔ لیکن شاید ایک بار بھی منور نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ حسین چہرے اور پُررعب آواز والے نوجوان کی ان اداؤں نے شمائل کو بے خود کر دیا۔ پھر فروزاں کے جانے کے بعد ایک بار...... صرف ایک بار اتفاق سے ارشد اور منور یکجا ہو گئے۔ فرق نمایاں تھا۔ اس کا رنگ کشمیری سیب کی مانند تھا اور ارشد سوکھا سہا...... اس کی آنکھوں میں زندگی تھی اور ارشد کی آنکھوں میں مکاری...... اس کا قد بلند و بالا تھا جبکہ ارشد کا سر اس کے شانوں کو چھوتا تھا۔ اس کا اور ارشد کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ شمائل خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔

ظہیر صاحب کافی جدت پسند آدمی تھے۔ زمانے کی قدروں کے ساتھ ساتھ چلنے کے عادی...... جب کہ ان کے والد عبداللہ درویش صفت تھے اور ایک طرح سے تارک الدنیا۔ بچوں سے انہیں الفت تھی اس لئے ان سے کبھی کبھی اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال لیتے تھے ورنہ عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ ویسے ان کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ ان کی بات آخری بات ہوتی تھی اور اس کے سامنے دم مارنے کی کسی کو مجال نہیں

تھی۔ منور ان کا چہیتا تھا۔ انہوں نے یہاں آ کر صرف اتنا کہا تھا کہ منو
کا بچہ ہے۔ اس سے زیادہ کسی کو کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔
گھر میں وہی حیثیت دی گئی تھی جو دوسرے بچوں کو حاصل تھی۔ لیکن وہ
لوح تھا اور دوسروں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ زیادہ تر وہ عبداللہ صاحب
خدمت میں لگا رہتا تھا۔ گھر میں مولوی منور کہا جانے لگا تھا لیکن اسے کچھ
کچھ کہنا سننا برا نہیں لگتا تھا۔ جیسے وہ ہر احساس سے عاری ہو۔

فروزاں نے اب یہ گھر دیکھ لیا تھا۔ وہ بلاناغہ آ جاتی تھی۔ کبھی کسی
بہانے، کبھی کسی بہانے۔ لیکن آنے کا مقصد منور ہی ہوتا تھا۔ شمائل دل
دل میں اس کی آمد سے کڑھنے لگی تھی۔ اسے یوں لگتا جیسے فروزاں اس کا
چھیننا چاہتی ہو۔ لیکن ابھی تک بات بگڑی اس لئے نہیں تھی کہ منور کی کوئی
اس کی جانب نہیں تھی۔ اس نے تو شاید ایک بار بھی فروزاں کو نہیں دیکھا تھا۔

''شمائل......! تم ہی کچھ کرو۔ میں تو تھک گئی۔'' ایک شام فروزاں
نے کہا۔

''اس سے بات نہیں کی......!''

''ایک لمحے کے لئے جو ہاتھ آیا ہو۔ میں نے کئی بار اسے اشارے
کئے ہیں۔ زبانی بھی بہت کچھ کہا ہے۔ عجیب احمق ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں......؟''

''میرے لئے اس سے بات کرو۔''

''اس نے آج تک مجھ سے بھی بات نہیں کی فروزاں......!
کرو میں اس سلسلہ میں بالکل مجبور ہوں۔'' شمائل نے صاف کہہ دیا۔

''بڑی خود غرض ہو شمائل......! اتنا سا کام نہیں کر سکتیں۔''

''برائے کرم فروزاں......! مجھ سے یہ فضول باتیں مت کیا کرو۔
میں اس سے یہ کہوں کہ تم فروزاں سے عشق کرو۔'' شمائل کا لہجہ خشک ہو گیا۔

''کبھی نہیں بولوں گی تجھ سے اور آئندہ کبھی یہاں نہیں آؤں گی۔''

''آج کل تم میرے لئے آتی بھی کب ہو......؟ سچ بات کہوں گی تو
برا مان جاؤ گی۔'' شمائل نے کہا اور فروزاں ناراض ہو کر چلی گئی۔ شمائل نے
سکون کا سانس لیا تھا۔ لیکن ایک بات حقیقت تھی۔ منور نے واقعی آج تک
اس سے گفتگو نہیں کی تھی۔ کئی بار شمائل نے اسے مخاطب کیا تھا لیکن جو بات
کہی خاموشی سے سنتا رہا۔ گردن ہلائی اور چلا گیا۔ کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا بھی
نہیں تھا۔ کیا اس کی نگاہوں میں میری بھی کوئی حیثیت نہیں ہے......؟ شمائل
نے سوچا۔ پھر اس نے دوسرا رُخ اختیار کیا۔ اس نے منور کے لباس میں،
اس کی ضروریات کی چیزوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ بے شمار تحائف
خریدے اس کے لئے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایک نیاز مندانہ مسکراہٹ
اس کے ہونٹوں پر آ جاتی تھی اور بس۔

تب ایک شام اس نے منور کو روک لیا۔

''سنو منور......!'' اور وہ ٹھٹک گیا۔ لیکن نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''میری طرف دیکھو......!''

''کوئی کام ہے مجھ سے......؟'' کم بخت کی آواز میں ایسی خود
اعتمادی ہے کہ دوسرا انسان خود کو اس سے ہیچ سمجھنے لگتا ہے۔ شمائل نے سوچا۔

''ہاں......!''

''فرمائیے......!''

''تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

"جی......!"

"بیٹھ جاؤ......!" شمائل نے کہا اور وہ بیٹھ گیا۔

"اس ماحول سے تمہارا دل نہیں اُکتایا......؟"

"نہیں......!"

"کافی عرصہ ہوگیا تمہیں اپنی دُنیا چھوڑے...... اب اس دنیا کو بھول کر یہ دنیا اپناؤ۔ میں بلکہ شاید کوئی بھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ دادا جان درویش صفت ہیں لیکن ہمارے دل میں تمہارے لئے بہت سے سوالات ابھرتے ہیں۔"

"میں ماضی بھول چکا ہوں۔" اس نے کہا۔

"حال کو تو مت بھولو۔ یہاں انسان بستے ہیں۔ خود کو انسانوں میں محسوس کرو۔ باہر نکلو۔ دنیا دیکھو۔ بہت کچھ ہے اس دنیا میں۔ یہاں حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے، گل رنگ فضا بھی، مست کر دینے والی فضا میں پھول کھلتے ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ تم لوگوں کی چاہت سے دور نہیں ہو، خود کو اپنوں میں محسوس کرو۔"

"آپ لوگ میرے لئے بڑی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں آپ سب کے لئے جان دے سکتا ہوں۔"

"سب کی نہیں، میری بات کرو منور......! میں تمہیں چاہتی ہوں۔ میں تم سے بے پناہ محبت کرنے لگی ہوں۔ شاید اس وقت سے جب اس رات میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ میں محسوس نہیں کر سکتی تھی منور......! لیکن آج...... آج مجھے سب کچھ یاد آ رہا ہے۔ اب میں صبر نہیں کر سکتی منور......! اور اب جبکہ میں نے اپنی زبان کھول لی ہے تو تمہیں میری لاج رکھنا ہوگی۔

سمجھے منور......! تمہیں میری محبت کا جواب محبت سے دینا ہوگا۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا......؟" اس نے بدستور سپاٹ آواز میں کہا۔

"میں...... میں تم سے شادی کروں گی۔ میں تمہاری آغوش میں آنا چاہتی ہوں منور......! میں......" شمائل کو نہ جانے کیا ہوگیا۔ اس نے منور کے دونوں شانے پکڑ لئے اور اس سے لپٹنے کی کوشش کی۔ تب منور سکون سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے آہستگی سے شمائل کو خود سے الگ کر دیا۔

"شاید اس گھر میں یہ پہلا کام ہے جو میں یہاں کے فرد کے حکم سے نہ کر سکوں گا۔ میں نے یہاں پناہ لی ہے اور عبداللہ صاحب نے مجھے گناہ وثواب کی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ آپ جو چاہتی ہیں وہ گناہ ہے۔ افسوس میں گناہ میں آپ کا شریک نہیں ہو سکتا۔ آپ آئندہ یہ خیال اپنے ذہن میں نہ لائیں۔"

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر تم سے کچھ کہا ہے منور......! اور میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ تمہیں میری لاج رکھنا ہوگی۔" شمائل غرائی۔

"میں آپ کی اس نادانی کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ بولا۔

"میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی منور......! تم جو ہو میں جانتی ہوں۔ تمہارے ہاتھوں میں آج بھی خون کی بو رچی ہوئی ہے۔ اگر اپنا وقار چاہتے ہو تو ایک خون اور کر دو۔ منور......! میری گردن دبا دو۔ ورنہ بہت بہت کچھ کھو بیٹھو گے۔ اتنا کچھ کھو بیٹھو گے کہ کبھی نہ پاؤ گے۔ میں عورت ہوں، مجھ سے بڑا دُشمن تمہیں روئے زمین پر نہ ملا ہوگا۔"

"میں دُشمنوں کو خاطر میں لانے کا عادی نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں تمہارا سب کچھ برباد کر دوں گی منور......! وہ سزا جو تمہیں قانون نہیں دے سکا منور......! میں دوں گی۔ تم مسلسل میری توہین کیے جا رہے ہو۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کرسکتی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا منور......! کہ تم مجھے اس حقارت سے ٹھکرا دو گے تو خدا کی قسم......! میں کبھی تم سے اپنے دل کا راز نہ کہتی۔ ساری عمر خاموش رہتی لیکن اب...... یہ راز زبان پر آچکا ہے تو میں...... میں اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتی ہوں۔ میں آج رات تمہارے پاس آؤں گی اور...... اور تم میری محبت کا جواب محبت سے دو گے ورنہ کل صبح...... کل صبح......" شمائل پر دیوانگی طاری تھی۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

"میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ خود کو قابو میں رکھیں ورنہ نقصان آپ کا ہوگا۔" منور نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ شمائل اپنی انگلیاں چبانے لگی۔ اور ان انگلیوں سے خون رسنے لگا۔ لیکن اسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بلاشبہ وحشت میں وہ منگل سنگھ سے کم نہیں تھی۔

اور رات کے پچھلے پہر...... جب تمام خواب گاہیں تاریک ہوگئی تھیں، وہ منور کی خواب گاہ میں داخل ہوگئی۔ منور جاگ رہا تھا۔

"کیا تم میرا انتظار کر رہے تھے......؟"

"ہاں......!" اس نے جواب دیا۔ انداز میں وہی لاپرواہی تھی۔

"کیا فیصلہ کیا تم نے......؟"

"یہی کہ آپ کو سمجھاؤں۔ میں اس گھر کے کسی فرد کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی مناسب حکم ہوتا تو آپ کے کام آکر مجھے خوشی ہوتی۔ لیکن...... آپ...... یقین کریں شمائل......! کہ ساری زندگی......"

"کچھ نہیں سنوں گی منور......! کچھ نہیں سننا چاہتی...... میرے سامنے آؤ...... مجھے آغوش میں لے...... مجھے...... مجھے......"

"میرا خیال تھا آپ کی دیوانگی کچھ کم ہوئی ہوگی۔" وہ بولا۔

"تم عورت کو نہیں جانتے منور......! لیکن جان جاؤ گے۔" وہ غرائی۔

"کچھ بھی ہو عبداللہ صاحب کا اعتماد مجروح نہ ہوگا۔ میں ہر خسارے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... میں جا رہی ہوں۔ اپنی انا، اپنی نسوانیت سمجھ کچھ داؤ پر لگا کر تمہارے پاس آئی تھی۔ قصور تمہارا ہے۔ میری دیوانگی کی آگ کو اپنی محبت سے سرد کر دیتے لیکن تم آج بھی ڈاکو ہو۔ وحشی اور مغرور۔ لیکن آج میں تمہارا غرور توڑ دوں گی۔ تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے منور......! تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے۔" وہ طوفان کی مانند کمرے سے نکل آئی۔ اس کا وجود شعلوں کی زد میں تھا۔ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ ارشد کے دروازے پر رکی اور اس نے ہولے ہولے کئی بار دستک دی اور ارشد نے دروازہ کھول دیا۔

"شمائل......!" اس کے منہ سے تحیر زدہ آواز نکلی اور شمائل نے جلدی سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ ارشد عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں شمائل کے چہرے کی تمتماہٹ نے اسے پریشان کر دیا۔

"ارشد......!" شمائل کی آواز تیز سانسوں کے درمیان ابھری۔

"ہاں جان......!"

"میں خود کو تمہارے سپرد کرنے آئی ہوں۔ بولو مجھے قبول
گے......؟ آج میں تمہاری ہر خواہش کی تکمیل کر دوں گی۔"

"شمائل......!" ارشد کی آواز سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

"ہاں ارشد......! لیکن تمہیں ایک ڈرامہ کرنا ہوگا میرے ساتھ
کر...... بولو کرو گے......؟"

"جان نچھاور کر دوں گا جانِ من......! تم صرف ڈرامے کی بات
رہی ہو۔ بات کیا ہے......؟"

"میں آج اس مغرور ڈاکو کے چیتھڑے اڑانا چاہتی ہوں۔ میں
صرف اسے اس گھر میں رُسوا کرنا چاہتی ہوں بلکہ...... بلکہ اسے گرفتار کرا
کی خواہش بھی ہوں۔ سمجھے...... اور اس کے لئے میں اس پر آبروریزی
الزام لگاؤں گی۔ یہ ثبوت اس کے خلاف ہوگا اور تم......" اس کی آ
سرگوشیوں میں ڈوب گئی اور ارشد کے ہونٹوں پر شیطانیت ابھر آئی۔

"تم جس طرح چاہو گی، سب کچھ اسی طرح ہوگا۔" اس نے
مسکراتے ہوئے کہا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

دوسری صبح تمام لوگ ناشتے کی میز پر پہنچ گئے لیکن شمائل نہیں آ
تھی۔ تب ظہیر صاحب نے ملازمہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔

"دیکھو کیا کر رہی ہے، بلا کر لاؤ۔" ظہیر صاحب نے کہا اور ملازمہ
چلی گئی لیکن چند ساعت کے بعد جب وہ واپس آئی تو اس کا سانس پھولا
تھا۔ آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

"بی بی...... صاحب...... چھوٹی بی بی...... چھوٹی بی بی......" اس
دہشت بھری آواز ابھری اور سب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا بات ہے......؟" ظہیر صاحب بدحواسی سے بولے اور پھر
ملازمہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر شمائل کے کمرے کی طرف دوڑے۔
دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئے اور اندر داخل ہو کر انہوں نے جو
دیکھا اس پر انہیں چکر آ گیا۔ شمائل کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ منہ
میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے بدن پر لباس کا ایک تار بھی نہیں تھا۔ جگہ جگہ
خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ یا تو وہ مر چکی تھی یا بے ہوش تھی۔ ظہیر صاحب نے
دوسرے لمحے خود کو سنبھالا اور دروازے سے آ جمے۔ تمام لوگ پہنچ رہے تھے۔

"رُک جاؤ......! تم لوگ وہیں رُک جاؤ۔" انہوں نے ڈوبتی آواز
میں کہا اور اپنی بیگم کو اندر بلا کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ بیگم کی حالت بھی
خراب ہوگئی تھی۔ بڑی مشکل سے ظہیر احمد صاحب نے انہیں سنبھالا اور
دونوں نے مل کر شمائل کو لباس پہنایا۔ منہ سے کپڑا نکالا، اور ہاتھ کھولے۔
اس کی سانسیں اعتدال پر تھیں۔

"ڈاکٹر کو...... ڈاکٹر کو بلاؤ......!" بیگم نے لرزتی آواز میں کہا۔

"نہیں بیگم......! نہیں...... وہ زندہ ہے۔ لیکن اس گھر میں...... اس
کے ساتھ یہ سب کچھ کس نے کیا اور باہر جو لوگ کھڑے ہیں، انہیں کیا
بتاؤں...... آہ...... کچھ چھپانا ممکن نہیں ہے۔ بلا لو...... سب کو بلا لو۔"

اور چند ساعت کے بعد تمام لوگ شمائل کے گرد جمع تھے۔ اسے ہوش
میں لانے کی ترکیبیں کی جا رہی تھیں۔ ظہیر صاحب نے کمرے کی سچویشن اور
شمائل کی حالت کے بارے میں دوسروں کو بتا دیا تھا۔ اور سب خاموش رہ
گئے تھے۔ ہاں ابھی تک دادا جان کو اطلاع نہیں ملی تھی۔ وہ گھر کے بالکل
دوسرے حصے میں رہا کرتے تھے اور منور بھی ان سے چند گز دُور ایک کمرے

میں تھا۔ وہ دونوں عام طور سے گھر والوں کے مشاغل میں شریک نہیں رہتے تھے۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد شمائل کو ہوش آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور پھر اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔

''ڈاکو...... ڈاکو...... آہ ڈاکو......!'' اور پھر وہ مسلسل ''ڈاکو ڈاکو'' چیختی رہی۔ سب اسے تسلیاں دینے لگے تھے۔

''ڈاکو......!'' ظہیر صاحب نے تعجب سے کہا۔

''کیا گھر میں ڈاکہ بھی پڑا ہے......؟''

''ماموں جان......!'' ارشد کی گھمبیر آواز ابھری۔

''برائے کرم اس طرف آیئے میرے ساتھ...... برائے کرم......!'' اور ظہیر صاحب دوسروں کے قریب سے ہٹ گئے۔

''ماموں جان......! ہم لوگ اپنی شرافت اور نیکیوں کے شکار ہوگئے ہیں۔ میں ان چیخوں اور تکرار کا مطلب سمجھ گیا ہوں۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''دادا جان ہمارے لئے جس قدر قابل احترام ہیں اس کے تحت ہماری مجرمانہ خاموشی قابل عفو ہے۔ ان سے ہم نے وعدہ کیا تھا کہ منور کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے لیکن آج...... جو کچھ ہوا ہے وہ غیر متوقع تھا۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔''

''منور......؟'' ظہیر صاحب چونک پڑے۔

''ہاں......! وہ ایک خطرناک ڈاکو ہے۔ ڈاکو منگل سنگھ کا

نائب......!'' اور ارشد نے انہیں شروع سے آج تک کی تفصیل بتا دی۔ ظہیر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ہیجانی کیفیت کا شکار ہوگئے تھے۔ پھر انہوں نے تمام لوگوں کو شمائل کے کمرے سے نکال دیا۔ اور شمائل کو دلاسہ دینے لگے۔

''تمہارے ساتھ یہ زیادتی کس نے کی شمائل......! بتاؤ کس نے کی......؟''

''منور...... ڈاکو منور......!'' شمائل نے کہا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر سسکیاں لینے لگی۔ ظہیر صاحب سلگتا وجود لے کر کھڑے ہوگئے اور پھر وہ خاموشی سے باہر نکل آئے۔ ان کا رُخ دادا جان کی رہائش گاہ کی جانب تھا۔ ارشد ان کے پیچھے ہولیا۔ دادا جان منور کے ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ظہیر صاحب آندھی اور طوفان کی طرح اندر داخل ہوئے اور منور پر پل پڑے۔ انہوں نے اسے گھسیٹ کر نیچے گرایا اور پھر اس کے سینے پر چڑھ کر اسے پوری قوت سے مارنے لگے۔

''ارے...... ارے...... ارے......!'' دادا جان کے منہ سے صرف یہ آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر وہ اٹھے اور اپنے کمزور ہاتھوں سے ظہیر صاحب کو منور پر سے اٹھانے لگے۔ منور بے چارہ خاموشی سے مار کھا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے۔ نکسیر پھوٹ گئی تھی اور خون بہنے لگا تھا۔

''ظہیر......! ہٹ جا ظہیر......! ورنہ...... ورنہ......'' دادا جان چیخے اور اسی وقت منور نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکائے اور ظہیر صاحب کو لئے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے بدن میں جھرجھری سی آئی تھی۔ اس نے ظہیر صاحب کے ہاتھ پکڑ لئے اور ظہیر صاحب کو اپنی کلائیاں

ٹوٹتی محسوس ہوئیں۔ منور ایک دیو کی مانند ان کے سامنے کھڑا تھا۔

''عبداللہ صاحب کی بات سنو......!'' اس کی آواز میں گرج تھی۔

''کیا بات ہے ظہیر......! کیا جنون چڑھا ہے تجھے......؟ پاگل ہو گیا ہے کیا......؟''

''ابا میاں...... ابا میاں......! آپ کی نیک نفسی نے ہمیں تاریک کر دیا۔ اس نے...... اس نے شمائل کی آبروریزی کی ہے...... اس نے...... اس نے حق نمک ادا کیا ہے۔''

''بکواس...... غلط...... بالکل غلط......!'' دادا میاں چیخے۔ منور نے ظہیر صاحب کی کلائیاں چھوڑ دی تھیں۔ پھر وہ پیچھے ہٹ کر اپنے چہرے کا خون صاف کرنے لگا۔

''پوچھئے اس سے...... پوچھئے اس سے ابا میاں......! آپ کا احترام ہمیں لے ڈوبا۔''

''منور......! منور......! بول یہ کیا کہہ رہا ہے......؟ جواب دے منور......!'' دادا جان پلٹے اور منور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''خدا سے پوچھئے عبداللہ صاحب......! میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ خدا بے وجود نہیں ہے۔ میں نہیں بولوں گا۔ خدا سے پوچھئے......! بس خدا ہی جواب دے گا۔'' منور کی آواز میں پھر غراہٹ بلند ہو گئی۔

''یہاں سے نکل جا ظہیر......! اگر ایسا کوئی واقعہ ہوا ہے تو شمائل سے پوچھ...... اصلی مجرم کو تلاش کر...... منور بے گناہ ہے۔ باہر نکل جا......!''

''میں اگر باہر نکل گیا ابا میاں......! تو اس گھر کی عزت کا جنازہ بھی

نکل جائے گا۔ مجھے آپ......''

''کچھ بھی ہو جائے۔ منور بے گناہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔ خدا جانتا ہے۔'' دادا جان غضب ناک آواز میں بولے۔

''اچھی بات ہے۔ فیصلہ ہو کر رہے گا۔'' ظہیر صاحب پر بھی جنون سوار ہو گیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے کا دروازہ وہ باہر سے بند کر گئے تھے۔ پھر پولیس آئی اور منور کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ہسپتال سے شمائل کی بھی رپورٹ حاصل کی گئی۔ شمائل نے بیان دیا کہ منور دھوکے سے اس کے کمرے میں گھس آیا تھا اور وہ اس قوی ہیکل ڈاکو سے نہ نمٹ سکی۔ ارشد نے بیان دیا کہ منور منگل سنگھ کا نائب تھا۔ اس نے پوری تفصیل بتا دی اور پورا گھر مصائب کا شکار ہو گیا۔



جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں اسے پورا ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اس کے پورے بدن پر لاتعداد زخم تھے۔ عجیب ہنگامے جاری تھے۔ اسے دو بار عدالت میں پیش کیا جا چکا تھا۔ آبروریزی کا مقدمہ تو قائم ہی تھا لیکن زخم اس لئے لگائے گئے تھے کہ وہ منگل سنگھ کے ٹھکانے بتا دے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے پولیس افسر آئے اور اس سے منگل سنگھ کا پتہ پوچھنے کے لئے اس پر ظلم و ستم کرتے رہے لیکن اسے منگل سنگھ کے زخمی شانے سے بہتا ہوا خون یاد تھا۔ اس کے الفاظ یاد تھے۔

''ایک ایک قطرے کی قیمت وصول کریں گے تجھ سے سسرے......! ایک ایک قطرے کی۔'' اور وہ اس خون کی قیمت ادا کر رہا تھا۔ ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا منگل سنگھ کے بارے میں اس کے منہ سے۔ شہر کے تمام

اخبارات کا موضوع وہی تھا۔ ظہیر صاحب کا گھرانہ بدنام ہو کر رہ گیا تھا۔ پولیس نے ان لوگوں کو بھی خوب ہی پریشان کیا تھا۔ بہرحال ابھی تک پولیس اس سے منگل سنگھ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکی تھی۔

تب ایک شام کچھ نئے قیدی جیل میں لائے گئے اور انہیں بند کر دیا گیا۔ رات کے آخری پہر اچانک جیل میں خوف ناک دھماکے ہونے لگے۔ ہینڈ گرینڈ اور اسٹین گنوں کا استعمال ہو رہا تھا۔ منور بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ فرش پر سو رہا تھا۔ دفعتہً اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور کچھ لوگ اندر گھس گئے۔

''آؤ منور......!'' ایک آواز ابھری اور یہ آواز منور کے لئے اجنبی تھی۔

''سوچنے کا وقت نہیں ہے آؤ......!'' کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ کئی جگہ ان لوگوں نے گولیاں چلائی تھیں اور پھر وہ ایک دیوار کے نزدیک پہنچ گئے جسے بموں سے توڑا گیا تھا۔ باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ منور کو اس گاڑی میں بٹھایا گیا اور گاڑی اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ منور کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے اور اسے لے جانے والوں کون ہیں......؟

جس عمارت میں اسے لے جایا گیا تھا وہ بہت خوبصورت تھی۔ چمکدار شفاف فرش، طول طویل عمارت، اس عمارت کے ایک کمرے میں لے جا کر اسے چھوڑ دیا گیا۔ پھر ایک ڈاکٹر آیا اور اس نے منور کے زخموں کو دیکھ کر مرہم پٹی کی اور اسے وہ انجکشن بھی لگائے۔

''اب تم آرام سے سو جاؤ۔ تمہیں نیند آ جائے گی۔'' اور منور کو نیند آ گئی۔

خوب گہری نیند سویا وہ اور دوسری صبح جب جاگا تو اسے ایک شکل نظر آئی۔ سفید لباس میں ملبوس سفید صورت، سادہ سے نقوش اور بڑی بڑی ہموار آنکھوں والی جو اسے جاگتے دیکھ کر مسکرا پڑی تھی۔

''کیسے ہو تم......؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک......لیکن تم......؟''

''نرس ہوں......تمہاری خدمت پر مامور کی گئی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''نرس......!'' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''اوہ نہیں......! ڈاکٹر نے ہدایت کی ہے کہ تمہیں اٹھنے نہ دیا جائے۔ ٹھہرو میں تمہارے ہاتھ منہ دھونے کا بندوبست کرتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر ایک طرف چلی گئی۔ منور سادہ سی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نرس برتن لئے واپس آ گئی اور پھر اس نے کپڑا گیلا کر کے منور کا چہرہ صاف کیا۔ اسے کلی کرائی اور اس کے بعد پھلوں کا رس لے آئی۔

''اسے پی لو......! یہ تمہارا ناشتہ ہے۔'' نہ جانے کیوں منور کو یہ پیار بھرا تحکمانہ انداز بے حد بھلا لگا۔ اس کی کسی اجنبی حس کو سکون مل رہا تھا۔ وہ بچوں کی طرح اس کی ہدایات پر عمل کرتا رہا اور نرس مسکراتی رہی۔ دوپہر کو اس نے کھانا بھی منور کو اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ جو سادہ سی چیزوں پر مشتمل تھا۔

پھر ڈاکٹر نے آ کر اسے دیکھا اور ایک اور انجکشن دے کر چلا گیا۔ نرس بھی اس کے پاس موجود تھی۔ اس دوران اس نے کوئی غیر ضروری گفتگو نہیں کی تھی۔ وہ انوکھی لذت محسوس کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی

اس پر۔ دن گزرا، رات آگئی۔ پھر دوسرا دن اور دوسری رات۔ اس دوران نرس اور ڈاکٹر کے علاوہ کوئی اور اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ نرس اس کی پوری دیکھ بھال کر رہی تھی۔

تیسرے دن اس کی حالت بہت بہتر ہوگئی۔ جیل کی اذیتوں کے زخم خشک ہونے لگے تو پہلی بار اس نے نرس سے پوچھا۔

''مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا......؟''

''ابھی تو شاید کافی دنوں تک۔ اوّل تو تمہارے زخم خشک ہونا ضروری ہیں پھر پولیس چپے چپے پر تمہیں تلاش کر رہی ہے۔''

''میرے ہمدرد کون ہیں......؟ یہ بات مجھے ابھی تک نہیں معلوم ہو سکی۔''

''تم نے پوچھی ہی نہیں تھی۔''

''بتانا پسند کروگی......؟''

''کیوں نہیں......! کشنو جی اکثر تمہاری خیریت پوچھتے رہتے ہیں۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ تم سے ملاقات کے لئے نہیں آئے۔''

''کشنو جی کون ہیں......؟''

''اس گروہ کے سربراہ......!'' لڑکی نے جواب دیا۔

''گروہ......؟'' وہ تعجب سے بولا۔

''ارے ہاں......! تمہیں تو گروہ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ جس طرح منگل سنگھ کا گروہ ہے اسی طرح کشنو جی کا بھی گروہ ہے۔ دونوں کا ایک ہی کام ہے۔''

''اوہ......! تو کیا وہ بھی ڈاکے ڈالتے ہیں......؟''

''گھوڑوں پر بیٹھ کر بستیاں نہیں لوٹتے۔ شہر میں بینک لوٹے جاتے ہیں۔ اسمگلنگ اور بلیک مارکیٹنگ ہوتی ہے۔ بلیک میلنگ بھی کی جاتی ہے اور نشہ آور ادویات بھی فروخت کی جاتی ہیں۔ کشنو جی کا گروہ یہ کام کرتا ہے۔''

''اور مجھے جیل سے نکال کر کیوں لایا گیا ہے......؟'' منور نے گھبرا کر پوچھا۔

''منگل سنگھ کی درخواست پر۔ منگل سنگھ تمہاری تلاش میں یہاں آئے تھے اور سردار، سرداروں کے دوست ہوتے ہیں۔ کشنو جی نے ان کی خواہش پر جیل توڑی تھی لیکن چونکہ شہر میں پولیس چوکس ہے، اس لئے ابھی تمہیں یہاں سے نکالا نہیں جا سکتا۔''

''منگل سنگھ کہاں ہیں......؟''

''واپس چلے گئے ہیں لیکن حالات ٹھیک ہوتے ہی تمہیں لینے آئیں گے۔''

''میں...... میں اب منگل سنگھ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں اب اس کے قابل نہیں ہوں۔ خدا کی قسم......! میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے اب ان ساری باتوں سے نفرت ہے۔ میں اب منگل سنگھ کے لئے بے کار ہوں۔ میں اب ڈاکے نہیں ڈالوں گا۔''

''کیوں......؟'' نرس نے تعجب سے پوچھا۔

''تم نہیں سمجھو گی۔ آہ...... تم نہیں سمجھ سکتیں۔ میں تو ایک دیہاتی لڑکا ہوں۔ میں صوفی عظمت علی کا بیٹا ہوں۔ میں تو مجبوریوں کا شکار ہوگیا تھا ورنہ...... مجھے لوٹ مار، وحشت و بربریت سے نفرت ہے۔ آہ...... اب میں

کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ منگل سنگھ کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ وہ اب میرے لئے بیکار کوشش کر رہا ہے۔ میں...... میں اب...... جو کچھ کر رہا ہوں اس کا کفارہ ساری زندگی ادا نہیں کر سکتا۔ آہ......نرس......! میری مدد کرو۔ خدا کے لئے میری مدد کرو۔ مجھے اب ان وحشیوں کے درمیان نہ جانے دو۔'' اس نے التجا کی۔

''لیکن......تم نے تو منگل سنگھ کو بچانے کے لئے اتنے زخم کھائے ہیں۔''

''وہ ایک قرض تھا ان احسانات کا قرض جو منگل سنگھ نے مجھ پر کئے تھے۔ اگر وہ میری گردن کاٹ ڈالتے تب بھی میں انہیں منگل سنگھ کے بارے میں نہ بتاتا۔ لیکن ذاتی طور پر اب میں منگل سنگھ کے کام کا بھی نہیں ہوں۔''

نرس کے ذہن میں گرج ہو رہی تھی۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔ ایک گولا سا اس کے حلق میں آ رہا تھا۔ بمشکل اس نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

''تو اب تم کیا چاہتے ہو......؟''

''مجھے خاموشی سے یہاں سے نکل جانے دو۔ زمین کے کسی گوشے میں جا کر موت کا انتظار کروں گا۔ لیکن اب کسی قیمت پر میں وحشت کی زندگی میں واپس نہیں جاؤں گا۔''

''میں تمہاری مدد کروں گی منور......! لیکن پولیس......؟''

''میں خود کو تقدیر کے سہارے چھوڑ دوں گا۔ تقدیر میرے لئے جو فیصلہ کرے۔''

''تب پھر وقت کا انتظار کرو۔'' نرس کی آواز ابھری۔

''وعدہ نرس......!''

''ہاں وعدہ......!'' نرس کی آواز میں ایک انوکھا عزم تھا۔



رات کے تین بجے تھے جب وہ اسٹیشن پہنچے۔ نرس منور کو عمارت کی عقبی کھڑکی سے اتار کر باہر لائی تھی۔ اس کے پاس ایک لباس بھی تھا جو اس نے منور کو پہننے کے لئے دیا اور ایک تاریک گوشے میں منور نے وہ لباس پہن لیا۔ نرس نے اپنے ہاتھوں سے دیہاتی قسم کی پگڑی پہنائی اور پھر وہ وہاں سے چل پڑے۔ روشنی میں منور نے نرس کو بغور دیکھا۔ اب تک اس نے اس کے لباس پر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ خود بھی ایک دیہاتی لباس میں ملبوس تھی۔ بڑی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ پونے چار بجے ٹرین آئی اور نرس اس کے ساتھ ہی کمپارٹمنٹ میں سوار ہوگئی۔ دونوں ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئے۔ عام طور سے لوگ سو رہے تھے، جو جاگ رہے تھے، وہ بھی اونگھ ضرور رہے تھے۔ ریل چل پڑی تو منور نے تعجب سے نرس کو دیکھا۔

''تم کہاں جا رہی ہو......؟'' اس نے پہلی بار سوال کیا۔

''فی الوقت تمہارے ساتھ...... لیکن بے فکر رہو، میں تمہارے اوپر بار نہیں بنوں گی۔''

''تم نے اپنے گروہ کے ساتھ غداری کی ہے ناں......! میں جانتا ہوں میری وجہ سے وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے۔''

''ہاں......! لیکن تمہیں بچانا ضروری تھا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

''میری وجہ سے تم نے یہ مصیبت مول لی ہے۔ مجھے افسوس ہے۔''

''نہیں منور......! تمہاری وجہ سے تو میرے دل میں ایمان جاگا ہے۔ تمہیں دیکھ کر تو میرے ذہن میں برائیوں سے بچنے کا خیال آیا ہے۔

ورنہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ تم نے آج تک میرا نام نہیں پوچھا۔ میں خود بتاتی ہوں۔ میرا نام نکہت ہے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی بستی میں رہتی تھی۔ باپ کے انتقال کے بعد زندگی بار بن گئی اور چھوٹے بہن بھائی اور ماں کی کفالت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بڑی کوشش کی ہم نے کہ بستی ہی میں کوئی سہارا پیدا ہو جائے لیکن کوئی سبیل نہ ہو سکی۔ پھر کچھ جاننے والوں کی مدد سے یہاں آ گئی۔

خیال تھا کہ گھروں میں نوکری کروں گی اور ماں اور بہن بھائی کی کفالت کروں گی۔ نوکریاں بہت ملیں لیکن عزت داؤ پر لگ جاتی تھی۔ کہاں کہاں سے نوکری چھوڑتی۔ پھر کچھ برے لوگوں کے ہاتھ لگ گئی۔ یہاں عزت خطرے میں نہیں تھی لیکن دوسری برائیاں تھیں۔ غنیمت جانیں اور آہستہ آہستہ گروہ میں مقبول ہو گئی۔ کشنو جی کو میرے اوپر بھروسہ ہو گیا اور اہم کام میرے سپرد کیے جاتے تھے۔ اب میں آرام سے رہتی ہوں۔ چھوٹے بہن بھائی سکون سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ معقول رقم بھیجتی ہوں انہیں ہر ماہ۔ لیکن تمہارے عزم نے دل دکھا دیا۔ میں بھی تو بروں کے ساتھ ہوں۔ وہ ہر گناہ کرتے ہیں۔

چنانچہ تمہارے ساتھ میں نے بھی انہیں چھوڑ دیا۔ اب اپنی ماں کے ساتھ رہوں گی۔ برا وقت ٹل گیا ہے۔ بستی ہی میں کچھ کروں گی۔ اب اتنی مشکلات نہ ہوں گی۔ بلکہ میں تمہیں بھی پیش کش کرتی ہوں منور......! کہاں بھٹکتے پھرو گے۔ میرے ساتھ چلو۔ میں وعدہ کرتی ہوں تمہارے لئے دردِ سر نہ بنوں گی۔''

منور نے گردن جھکا دی۔ نکہت بھی اس کی طرح زمانے کی شکار

تھی۔ وہ بھی قابلِ رحم لڑکی تھی۔ ایک اور سہارا مل رہا تھا۔ لیکن کیا یہ مناسب رہے گا......؟ کیوں نہ اس سہارے کو قبول کر لیا جائے۔ میں ان لوگوں کی مدد کروں گا۔ میں انہیں زمانے کا شکار ہونے سے بچاؤں گا۔ ممکن ہے خدا کسی نیکی کے عوض میری بربریت کے گناہ معاف کر دے۔

چھوٹی سی بستی کا چھوٹا سا مکان آسودگی کا مظہر تھا۔ نکہت کی بوڑھی ماں نہال ہو گئی تھی۔ اس کے بہن بھائی خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ انہوں نے اسے کسی اپنے ہی کی مانند قبول کر لیا تھا۔ بڑی اپنائیت تھی ان سب کے انداز میں۔ منور کو یہاں بے حد سکون ملا۔ نکہت یکسر بدل گئی تھی۔ اب اس کے اندر ایک مشرقی لڑکی کی حیا نظر آتی تھی۔ منور سے گفتگو کرتے وقت وہ نیچی نگاہ رکھتی تھی۔ کئی بار منور نے ان نیچی نگاہوں کو محسوس کیا تھا اور اسے نکہت کی یہ مشرقیت پسند آئی تھی۔ نکہت کے کسی بھی انداز سے کوئی ہلکا پن نمایاں نہیں تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد نکہت کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کچھ کرنا چاہئے۔ ورنہ جو کچھ ہے ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد...... منور نے ایک دو بار یہ گفتگو سنی اور سوچ میں ڈوب گیا۔

بستی سے کچھ میل دُور تیل صاف کرنے کا ایک کارخانہ تھا۔ بستی کے بہت سے نوجوانوں کو وہاں روزگار مل چکا تھا۔ چنانچہ منور وہاں کوشش کرنے لگا اور چند روز کے بعد اسے کارخانے میں نوکری مل گئی۔ جس دن اسے نوکری ملی وہ خوشی سے کھل گیا اور پھر اسی شام اس نے نکہت کی ماں سے جسے اب وہ خود بھی امی کہتا تھا، کہا۔

''مجھے نوکری مل گئی ہے امی......! اب آپ لوگوں کو گھر کے بارے میں فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

"کہاں نوکری مل گئی ہے......؟"

"تیل صاف کرنے کے کارخانے میں۔ یہاں سے بہت سے لوگ جاتے ہیں۔ میں صبح کو جاؤں گا اور شام کو واپس آجایا کروں گا۔"

"خدا تمہیں اس محبت اور اپنائیت کا اجر دے گا بیٹے......! لیکن اچھا نہیں لگے گا کہ تم محنت کرو اور ہم کھائیں۔ کیا اس کارخانے میں نکہت کے لئے کوئی جگہ نہیں نکل سکتی......؟"

"میں موجود ہوں امی......! تو نکہت کو نوکری کیا کیا ضرورت ہے......؟ جب فیروز بڑا ہو جائے گا تو ہم دونوں کمایا کریں گے۔" اس نے کہا اور اس کے ان الفاظ پر امی سسک سسک کر رو پڑیں۔ اس اپنائیت پر ان کا دل بھر آیا تھا۔

چنانچہ منور نوکری پر جانے لگا۔ اسے اس بستی میں تین ماہ ہو چکے تھے اور اب اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے زندگی کی آخری منزل مل گئی ہو۔ پھر ایک دن امی نے دبی زبان سے کہا۔

"جو کچھ میں کہنے جا رہی ہوں بیٹے......! وہ ایسا ہے کہ مجھے تمہاری نگاہوں میں رسوا کر سکتا ہے۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ ان الفاظ میں ایک ماں کی مجبوریاں چھپی ہوئی ہیں۔ نکہت جوان ہے اور میری آرزو ہے کہ وہ بھی...... وہ بھی زندگی کی اس منزل میں قدم رکھے جو ہر لڑکی کا حق ہوتی ہے۔ میری نگاہوں میں تم سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ کیا تم نکہت کو اپنی ذات کے لئے منتخب کر سکتے ہو......؟ کیا تم اس سے شادی کر سکتے ہو منور......؟"

منور دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا۔ اب سوچا اور محسوس کیا کہ اس کے راستے میں اگر نکہت شریک سفر ہو تو کیا حرج

ہے......؟ اس چھوٹے سے خاندان کے سوا اس دُنیا میں اور کیا رہ گیا ہے......؟ چنانچہ دوسرے دن اس نے امی کے سامنے اقرار کر لیا۔

"میرا آپ کے سوا اور کون ہے امی......! میں ہمیشہ آپ کے قدموں میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کی تجویز منظور ہے۔"

اس رات امی تمام رات شکرانے کے نفل پڑھتی رہی تھیں۔ نکہت کئی بار اس کے سامنے آئی اور منور نے اس کے چہرے پر خوشی محسوس کی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے چپکی ہوئی تھی لیکن منور اس سے گفتگو کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ خود اس کے دل کے ویرانے اب نکہت سے آباد ہو گئے تھے۔

امی ہلکے پھلکے انداز میں نکہت کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ سب ہی لوگ خوش تھے۔

ایک شام جب منور گھر میں داخل ہوا تو کوئی اس کے لئے چشم براہ نہیں تھا۔ ہاں برآمدے میں ننھے فیروز کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس سے کچھ آگے معصوم فرحت سربریدہ موجود تھی اور اندر کمرے میں امی اور نکہت کی لاشیں موجود تھیں۔ منور ان کے درمیان خاموش کھڑا ہوا تھا کہ کمرے کے تاریک گوشوں سے پانچ آدمی باہر نکل آئے۔ سب سے آگے ایک لمبے بالوں والا جوان آدمی تھا جس کی خونخوار آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"میرا نام کشنو ہے جوان......! یہ رنگ رلیاں ہو رہی تھیں بستی میں اور کشنو سے غداری کرنے والے کبھی نہیں جیتے۔ یہ اپنے ساتھ اپنے خاندان کی تباہی بھی لے آئی۔ مجھ سے بھاگ کر کہاں چھپ سکتی تھی......؟" کشنو نے حقارت سے نکہت کی لاش کی طرف دیکھا اور منور کی آنکھوں میں آگ

جلنے لگی۔ اس کے اندر وحشت جاگ رہی تھی۔ اس کی سوئی ہوئی آگ کو کرید دیا گیا تھا۔

"مگر تو نے منگل سنگھ سے غداری کیوں کی.....؟ وہ تو تجھے بہت چاہتا ہے۔ پاگل ہو رہا ہے تیرے لئے۔ پرانی دوستی چھوڑ دی اس نے اور تیرے لئے مجھ سے دشمنی پر آمادہ ہوگیا۔ ایک مہینے کی آخری مہلت دی ہے اس نے مجھے کہ میں تجھے ڈھونڈ نکالوں ورنہ..... خیر..... تو مل ہی گیا۔ میرے ساتھ چل منور.....! عورتوں کی تیرے لئے کیا کمی۔ لائن لگا دوں گا۔ چل میرے یار.....! ایک لونڈیا کے لئے سب کو چھوڑ دیا تھا۔"

"کشنو.....!" منور کے منہ سے دہاڑ نکلی اور دوسرے لمحے اس نے کشنو کو اٹھا کر دیوار سے دے مارا۔ کشنو کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو منور اس کی طرف لپکا لیکن اسی وقت کشنو کے چاروں ساتھی اس پر ٹوٹ پڑے۔ منور دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے ان میں سے ایک کی گردن پکڑ لی اور اسے اس وقت تک دباتا رہا جب تک اس کی آنکھیں اور زبان باہر نہ نکل آئیں۔ دوسرے تین آدمی اسے بری طرح مار رہے تھے لیکن وہ اپنے آدمی کو نہ بچا سکے اور جب وہ مر گیا تو منور دوسروں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کا وحشی وجود اب کسی انسان کے بس کا نہیں تھا۔ کشنو اپنا سر پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف کھسک رہا تھا اور اس کے تینوں ساتھی زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ پھر ان میں ایک اور کام آگیا۔ منور نے پہلے اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں اور پھر اس کے چاروں ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا۔ باقی دو بھاگ جانے کی فکر میں تھے لیکن منور نے انہیں نکلنے نہ دیا۔ اس نے دونوں کی گردنیں دبوچ لیں اور انہیں

اس وقت تک دیوار سے مارتا رہا جب تک ان کے بھیجے نہ نکل پڑے۔ تب وہ کشنو کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کشنو نکل چکا تھا۔

"خدا کی قسم کشنو.....! میں تجھے زمین کی گہرائیوں میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔" منور دروازے کی طرف لپکا لیکن کشنو کا اب وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔

"نہیں چھوڑوں گا کشنو.....! کبھی نہیں چھوڑوں گا۔" منور کے حلق سے دہاڑیں نکل رہی تھیں۔ وہ دوبارہ اندر آگیا اور پھر اس نے نکہت کی لاش کے نزدیک بیٹھ کر اس کا سر اٹھایا اور گود میں رکھ لیا۔ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔



کشنو کا گروہ معمولی نہیں تھا لیکن وہ اندھیرے کے اس تیر کو کس طرح روکتے جو رات کی تاریکیوں اور دن کے اُجالوں میں نمودار ہوتا تھا اور قتل و غارت گری کر کے اس طرح نکل جاتا تھا جیسے صابن سے تار۔ گروہ میں ابتری پھیل گئی تھی۔ اب تک تیس آدمی ہلاک ہو چکے تھے اور کشنو کے لوگ گروہ چھوڑ کر محفوظ مقامات پر بھاگ گئے۔ خود کشنو کے حواس گم تھے۔ اس پر دوطرفہ مصیبت نازل ہوئی تھی۔ ایک طرف منگل سنگھ تھا اور دوسری طرف اس کی جان کا دُشمن منور۔ منگل سنگھ سے اس کی جھڑپ بھی ہوگئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ منگل سنگھ کسی طرح منور کو روکے۔ ورنہ وہ پولیس سے مدد لے گا۔ بہرحال وہ چھپتا پھر رہا تھا۔ اس کے سارے کاروبار بند ہوگئے تھے اور ایک عجیب ہراس پھیلا ہوا تھا۔

زندگی کشنو پر عذاب ہو کر رہ گئی تھی۔ بالآخر مجبور ہو کر وہ پولیس کی

پناہ میں پہنچ گیا۔ اس نے مناسب رووبدل کر کے سارے الزامات منگل سنگھ پر ڈال کر پوری کہانی پولیس افسران کے گوش گزار کر دی۔ اعلیٰ افسران سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ اس سے کہا گیا کہ اس کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ بشرطیکہ وہ منگل سنگھ کو گرفتار کرا دے اور کشنو نے پولیس کو منگل سنگھ کے ٹھکانے کی اطلاع دے دی۔ چنانچہ اعلیٰ پیمانے پر پولیس کی کئی جماعتیں تیار ہو کر منگل سنگھ کو گرفتار کرنے چل پڑیں۔ اخبارات میں منور کی پوری کہانی چھپ رہی تھی اور جو اس کہانی کے کسی منظر سے وابستہ تھے، اسے پڑھ کر انگشت بدنداں تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو موت کے خونی ہاتھ اپنی گردن کے قریب محسوس کر رہے تھے اور اس خوف کا شکار ہو گئے تھے کہ اب جب منور اپنی پرانی زندگی میں واپس لوٹ گیا ہے تو کشنو کے بعد ان کی باری بھی آئے گی۔

منور کی گرفتاری کے لئے پولیس دن رات سرگرداں تھی لیکن ابھی تک نام ونشان نہ پا سکی تھی۔ ہاں اس دوران منور نے کشنو کے گروہ کے چند اور افراد کو قتل کر دیا تھا۔ وہ انہیں کھود کھود کر نکال رہا تھا اور ان حالات سے کشنو بری طرح نروس ہو گیا۔ حالانکہ بذاتِ خود بھی دلیر انسان تھا لیکن منور کی درندگی سے وہ لرز گیا تھا اور پھر اس سے واسطہ بھی پڑ چکا تھا۔ سر میں بارہ ٹانکے لگے ہوئے تھے اور ابھی تک حالت درست نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہونے لگا تھا کہ پولیس اس کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔ اسے خود ہی اپنا بندوبست کرنا چاہئے۔

چنانچہ اس شہر کی نواحی بستی میں وہ اپنے گھر چلا گیا۔ اس گھر کے بارے میں صرف چند ہی لوگوں کو معلوم تھا اور کشنو کو یقین تھا کہ منور یہاں

نہیں پہنچ سکے گا۔ یہاں آنے کی اطلاع بھی کسی کو نہیں تھی اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کشنو کی پناہ گاہ کہاں ہے۔ چنانچہ یہاں آ کر اسے تھوڑا سا سکون ہوا۔ اس نے شہر کے حالات جاننا چھوڑ دیئے تھے کیونکہ اس سے اس کی طبیعت بگڑتی تھی۔

پندرہ دن گزر گئے۔ کشنو کی حالت بہتر ہوتی گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چند ماہ تک گھر سے باہر قدم ہی نہیں نکالے گا۔ وہ اس پر عمل پیرا تھا لیکن سولہویں دن کی شام کے جھٹپٹے میں جب اس کی ماں بھگوان کے چرنوں میں بیٹھی پوجا کر رہی تھی اور وہ کھڑکی میں کھڑا آسمان پر چھانے والے اندھیرے کو گھور رہا تھا۔ اچانک عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ منور یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ صرف اس کا وہم ہے لیکن منور وہم نہیں حقیقت تھا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر خون کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔

''منور......!'' نہ جانے کس طرح اس کی آواز نکلی۔

''میں نے قسم کھائی تھی کشنو......! کہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تو نے مجھ سے جینے کا آخری سہارا بھی چھین لیا۔ میں نے کبھی برائی پسند نہیں کی تھی۔ میرا دل تو برائی کو قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ جو کچھ کیا دوسروں نے کیا۔ انسان اپنی مجبوریاں کہاں تک ٹالے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ سکتا کشنو......!'' منور نے اپنا لمبا چاقو کھول لیا اور کشنو کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی اور جب منور نے اسے نیچے گرایا تو وہ کسی بے جان پتلے کی طرح گر پڑا۔ اس کے اعضاء جواب دے گئے تھے لیکن اسی وقت عقب سے ایک

بھری ہوئی آواز سنائی دی۔

''ٹھہرو...... پاپی ٹھہرو...... خبردار چاقو اس کے بدن کو لگایا تو میں...... میں اپنی آنکھیں جلا لوں گی۔ میں اپنی......'' اور منور پلٹ پڑا۔ سفید دھوتی باندھے ایک معمر عورت کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں تھال تھا جس میں گھی کے چراغ جل رہے تھے۔

''کون ہو تم......؟'' منور کی سرد غراہٹ ابھری۔

''ماں ہوں اس کی...... اور جب تک ماں زندہ ہے اس کا پوت نہیں مر سکتا، سمجھے......! تم اسے نہیں مار سکتے۔ ارے پاپی......! کسی ماں کے دل سے پوچھ۔ کسی ماں کی آنکھ سے دیکھ...... وہ زمین پر گرا مجھے کیسا لگ رہا ہے۔ میرا من چاہ رہا ہے کہ اپنے دانتوں سے تیرا کلیجہ چبا جاؤں۔ ہٹ جا چھوڑ دے کیا بگاڑا ہے اس نے تیرا......؟''

''کاش...... کاش میری بھی کوئی ماں ہوتی۔ وہ تمہیں اس بات کا جواب دیتی کہ اس نے میرا کیا بگاڑا ہے......؟ کیا نہیں بگاڑا اس نے میرا۔ میری ساری کائنات چھین لی ہے اس نے...... سب کچھ چھین لیا ہے مجھ سے۔''

''جس نے چھینا ہے تجھ سے تیرا سنسار...... تو بدلہ اس سے لے۔ میرا سنسار کیوں چھین رہا ہے تو...... ماں کے سامنے بیٹے پر چاقو لئے کھڑا ہے۔ گھاؤ اسے نہیں لگے گا پاپی......! گھاؤ تو مجھے لگے گا۔ مروں گی تو میں...... اس کا بدلہ مجھ سے کیوں لے رہا ہے......؟ یہ دیکھ...... میں تو اس کی آرتی اتارنے آئی تھی۔ ابھی بھگوان کے چرنوں میں بیٹھ کر میں نے اس کے جیون کی دعائیں مانگی ہیں۔ میری دعائیں پوری ہونے دے پاپی......! اگر تو

ہندو ہے تو بھگوان کے لئے، مسلمان ہے تو خدا کے لئے...... اور اگر کچھ نہیں ہے تو اس کے لئے جسے تو نے دنیا میں سب سے زیادہ چاہا ہو۔ اور اگر ایسی کوئی ہستی بھی نہیں ہے تو اس ماں کے لئے جس کی کوکھ سے تو نے جنم لیا۔ اس باپ کے لئے جس کی انگلی پکڑ کر تو نے سنسار دیکھا۔ مجھے میرے بیٹے کا جیون دے دے۔ اسے چھوڑ دے۔ چاقو بند کر کے اس کے پاس سے ہٹ جا...... ہٹ جا اس کے پاس سے نہیں تو میرا دل بند ہو جائے گا۔''

منور عورت کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کشنو کی طرف دیکھا اور پھر درد بھری آواز میں بولا۔

''ماں...... ماں کہاں ملتی ہے......؟ اگر مل سکے تو مجھے بھی ایک ماں لا دو۔ میں نے ماں کی شکل آج پہلی بار دیکھی ہے۔ بڑی اچھی شکل ہے یہ۔ خدا کی قسم......! مجھے بڑی ہی پیاری لگی ہے۔ خدا نے مجھ سے میرا باپ بھی چھین لیا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی ہوتا تو آج میں یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ لیکن میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کشنو......! تو مجھ سے برتر ہے۔ کیونکہ تیری ماں موجود ہے اور میں اگر اسے ماروں گا تو اپنی آنکھیں پھوڑ دے گی ماں...... ان چراغوں سے...... ہیں ناں......! یہ کیسی پیاری بات ہے۔ تو میرا کلیجہ ضرور چبا لے ماں......! کیونکہ تیرے بیٹے کا کلیجہ چبانے کے لئے میری ماں نہیں ہے۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' پھر وہ آہستہ آہستہ عورت کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑا پیار تھا۔

''تیری آنکھیں ہمیشہ سلامت رہیں ماں......! کون دیوانہ ممتا کے اس سمندر میں آگ لگائے گا......؟ کس کا دل ہے اتنا بڑا......؟'' وہ اسے قریب سے دیکھنے لگا۔

"میں اسے نہیں ماروں گا۔ مار بھی نہیں سکتا کیونکہ تو اس کی محافظ ہے۔ اچھا ماں......! خدا کرے تیرا بیٹا ہمیشہ زندہ رہے۔ میں تیری دعا میں شریک ہوں۔" وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

"یہ کون تھا کشنو......! یہ کون تھا میرے بچے......!" عورت جلدی سے زمین پر گرے کشنو کے قریب پہنچ گئی۔ لیکن کشنو کے ذہن و دل میں تو ایک طوفان برپا تھا۔ وہ آج ایک نئے حادثے سے دوچار ہوا تھا۔ کوئی جواب نہ دے سکا وہ اپنی ماں کو۔



اس کے بدن پر بوسیدہ لباس تھا۔ بالوں میں خاک اٹی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے زخم تھے۔ پیروں میں آبلے پڑے ہوئے تھے۔ خوب صورت چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ نہ جانے کب سے سفر کر رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا پھر رہا تھا۔ نہ جانے کس چیز کی تلاش تھی۔ کوئی احساس نہیں تھا، کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ہر شئے سے بے نیاز پہاڑوں میں، جنگلوں میں، بستیوں میں، کوئی منزل نہیں تھی۔ بس سفر تھا صرف سفر۔

پھر ایک شام وہ ویرانے میں ایک عمارت کے قریب پہنچ گیا۔ چھوٹی سی عمارت ویران پڑی ہوئی تھی۔ صحن میں پھیلے پیپل کے درخت کے پتے بچھے ہوئے تھے۔ چھوٹا سا صحن، بائیں سمت ایک مینار جس پر اوپر جانے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف کنواں جس پر بوسیدہ ڈول رسی کے ساتھ موجود تھا۔ چاروں طرف ہوا کا عالم۔ برآمدے کے اندر ایک اور برآمدہ جس میں منبر بنا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر طمانیت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے اسے منزل مل گئی ہو۔ وہ منزل جو اس کے تصور میں بھی نہ ہو۔

اس نے صحن کے پتے چننا شروع کر دیئے۔ انہیں اکٹھا کر کے جھاڑو بنائی اور پھر پہلے پورا صحن صاف کیا۔ پھر دونوں دالان، پھر منبر، ایک ایک چیز کو وہ بڑی محنت سے چمکا رہا تھا۔ ان سارے کاموں سے فارغ ہو کر اس نے ڈول کنویں میں ڈال کر پانی نکالا اور پھر وضو کرنے لگا۔ وضو کرنے کے بعد وہ مینار کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اور پھر مینار پر پہنچ کر ایک نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ سورج چھپ رہا تھا۔ تب اس کے منہ سے اذان نکلی۔

"اللہ اکبر......! اللہ اکبر......!"

اور جنگل کے ویرانے میں بکھرے ہوئے جانور سمٹنے لگے۔ انہوں نے اس آواز کو سنا اور بے اختیار اس کی طرف دوڑ پڑے۔ آشیانوں کو لوٹتے ہوئے پرندے واپس لوٹ آئے۔ صحن مسجد اور اس کے در و دیوار ان پرندوں سے بھر گئے۔ مسجد کی چاروں سمت جانوروں کے غول جمع ہوگئے تھے۔ وہ بڑے سکوت کے عالم میں اس آواز کو سن رہے تھے اور منور ہر بات سے بے خبر ہر وجود سے بیگانہ اپنے اندر گم تھا۔ اس کی پرسوز آواز اس ویرانے میں دور دور تک پھیلتی رہی اور وہ شخص جو برسوں سے گم کردۂ منزل تھا، اب ویرانے میں اپنی منزل پا چکا تھا اور اس کے وجود کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔



مجسمہ

گھر سے تیسری بار فون آیا تھا۔ یہ فرحانہ کی عادت تھی۔ حالانکہ صرف تھوڑا سا فاصلہ تھا گھر اور دفتر میں لیکن گیارہ بجتے اور فرحانہ پریشان ہونے لگتی۔

"کیا بات ہے......؟ ابھی تک دفتر میں کیوں بیٹھے ہو......؟ کتنی دیر میں واپس آؤ گے......؟" حالانکہ وہ چھ بجے گھر سے نکلا تھا۔ سالا اور اس کی بیوی آئے ہوئے تھے۔ وہ واپس جا رہے ہوں گے۔ وہ یہ کہہ کر آیا تھا کہ وہ لوگ دوسرے دن چلے جائیں لیکن زبیر نہیں رکا ہوگا مصروف آدمی ہے۔

"ہیلو... فرحانہ......!" فرہاد نے گہری سانس لے کر کہا۔

"گیارہ بج کر بیس منٹ ہو رہے ہیں جناب...!"

"کیا وہ لوگ چلے گئے......؟"

"ساڑھے دس بجے ہی چلے گئے تھے۔"

"فرحانہ......! تم سو جاؤ۔ آج میں گھر واپس نہیں آ سکوں گا۔" اس نے اپنی حالت کے پیش نظر کہا۔ وہ کئی دن سے خود کو سنبھالے ہوئے تھا اور

آج تو صبح ہی سے اس کی کیفیت بھٹکی بھٹکی سی تھی۔ نوکری کے معاملات، وہ گھر پر بتانے کا عادی نہیں تھا۔

"کیا مطلب......! کیوں......؟" فرحانہ کی آواز میں پریشانی تھی۔

"دراصل صبح دو مجرموں کو سزائے موت دینی ہے۔ اتفاق سے ان کے کاغذات وغیرہ نامکمل رہ گئے ہیں۔ کچھ افسران آنے والے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر کاغذات مکمل کروں گا اور پھر صبح پونے سات بجے ان کی سزائے موت پر عمل ہوگا۔ اس کے بعد ہی گھر واپس آؤں گا۔ دیکھو فرحانہ......! ذمے داری کی بات ہے اور تم جانتی ہوں کہ میرا ریکارڈ کیسا ہے۔ تمہاری رفاقت سے نکلنا کتنا مشکل کام ہے میرے لئے، یہ تم جانتی ہو۔"

"خدا کے لئے ایسی خوفناک باتیں نہ کیا کرو مجھ سے۔"

"آئی ایم سوری فرحانہ......! تم سو جاؤ......!" فرہاد نے کہا۔

"اچھی بات ہے فرہاد......! لیکن براہِ کرم صبح جلدی آ جانا۔ اور ہاں......! اگر میں سو رہی ہوں تو مجھے فوراً جگا لینا۔ ٹھیک ہے......؟"

"خدا حافظ......!" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

یہ دلکش گفتگو اسے چند لمحات تک گدگداتی رہی۔ وہ خواب گاہ کا منظر دیکھتا رہا۔

پھر یہ منظر بدل گیا۔ بیڈ روم سلاخوں میں بدل گیا اور سلاخوں کے پیچھے ایک چہرہ نظر آیا۔ قوی ہیکل بدن، بکھرے ہوئے گھنگریالے بال، بڑی بڑی حسین آنکھیں جن میں خون کی سرخی رچی ہوئی تھی۔

شہر کے کنارے پر سرسوں کے پھیلے ہوئے کھیتوں میں اس نے

نوشاد کو دیکھا تھا۔ غرور میں ڈوبا ہوا اپنی عمر کے بچوں میں خود کو سرفراز رکھنے کا عادی۔ ذرا سی بات پر ہر ایک کو پیس کر رکھ دینے کا خواہش مند۔ اگر پوری بستی میں اس کی کسی سے دوستی تھی تو صرف فرہاد سے۔ وہ اس کی ہر بات سہہ لیتا تھا۔ اپنی عادت کے خلاف۔

یہ دوستی اس وقت ختم ہوگئی جب فرہاد کے والد رحمان شہر آ گئے۔ حالات بدل گئے، ماحول بدل گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بھول گئے اور ماہ و سال کی گرد کی تہہ دبیز ہوتی گئی۔ فرہاد زندگی کی ترقی کے بہت سے زینے طے کر گیا اور پھر شہر کی جیل میں تعینات ہوگیا۔ وہ جیلر کے عہدے پر تھا۔ نوجوان اور فرض شناس افسر۔

اور پھر جیل میں نوشاد آیا۔ کتابِ زندگی کے بہت سے اوراق اُلٹ گئے۔ نوشاد کا وہی انداز تھا۔ وہی غرور تھا۔ اس کی شکل ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ وہ فرہاد کو فوراً پہچان گیا۔

''یہ نوکری چھوڑ دے فرہاد...... تجھے راس نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ تیرا یار ڈاکو ہے۔'' نوشاد نے ہنس کر کہا۔

''لیکن یہ کیسے ہوا نوشاد......! میں نے ڈاکو نوشاد کا نام تو سنا تھا لیکن سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ تم ہوگے ؟''

''اب سوچ لے کہ یہ میں ہی ہوں اور اب بھی تیرا یار ہوں۔''

نوشاد کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ کتنا بدل گیا تھا۔ کتنا بھیانک ہوگیا تھا۔ فرہاد تعجب سے اسے دیکھتا رہا۔

''لیکن یہ ہوا کیسے......؟''

''جو ہونا تھا ہوگیا...... جو ہے وہ سوچ......!''

''شمشاد صاحب کہاں ہیں......؟'' فرہاد نے اس کے باپ کے بارے میں پوچھا۔ وہ بستی کے سب سے معزز آدمی تھے۔ نیک اور ایماندار۔ سب کے کام آنے والے۔

''قتل کر دیا گیا تھا انہیں...... سب کچھ چھین لیا گیا تھا مگر میں نے سب واپس لے لیا۔ ان کے خون کی ایک ایک بوند کا انتقام لے لیا مگر وقت گزر گیا۔ اب وہ باتیں نہ کر۔ سن فرہاد......! یہاں تو ہے۔ چند روز تیرے پاس گزاروں گا پھر بھاگ جاؤں گا...... اگر تو یہاں نہ ہوتا تو آج ہی بھاگ جاتا۔''

''مجھے بہت دُکھ ہوا ہے۔ نوشاد......! بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں......؟''

''غلط ملا ہے تو مجھے...... فاصلے قائم رکھنا۔ ورنہ نقصان اٹھائے گا۔ میں بہت بدل گیا ہوں۔ رعایت کرنا چھوڑ دیا ہے میں نے۔ بس مل لیا کر دوسرے تیسرے دن...... اور میری بات پر دھیان رکھنا، دس بارہ دن سے زیادہ نہیں رہوں گا۔''

یہ بات فرہاد کو بری لگی۔ وہ جیلر تھا۔ ایماندار افسر۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ نوشاد اس کی گرفت سے نکل جائے لیکن اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ تو آنے والا وقت بتاتا۔ اس نے حتی الامکان نوشاد کو سہولتیں فراہم کر دیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس پر کڑی نگاہ بھی رکھی۔ اب یہ تقدیر کی بات تھی کہ اسے ان دونوں میں تصادم مقصود نہیں تھا۔ ملاقات کے آٹھ دن پورے ہوئے تھے کہ اچانک فرہاد کا ایک دوسری جیل میں تبادلہ کر دیا گیا۔ اسے فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ کر اس جیل کا چارج لینا تھا۔

نوشاد نے قہقہہ لگایا۔

''دُعا مانگی تھی میں نے خدا سے...... پوری ہوگئی۔ میں ڈاکو ہوں
لیکن خدا مجھ سے خوش ہے۔ کوئی دعا مانگتا ہوں تو پوری ہو جاتی ہے۔ میں
بہت پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں یہاں سے نکل گیا تو تیری نیک نامی
میں فرق آئے گا۔ اب ٹھیک ہے...... اب بالکل ٹھیک ہے۔ پھر ملاقات ہوگی
کہیں نہ کہیں۔'' اس نے گرم جوشی سے فرہاد سے مصافحہ کیا۔

نئی جگہ پہنچ کر فرہاد نے اخبار میں پڑھا...... نوشاد جیل توڑ کر نکل گیا
ہے۔ وہ تھوک نگل کر رہ گیا۔ خدا جانے 'تقدیر کیا کھیل دکھاتی۔ وہ فرض کو
دوستی پر قربان نہیں کرسکتا تھا اور دوست کا قتل بھی اس کے لئے سخت اذیت
ناک ہوتا۔ خدا نے اسے اس امتحان سے بچالیا تھا۔

اس کے بعد جب بھی اسے نوشاد کا خیال آیا، اس نے خدا سے یہی
دعا مانگی کہ ان دونوں کا تصادم نہ ہو۔ وہ کسی سخت امتحان میں نہ پڑے......
اور یہ دعا ایک مخصوص وقت تک پوری ہوتی رہی۔ نوشاد کا نام اس کے سامنے
آتا رہتا تھا۔ وہ انتہائی خطرناک مجرم تھا۔ ڈاکہ زنی اور قتل و غارت گری اس
کا محبوب مشغلہ تھا۔ فرہاد نے اسے دل سے نکال پھینکا۔

معاشرے کے اس ناسور سے وہ محبت نہیں کرسکتا تھا۔ اسے دوست
کہنا اور سمجھنا انسانیت کی توہین تھی۔ پھر اس نے وہ دعا مانگنا ترک کردی۔
اس نے سوچا کہ اگر نوشاد کبھی اس کے سامنے آیا تو وہ اس کے ساتھ کوئی
رعایت نہیں برتے گا۔

وقت گزرتا رہا۔ فرہاد کی زندگی میں بہت سی بہاریں آگئیں۔ پہلے
فرحانہ پھر شیراز۔ اس کے گلشن میں دو حسین پھول کھلے تھے اور اس کے بعد

زندگی بہت حسین ہوگئی تھی۔

اس نئی جیل میں اسے دو سال گزر چکے تھے۔ اس کی ساری زندگی
بے داغ تھی اور حکام کی نظر میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ پھر اس نے
پڑھا کہ نوشاد گرفتار ہوگیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے سزائے موت ہوگئی اور
آج سے دس دن پہلے اسے اسی جل میں منتقل کر دیا گیا جس میں فرہاد
تعینات تھا۔ خود کو لاکھ سنبھالنے کے باوجود فرہاد شدید متاثر ہوا۔ بچپن کی دوستی
کا ایک تاثر آج تک اس کے ذہن پر طاری تھا۔ نوشاد کا بچپن آج بھی اس
کی نگاہوں میں آجاتا تھا۔ دونوں میں گہری دوستی تھی اور لوگ اس دوستی کی
مثال دیتے تھے لیکن نوشاد زندگی کے جن بھیانک راستوں پر نکل گیا تھا،
وہاں سے اس کی واپسی ناممکن تھی۔

اس کے ساتھ ہمدردی کی بات بھی ایک سماجی اور انسانی جرم تھا۔
اسی لئے وہ دو دن تک نوشاد سے ملاقات بھی نہیں کرسکا۔ اس نے اپنا کام
اپنے اسسٹنٹ سے لیا اور ان دو دنوں تک خود کو نوشاد کے سامنے لانے کے
لئے تیار کرتا رہا۔ حالانکہ اس نے خود کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔
اس نے سوچا تھا کہ نوشاد اب صرف ایک مجرم ہے۔ ایسا گھناؤنا مجرم جس
سے دوستی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ایک مجرم سے نگاہ نہیں چرانا
چاہئے۔

اور پھر تیسرے روز اس نے کال کوٹھڑی میں نوشاد سے ملاقات کی۔
وہی زندگی، وہی شگفتگی۔ فرہاد کو اس نے مسرور نگاہوں سے دیکھا۔
''ہیلو جیلر صاحب......! آپ ہیں یہاں...... کیسے ہو فرہاد......؟''
آخر میں اس کے لہجے میں مٹھاس آگئی۔

''ٹھیک ہوں نوشاد......! تم برائی کے راستوں پر بہت دُور نکل آئے ہو۔'' فرہاد نے اداس لہجے میں کہا۔

''ہاں یار......! بہت باز رکھا خود کو...... نہ رکھ سکا تو پھر پوری طرح کھل گیا۔ میں کوئی کام ادھورا کرنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''کیا ملا تمہیں جرائم کی اس زندگی میں......؟''

''سچ پوچھو تو کیا نہیں ملا...... کیا نہیں ہے میرے پاس......؟ دولت کی ریل پیل ہے۔ ہر خوشی میرے قدموں میں ڈھیر ہوسکتی ہے لیکن یہ انسان کی بھول ہے۔ وہ چاہے تو ہر چیز کو اپنا سمجھ لے لیکن کوئی چیز اس کی اپنی نہیں ہے۔ تم اس زندگی کی بات کرتے ہو۔ کسی بھی زندگی میں کچھ نہیں ہے۔ زمین سے ایک کونپل اُگتی ہے، پروان چڑھتی ہے، درخت بنتی ہے اور پھر ایک دن سوکھ جاتی ہے۔ ایک مسلسل عمل ہے جسے جو دل چاہے نام دے لو۔ ملتا ملاتا کچھ نہیں ہے۔ میرے دوست......! یہ عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔''

''لیکن انسانیت کے کچھ اصول ہیں۔ درختوں کی ایک قطار ہوتی ہے۔ یہ اصول سرفرازی عطا کرتے ہیں۔ ایک مجرم اور ایک ولی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ موت کے بعد بھی تو ایک زندگی ہوتی ہے...... یہاں بھی اور وہاں بھی۔''

''ہاں......! موت کے بعد بھی ایک زندگی ہوتی ہے۔ میں نے بھی اس زندگی کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ اب دیکھ لوں گا...... نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ میری وہ زندگی بری نہیں ہوگی۔ اسے بھی تم انسان کی خوش فہمی کہہ لو۔ اس بات کو تو جاننے والا جانتا ہے۔ باقی رہی یہاں کی زندگی کی بات تو تم اس زندگی کے لئے کہہ رہے ہو جو موت کے بعد ایک یاد کی

حیثیت سے قائم رہتی ہے۔''

''ہاں......! اچھے عمل ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔''

''برے عمل بھی ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں اور پھر کیا ملتا ہے ان یادوں سے......؟ کس کی بات کر رہا ہے فرہاد......! انسان نے انسان کے لئے بہت کچھ کیا ہے لیکن گزرنے والا وقت گزر جاتا ہے۔ پھر یہ یادیں ایک تماشا بن جاتی ہیں۔ مضحکہ اڑتا رہتا ہے زندگی کا۔''

''میں نہیں سمجھتا نوشاد......! کہ تمہارا ذہن کن بنیادوں پر بھٹکا ہے۔ تمہیں علم ہے کہ اب تمہاری زندگی کا اختتام ہے......؟''

''ہاں......! میں جانتا ہوں اور میں نے خوشی سے یہ موت قبول کی ہے۔ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ یار......! میں بہت تھک گیا ہوں۔'' نوشاد مسکرا دیا۔

''میں ان عوامل کو جاننا چاہتا ہوں نوشاد......! جنہوں نے زندگی میں تمہیں یہ غلط سوچیں بخش دیں۔ ان سوچوں کے مالک تم تنہا انسان نہیں ہو۔ ہر مجرم جو انسانیت سے دور چلا جاتا ہے، انسانیت پر ایسے ہی الزام تراشتا ہے اور یہ الزامات اس کی اپنی اختراع نہیں ہوتے بلکہ غلط سوچ اسے تباہی کے راستوں پر دوڑاتی ہے۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے......؟''

''دوست کا سوال ہے تو بتاؤں گا لیکن تم یہ الفاظ اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم نوشاد نہیں فرہاد ہو۔ بات میری فطرت کی تھی۔ میں نہیں جانتا میری عادت میں خودسری کیوں تھی۔ تم جانتے ہو، اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ہمیشہ ہر اس بات کا مخالف تھا جو دوسری جانب سے کہی گئی ہو۔ سب میرے والد کو نیک فطرت اور شریف الطبع انسان کہتے تھے لیکن میری نگاہوں میں

نیکی اور شرافت کا مفہوم ذرا مختلف تھا۔ تم تو بستی چھوڑ کر چلے آئے۔ میں
اداس ہوگیا کیونکہ بستی کے لوگ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ میں اداس
رہنے لگا۔ تب میں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے
لئے شہر بھیج دیں لیکن وہ اس پر تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ میں نے اطمینان سے
ان کی تجوری سے کچھ رقم نکالی اور چل پڑا۔ قصبے پہنچا، وہاں سے ریل میں
بیٹھ کر شہر آگیا۔

اسٹیشن پر ہی مجھے ایک شخص نے پکڑ لیا۔ یہ کسی فلاحی انجمن کا نمائندہ
تھا۔ اس مجھ سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کی لیکن میں نے اسے کچھ
بتانے سے انکار کر دیا۔ اس نے زبردستی کی تو میں اسے زخمی کر کے وہاں سے
بھاگ گیا اور اس شخص نے پولیس کے روزنامچے میں مجھے ایک خطرناک لڑکا
درج کرا دیا۔ ضد کی ہی تو بات تھی۔ شہر میرے لئے اجنبی تھا۔ میں پولیس کی
نگاہوں سے چھپ نہ سکا اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ سماجی کارکن کو زخمی کرنے
کے سلسلے میں مجھے سزا دی گئی اور میں نے پہلی بار بچوں کی جیل دیکھی۔ یہ
خاصی دلچسپ جگہ تھی۔ میں نے یہاں اپنی انا کی تسکین قائم رکھی۔

حکام نے لاکھ کوشش کی کہ میں اپنے گھر کا پتا بتا دوں لیکن میں نے
انہیں شکست دی اور وہ میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم کر سکے۔ بچوں کی
جیل سے ایک سال کے بعد نکلا۔ حالانکہ پہلی سزا صرف دو ماہ کی تھی لیکن باقی
دس ماہ کی سزا میں نے جیل میں مار پیٹ کے بعد پائی تھی۔ ایک سال بعد
جب میں رہا ہوتو شہروز خان نے جیل سے باہر میرا استقبال کیا۔

یہ لڑکا ایک استاد کا شاگرد تھا اور یہ استاد جیب تراش تھا۔ چنانچہ
مجھے کھانا اور رہائش مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی کام سیکھنے لگا۔ کام سیکھ کر میں

نے کاروبار شروع کر دیا۔ استاد میری فطرت سے واقف ہو چکے تھے اس لئے
ذرا خیال رکھتے تھے لیکن ایک دن نشے میں بہک گئے۔ ان کے منہ سے گالی
نکلی اور میں نے چاقو سے ان کی زبان کاٹ دی۔ اس کے بعد وہاں رکنا بے
معنی تھا لیکن مجھے نواز خان نے فوراً ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہ نقب زن تھا اور ہمیشہ
بڑے بڑے پروگرام بناتا رہتا تھا۔ نواز خان سے میری ملاقات استاد کے
اڈے پر ہی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ایک آدمی کی جیب صاف کر دی
تھی۔ بہرحال، میں نواز خان کے ساتھ کام کرتا رہا اور کئی سال گزر گئے۔

پھر نواز خان مر گیا...... اس کی موت کے بعد میں پھر بے سایہ ہوگیا
لیکن میں نے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا اور اس میں مجھے کوئی
دقت نہیں ہوئی۔ لیکن اب میرا ذہن کلاسیکی روایات کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔
میں نے پرانی روایات تازہ کرنے کے لئے کلاسیکی طرز کے ڈاکے ڈالے اور
گروہ بنا لیا۔

دولت جمع ہوئی تو عورت کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن پہلا تجربہ ہی
حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ طبیعت صنف مخالف کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ بعد
کے واقعات سے یہ ثابت ہوتا چلا گیا کہ مرد کو مارنے یا مروانے میں شراب
اور عورت اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ رہی سہی کسر فردوس نے پوری کر دی۔ اس
کا اصل روپ سامنے آنے کے بعد میں نے عورت کے خیال کو ذہن کے
نہاں خانوں میں دفن کر دیا۔

کیا تم یقین کرو گے فرہاد......! کہ نوشاد ڈاکو نے ساری زندگی نہ
عورت کو چھوا اور نہ شراب کو۔ پہلی بار جب میں گرفتار ہوا تو عورت ہی اس کا
محرک تھی لیکن وہ میرے ذریعے نہیں آئی تھی بلکہ میرا ایک ساتھی اس کا شکار

ہوگیا تھا جس کی وجہ سے سب کو زحمت ہوئی۔ دوسری بار بھی عورت ہی ہماری گرفتار کا باعث بنی تو میں نے اپنے ساتھیوں کے لئے پابندی عائد کر دی شراب اور عورت میرے گروہ پر ممنوع ہوگئی تو میرے دوست اس پابندی سے بددل ہوگئے۔

میں اکثر سوچتا فرہاد......! کہ آخر ان دونوں چیزوں میں ایسی کون سی کشش ہے کہ انسان ان کے لئے دیوانہ ہے۔ زندگی کا ایک باب تشنہ رہ جاتا ہے...... وہ یہ کہ کئی سال کے بعد ایک بار گھر کی یاد نے ستایا تو میں بستی پہنچ گیا۔ میں صرف ایک نگاہ ان لوگوں کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن جب میں اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو وہاں ملبے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ بستی ذرا ہٹ کر آباد ہوگئی تھی اور اس گھر کو ویرانے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے لوگوں سے وجوہ معلوم کیں تو انوکھا انکشاف ہوا۔

تمہیں مولوی غلام رسول یاد ہے......؟''

''ہاں......! جس کے سات بیٹے تھے......؟'' فرہاد نے یاد کر کے کہا۔

''بالکل وہی......! اور جو پوری بستی میں اس لئے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ اس کی زبان نیکیوں کی تلقین کرتے نہیں تھکتی تھی۔ اس کو کہیں سے دولت مل گئی اس نے زندگی کا ڈھانچہ ہی بدل دیا۔ مکان بنایا، زمینیں خریدیں اور پھر بستی میں غلام رسول کا نام ابھر آیا۔ اس کے ساتوں بیٹے جوان ہوگئے۔ سب سے بڑے بیٹے کا رشتہ میری بہن کے لئے آیا۔ والد صاحب غلام رسول کی حیثیت نہیں بھلا سکے تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا جسے ان کا بیٹا برداشت نہ کر سکا۔ اس نے میری بہن کو اغواء کرنے کی کوشش کی تو میرے

بھائی نے اسے ہلاک کر دیا۔

تب غلام رسول کے بیٹوں نے سازش کر کے پہلے میرے والد کو اور پھر میرے بھائی کو قتل کر دیا اور ظلم کی بات یہ ہے کہ تمہارے قانون سے بچ بھی گئے۔ یہ داستان سن کر میں نے نہایت سکون سے کام لیا اور پھر غلام رسول صاحب کو اس کے بیٹوں سمیت بستی کے چوک پر کھڑا کر کے گولی مار دی۔

گھر والوں کا کھیل بھی ختم ہوگیا تھا اور مجھے کوئی منزل نہیں ملی تھی۔ میرے دل میں کوئی ایسا احساس نہیں جاگا تھا جسے میں اپنا مرکز نگاہ بنا سکتا۔ ساری زندگی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے کسی شے کی تلاش ہے۔ وہ شے کہاں ہے...... کیا ہے...... اس کے بارے میں نہیں معلوم۔ اگر مجھے اس کا اندازہ ہوجاتا تو شاید میری زندگی کا رخ بدل جاتا لیکن میں معلوم ہی نہیں کر سکا......کبھی معلوم نہیں کر سکا۔''

''کتنے قتل کئے ہیں تم نے......؟''

''کوئی یاد تھوڑی رکھے ہیں یار......!'' نوشاد ہنس دیا۔

''میں تمہیں بتاؤں نوشاد......! تمہیں نیکی اور سچائی کی تلاش تھی۔ تمہاری ذہنی نشو ونما میں کوئی سقم رہ گیا تھا۔ کوئی احساس تمہارے دل میں بند ہوگیا تھا جسے تم کھول نہیں سکے۔ کیا تم نے کبھی بھلائی کے راستوں پر چلنے کی کوشش بھی کی......؟''

''دیکھ یار......! اب اس آخری وقت میں تو بور نہ کر...... مولوی راحت حسین یاد ہیں تجھے جو بچوں کو جگہ جگہ پکڑ کر اقوالِ زریں سنایا کرتے تھے......؟''

''ہاں......! یاد ہیں......!''

''انہوں نے نیکیوں کے کچھ گر بتائے تھے۔ میں نے کوشش کی لیکن کام نہیں بنا۔''

نوشاد خاموش ہوگیا لیکن فرہاد کے دل پر بڑا بوجھ آپڑا اور کئی دن سے وہ اس بوجھ کو سب سے چھپائے ہوئے تھا۔ نوشاد کے پھانسی دن قریب آگئے تھے۔ بالآخر یہ رات آگئی جس کی صبح اسے دو انسانوں کو سزائے موت دینی تھی۔ اس رات وہ بہت اداس تھا۔ بڑی کشمکش کا شکار تھا۔

''نوشاد کے لئے میں کیا کرسکتا ہوں......؟''



بارہ بجے دفر میں وہ تنہا تھا۔ باہر خاموش رات پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ سوچا اور دفتر سے نکل آیا۔ باہر کھڑے سنتریوں نے ایڑیاں بجائیں اور وہ سر جھکائے آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کال کوٹھڑی کے قریب تھا جہاں بد نصیب قیدی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ کوٹھڑی صاف و شفاف تھی۔ ایک مدھم بلب جل رہا تھا اور کمرے کے درمیان نوشاد اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔

قدموں کی چاپ پر اس نے چونک کر باہر دیکھا۔ فرہاد کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سلام جیلر صاحب......! کیا صبح ہوگئی......؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں......!'' فرہاد بھاری لہجے میں بولا۔

''کیا وقت ہوا ہے......؟''

''ساڑھے بارہ......!''

''اس وقت کیسے آگئے......؟ خود میرا بھی اندازہ ہے کہ ابھی صبح نہیں ہوئی۔ تمہیں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی مجھے۔'' نوشاد اپنی جگہ سے اٹھ کر سلاخوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ نوشاد نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ درحقیقت نوشاد ذہنی مریض تھا۔ فرہاد نے بہت سے سزائے موت کے مجرموں کو دیکھا تھا۔ ان لمحات میں ان کی حالت بگڑ جاتی تھی اور وہ سب کچھ بھول جاتے تھے لیکن نوشاد جوں کا توں تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو نوشاد......!'' فرہاد نے پوچھا۔

''ایک فلسفہ جو بے حقیقت ثابت ہوا۔ لوگ کہتے ہیں

''آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں......!''

کیا خیال ہے......؟ کیا میں اپنی موت سے آگاہ نہیں ہوں......؟ چھ بج کر پینتالیس منٹ......کیسی بات ہے......؟''

''ہاں......! تم اپنی موت سے واقف ہو اور اب کوئی تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔''

''تمہیں سچائی کی قسم فرہاد......! جہاں یہ شعر لکھا دیکھو مٹا دینا۔''

''ایک دوست ہونے کی حیثیت سے میرے دل میں تمہارے لئے اب بھی انسیت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر تمہارے دل میں کوئی خواہش ہو تو مجھے بتا دو۔ میں اسے پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''یار فرہاد......! اگر تم نے یہ بات کہی ہے تو میں تم سے دل کی بات ضرور کہوں گا۔ یہ بتاؤ......! تم نے شادی کر لی......؟''

''ہاں......!''

''عورت کیا ہے......؟''

’’ماں، بہن، بیوی، بیٹی...... یہ چاروں روپ ہیں اس کے اور اگر وہ چار کے اس ہندسے سے نکلتی ہے تو عورت نہیں رہتی۔‘‘

’’بڑی انوکھی چیز ہے۔ میں نے عورت کبھی نہیں دیکھی۔ کیا وہ سچ مچ انسان کو اتنا ہی متاثر کرتی ہے......؟‘‘

’’اس حیثیت کے دائرے میں۔‘‘

’’شراب پی ہے کبھی تم نے......؟‘‘

’’ہاں......! انکار نہیں کروں گا۔‘‘

’’اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں......؟‘‘

’’اچھے نہیں ہوتے۔‘‘

’’میں ان دونوں چیزوں کو آزمانا چاہتا ہوں۔ کیا تم آج کی رات ان چند گھنٹوں میں مجھے یہ آخری خواہش پوری کرنے کا موقع دو گے......؟ دیکھو...... یہ بڑی معمولی سی بات ہے اور پھر یہ پیشکش تمہاری ہے۔‘‘ نوشاد نے کہا تو فرہاد کے ہوش اُڑ گئے۔ واقعی خواہش ناقابل عمل نہیں تھی لیکن نوشاد؛ عورت اور شراب...... وہ کسی قدر پریشان ہوگیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’ٹھیک ہے......! میں تمہاری یہ خواہش پوری کر دوں گا۔‘‘

’’شکریہ......! لیکن جلدی...... وقت بہت کم ہے۔ کہیں میری تحقیق ادھوری نہ رہ جائے۔‘‘

فرہاد وہاں سے پلٹ آیا۔ وہ عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے ایک جذباتی پیش کش کی تھی جو اس کے لئے خاصی اُلجھن کا باعث بن گئی تھی...... لیکن وعدہ تو پورا کرنا تھا۔

سلاخوں والا دروازہ کھلا اور لمبے سیاہ لبادے میں ملبوس عورت کو اندر دھکیل دیا گیا۔ سنتریوں نے شراب کی اچھی خاصی مقدار مع گلاس کے اندر پہنچا دی اور پھر دروازہ بند ہوگیا۔

نوشاد کی نگاہ اس آتشیں وجود پر پڑی جس کا رنگ سیاہ لبادے میں کندن کی طرح دہک رہا تھا۔ جس کے سنہرے بال منتشر تھے اور آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ وہ ایک ادا سے لڑکھڑا کر آگے بڑھی اور نوشاد کے سامنے پہنچ گئی۔

’’تم کون ہو......؟‘‘ اس کی باریک آواز ابھری لیکن نوشاد دہکتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے عورت کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

’’بولو...... تم کون ہو......؟‘‘

’’تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہوں......؟‘‘

’’جلاد......!‘‘ وہ ہنس پڑی۔ یہ نشے میں ڈوبی ہوئی ہنسی تھی۔

’’تمہارا خیال درست ہے۔‘‘ نوشاد اپنی جگہ سے اٹھا اور شراب کی دونوں بوتلیں اٹھا کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس میں شراب انڈیلی اور اس کا پہلا گھونٹ حلق میں اتار لیا۔

’’تلخ اور بے مزہ...... لوگ اسے کیوں پیتے ہیں......؟‘‘ وہ آہستہ سے بولا۔

’’اس کی کڑواہٹ زندگی کی تلخیوں کو چوس لیتی ہے۔‘‘ عورت کی آواز ابھری۔

’’تم خاموش رہو۔ اگر ایک بھی لفظ اس کے بعد تمہارے منہ سے نکلا تو میں تمہاری گردن دبا دوں گا۔‘‘ نوشاد غرایا۔

عورت ہنسی اور پھر ایک دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ نوشاد نے گلاس خالی کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف کے آثار نظر آئے لیکن اس نے فوراً ہی دوسرا گلاس بھرلیا پھر اس نے دوبارہ عورت کو دیکھا۔

"انوکھی ہے...... دلکش...... مگر......" اس نے شراب کے کئی گھونٹ لئے اور پھر تلخی سے منہ بنا کر بولا۔

"انسان بھی عجیب ہے۔ مٹھاس سے دل بھر جاتا ہے تو پھر تلخیوں میں ڈوبنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمین پر اگنے والی حقیر کونپل، اپنے لئے مشکلات تلاش کرتی ہے۔" اس نے تیسرا گلاس بھرلیا۔

اس بار تلخی کچھ کم ہوگئی تھی۔ وہ خاموشی سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ عورت شاید دیوار سے لگے لگے سوگئی تھی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ کشادہ پیشانی سے نازک پیروں تک...... اور بس عورت ختم۔

"بس اتنی سی ہے عورت...... ہونہہ......! اس کے بارے میں اتنے افسانے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شرات عورت کو مکمل کرتی ہے...... کس طرح......؟ یہ عورت نامکمل کیوں ہے......؟"

اس نے شراب کا چوتھا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا اور پھر خاموشی سے عورت کو دیکھتا رہا۔ بوتل خالی ہوگئی لیکن کوئی تحریک نہیں ہوئی...... کوئی جذبہ نہیں جاگا۔

"دنیا ہی نامکمل ہے...... کوئی تبدیلی نہیں ہوئی...... صرف تمہارا احساس ہے خود کو جہاں چاہو سمجھ لو...... جہاں چاہو دیکھ لو...... یہ عورت ماں نہیں ہے، بہن نہیں ہے، بیوی نہیں ہے، بیٹی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ عورت نہیں ہے۔ میں گوشت کے اس مجسمے میں عورت کہاں تلاش

کروں......؟ کہاں ہے عورت......؟" اس نے گلاس رکھ دیا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ آہستہ قدموں سے دیوار سے لگی عورت کے قریب پہنچا اور اسے جھٹکا دیا۔

عورت اس جھٹکے سے جھکی لیکن اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سنبھالا اور دوبارہ دیوار سے ٹکا کر کھڑا کر دیا۔ وہ اس کے وجود میں دلکشی تلاش کرنے لگا۔ کندن دمک رہا تھا لیکن اس میں وہ کھینچ لینے والی کشش کہاں ہے......؟ جس کے لئے پھر لوگ پاگل ہوجاتے ہیں......؟

ماں...... اس کے ذہن میں ایک تصور ابھرا اور اس نے اپنے ہونٹ عورت کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

کوئی تقدس نہ ابھرا۔

بہن...... اس نے اپنے ہونٹ عورت کی پیشانی پر ٹکا دیئے۔

بیوی...... اس کے رخسار عورت کے چہرے سے جا ٹکے۔

بیٹی...... اس کے بازوؤں نے اسے آغوش میں لے لیا اور پھر وہ کرب سے چیخا۔

"یہ نقلی ہے۔ اس کا ہر روپ جھوٹ ہے۔ یہ بہن ہوتی تو بے لباس نہ ہوتی۔ یہ ماں ہوتی تو اس کے ہاتھ میں محبت کی گرمی ہوتی۔ یہ بیوی ہوتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے۔ یہ بیٹی ہوتی تو اس کے لئے دل دکھتا۔

یہ نقلی عورت ہے۔ یہ عورت کے نام پر فریب ہے۔ ماں وہ ہوتی ہے جو گھر کی چار دیواری میں اولاد کے لئے سربسجود ہوتی ہے۔ بہن وہ ہوتی ہے جس کی آنکھوں میں بھائی کی عزت کا پاس ہو۔ بیوی وہ ہوتی ہے جس کی آغوش صرف شوہر کے لئے وا ہو۔ بیٹی وہ ہوتی ہے جو باپ کی ناموس کو

سڑکوں پر نہ لے آئے......

اور جو کچھ نہیں ہوتی، وہ یہ ہوتی ہے۔ مجسمہ عورت کا مذاق...... عورت کے نام پر دھوکہ......فریب۔"

نوشاد کے ہاتھ اس کی گردن پر پہنچ گئے۔ ان ہاتھوں میں بلا کی قوت تھی۔ عورت نے معمولی سی مزاحمت کی لیکن نوشاد کے ہاتھوں کی گرفت سخت سے سخت ہوتی گئی۔ اندر سے کچھ ہڈیاں ٹوٹنے کی آوازیں آئیں۔ ناک، منہ اور کانوں سے خون بہنے لگا اور نقلی بت نیچے گر پڑا۔ زبان باہر نکل آئی تھی۔ آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں۔

نوشاد پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے بغور اسے دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں......! جو عورت نہیں ہے، وہ یہ ہے...... یہ اس کی اصلی شکل ہے اور شراب ایک دھوکا ہے جو انسان نے خود کو فریب دینے کے لئے ایجاد کیا ہے۔ فریب......صرف فریب......" اس نے شراب کی بوتل کو ٹھوکر ماری اور بوتل دُور جا پڑی۔ جیل کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔

فرہاد اچھل پڑا۔ اس نے پریشان نگاہوں سے کونے میں پڑی ہوئی لاش کو دیکھا۔ اس کے عقب میں دوسرے افسر کھڑے ہوئے تھے۔ تب اس نے جیل کی کال کوٹھڑی کا دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

نوشاد زمین پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔

"نوشاد......!" اس نے آواز دی تو نوشاد نے اپنی شعلہ بار آنکھیں کھول دیں۔

"کیا وقت ہوا ہے فرہاد......!"

"چھ بجے ہیں......!"

"چلوں......؟"

"ہاں......! اٹھ جاؤ......! لیکن تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے میرے لئے کیا پریشانی پیدا کر دی ہے......؟ تم نے اس عورت کو قتل کر دیا......؟"

"مجھے افسوس ہے فرہاد......!"

"چلو...... تیار ہو جاؤ......! میں نے اگر ذرا بھی عقل مندی سے کام نہ لیا ہوتا تو تم میرا طویل ریکارڈ خراب کر سکتے تھے۔ تمہاری موت کے پندرہ منٹ بعد اس عورت کو بھی سزائے موت دی جانے والی تھی کیونکہ اس نے اپنے آوارہ شوہر کو قتل کر دیا تھا۔"

فرہاد نے اپنے عقب میں کھڑے اہل کاروں کو اشارہ کیا اور وہ اندر آ گئے۔



اعتراف

پاشا نے کار روک دی اور قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ا
بھدی اور سال خوردہ عمارت تھی۔ ہر طرف گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے
دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کار سے اُتر کر وہ ایک دُکان پر گیا اور اس نے ہمدا
کا پتا پوچھا تو دُکاندار نے نہ صرف اسے پتا بتایا بلکہ خود اسے ہمدانی کے پا
لے گیا۔

پاشا کو ایک ہی نگاہ میں ہمدانی کی شخصیت پسند آئی تھی۔ اس نے
پاشا سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور اسے ساتھ لے کر اپنے فلیٹ کی
طرف چل پڑا۔

"آپ کے پڑوسی بہت اچھے ہیں ہمدانی صاحب......! اس دُکاندار
کو ہی لے لیجئے۔ میں نے صرف آپ کا نام لیا اور وہ مجھے آپ کے پا
لے آیا۔"

"آپ کو حیرت ہوئی ہوگی۔ اصل میں وکیل صاحب......! یہ انوکھی
بستی ہے۔ ایک دوسرے سے محبتوں کی حامل۔ یہاں سے وہاں تک کہیں بھی

چلے جایئے، آپ کو کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔"

عادل پاشا، ہمدانی کے ہمراہ اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو ہر طرف
کوڑا کرکٹ، سگریٹوں کے خالی ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ نادر ہمدانی نے
گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ یہاں ہے اس پر تبصرہ بیکار ہوگا۔ تشریف رکھئے......!" پاشا
ہنستے ہوئے بیٹھ گیا۔

"میں نہ وقت ضائع کرنے کا عادی ہوں نہ لمبی تمہید کا۔ آپ کو آپ
کے آرٹیکلز اور اخبار کی وجہ سے جانتا ہوں۔ دل سے آپ کا قدرداں بھی
ہوں۔" پاشا کی بات پر نادر ہمدانی ہنسنے لگا پھر اس نے کہا۔

"وہ ان کا کام ہے، وہ کرتے ہیں۔ جو میرا کام ہے، میں کرتا
ہوں۔ زندگی بڑی معمولی سی چیز ہے۔ جینا تو ہر شخص چاہتا ہے۔ میں بھی
چاہتا ہوں لیکن جینے کے علاوہ بھی تو انسان کے اور بہت سے کام ہوتے
ہیں۔"

"میں آپ سے اپنا مکمل تعارف کرا دوں۔" پاشا نے کہا۔

"شرمندہ کر رہے ہیں پاشا صاحب......! آپ کے بارے میں بھی
مجھے یہ بات معلوم ہے کہ آپ وہ سچے اور پُرجوش وکیل ہیں جو بڑی چھان
بین کے بعد کیس لیتے ہیں اور اکثر کیسوں میں آپ نے خود اپنے مؤکلوں کو
ہرایا ہے اور سچ کا بول بالا کیا ہے۔ آپ بھی میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔"

"تو پھر ملایئے ہاتھ......! اگر دو دیوانے مل جائیں تو......"

"میں تو ویسے بھی آپ سے ہاتھ ملائے ہوئے ہوں۔ ملاقات نہیں
ہوئی کبھی تو کیا ہوا......؟ خیر......! میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ

مجھ سے واقف ہیں تو میں بھی آپ سے واقف ہوں۔“

”بس اتنا سا نظریہ ہے میرا کہ وکیل کا لفظ معمولی نہیں ہے۔ یہ ا
مقدس نام ہے جس پر بڑی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ صرف فیس لے
اپنے مؤکل پر یہ یقین کر لینا کہ وہ سب کچھ سچ کہہ رہا ہے، میرا مسلک نہ
ہے۔ میں تھوڑی سی چھان بین کے بعد کیس لیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے فضل
کرم آج تک میرا ریکارڈ ہے کہ کوئی کیس نہیں ہارا۔ خیر...... تو میں آپ
یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ آپ کرائم رپورٹر ہیں اور اپنے آپ کو خبروں کے
کھپائے رکھتے ہیں اور وہ دور کی کوڑی لاتے ہیں جو بڑے بڑے چہرے
نقاب کر دیتی ہے۔ میں آپ کے پاس ایک کام سے حاضر ہوا ہوں
ہمدانی صاحب......! اور وہ یہ ہے کہ آپ میرے خفیہ ہاتھ بن جائیے۔“

”خفیہ ہاتھ......؟“

”ہاں......! میرے پاس اگر ایسا کوئی کیس آتا ہے جو مجھے دلچ
حامل محسوس ہوتا ہے تو میں آپ سے رابطہ کروں گا اور یہ چاہوں گا کہ آ
ان حقائق کی تفتیش کریں جو اس کیس میں پوشیدہ ہیں۔ اس طرح مجھ
فائدہ ہوگا کہ خود مجھے وہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔ آپ جو رپورٹ پیش ک
گے میں اسی کی روشنی میں اپنا کیس لڑ دوں گا۔“

”دلچسپ...... ڈن......!“ ایک دم سے جواب ملا اور خود عادل
بھی حیران رہ گیا۔

”حیران نہ ہوں۔ بات ہی ایسی ہے جو میرے مزاج سے ہم آ
ہے۔ میں اپنا کام بے شک کرتا ہوں لیکن بہت سے معاملات میں م
لئے بھی دشواریاں پیش آ جاتی ہیں۔ میں ایک رپورٹ دیتا ہوں جو م

ایڈیٹر صاحب بڑی مشکل سے قبول کرتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں کہ عذاب، ثواب کرائم رپورٹر کی گردن پر۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ بھی وہی سب کچھ ہو جاتا ہے جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو آپ یہ سن لیجئے کہ اس کے نتیجے میں آپ کو معاوضہ بھی ملا کرے گا۔ بڑی باقاعدگی کے ساتھ۔“

”آپ ضرور دے دیا کریں۔ چونکہ میرے ساتھ میرے مسائل...... نہیں ہیں بلکہ میں نے زندگی میں کچھ اور لوگ بھی شامل کئے ہوئے ہیں جن کے بارے میں میں تفصیل نہیں بتاؤں گا۔ بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں اور میں بھی۔ میں مطمئن ہوں لیکن میرا اطمینان اس وقت مکمل ہوتا ہے جب میں ان کی کچھ خدمت کر لیتا ہوں۔“

”تو پھر ملائیے ہاتھ......! میں آپ کو بتاتا رہوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ موبائل فون ہے آپ کے پاس......؟“

”ہاں......!“ نادر ہمدانی نے ایک طرف رکھا ہوا موبائل اٹھا کر سامنے رکھ لیا۔ یہ گھسا پٹا اور سستا سا موبائل تھا۔ اس نے اپنے نمبر عادل پاشا کو بتائے اور عادل پاشا کے نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کر لئے۔

”کیا میں آپ کو ایک موبائل پیش کر سکتا ہوں......؟“ عادل پاشا نے کہا۔

”نہیں......!“ نادر ہمدانی نے جواب دیا۔



نادرہ آباد سرسبز و شاداب درختوں، لہلہاتے کھیتوں اور پھلوں سے

لدے باغوں کا شہر تھا۔ سبزہ جیسے یہاں بھرا پڑا تھا، اس کے اطراف میں ایک معروف دریا بہتا تھا اور شاید اسی کی وجہ سے یہ علاقہ اس قدر شاداب تھا۔ ڈاکٹر شیراز گل نے یہاں اپنا کلینک کھول کر بڑا نام کمایا تھا۔ انہیں انتہائی کامیاب فزیشن اور سرجن سمجھا جاتا تھا مگر اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں وہ جس قدر کامیاب تھے، ان کی گھریلو اور ازدواجی زندگی اتنی ہی تلخ اور ناکام تھی۔

ان کی بیگم صدف حسین خدوخال اور دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ بظاہر بے حد خوش اخلاق، ملنسار اور سوشل۔ گو کہ اس کی شناخت ڈاکٹر شیراز کی وجہ سے تھی لیکن کچھ ہی عرصے میں اعلیٰ سوسائٹی میں اس نے اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا جبکہ اس کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس کے بہت ہی بے تکلف دوستوں میں عورتوں کی تعداد تو برائے نام ہی تھی۔ اپنے دوستوں سے ملنے جلنے کے معاملے میں وہ اس قدر بے تکلف اور بے باک تھی کہ شک کی حدود میں داخل ہو جاتی تھی اور یہی شک ڈاکٹر شیراز کی زندگی کو تلخ کر رہا تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان کچھ اختلافات شدید نوعیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔

یہاں تک کہ ایک دن ایک ہلکی سی جھڑپ کے دوران ڈاکٹر شیراز گل نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے صدف......! کہ ہم لوگوں کے تعلقات کا وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ میں تمہیں طلاق دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب......! یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نکاح نامے میں کیا کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔ صرف مہر ہی نہیں، اس کے

علاوہ بھی آپ کو اتنی ادائیگیاں کرنی پڑیں گی جن کے بارے میں مجھے اس بات کا علم ہے کہ آپ نہیں کر سکیں گے۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہی ہو......؟ میں اب باز نہیں رہ سکتا۔ بحالت مجبوری مجھے عدالت کا سہارا لینا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے اپنے حلقہ احباب میں بہت بڑے بڑے نام شامل کر لئے ہیں لیکن میں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے...... میرا چیلنج قبول کر لیجئے۔ آپ مجھے طلاق دیجئے۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ اس کے نتیجے میں کیا کرنا پڑے گا آپ کو......'' ڈاکٹر شیراز گل نے آخر کار عدالت میں درخواست دے دی کہ عدالت یا تو ان کی بیوی کو اپنے گھریلو فرائض کی ادائیگی پر مجبور کرے یا انہیں اختیار دے کہ وہ اسے طلاق دے دیں۔ اس درخواست نے ان کے تعلقات میں مزید تلخی پیدا کر دی۔ حالانکہ ایک ہی گھر میں قیام تھا لیکن دونوں کے درمیان تعلقات تقریباً ختم ہو گئے تھے۔

اس دن بھی ڈاکٹر شیراز کلینک جانے کے لئے تیار تھے اور چائے پی رہے تھے کہ دروازے کی بیل بجی اور کچھ لمحوں کے بعد ملازمہ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ یہ عدالت کا اہل کار تھا جو سمن لے کر آیا تھا۔

سمن وصول کر کے وہ اسے پڑھتے ہوئے اندر آئے تو سامنے صدف کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''کون تھا......؟'' اس نے بناوٹی لہجے میں پوچھا۔

''ہوں...... گڈ......! تمہیں معلوم ہے کون تھا......؟ واقعی تم باکمال شخصیت ہو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنے آگے کی چیز ہو۔''

"ضرورت انسان کو بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ میرے بعض حقوق ہیں اور مجھے ان کا تحفظ تو کرنا ہی تھا۔"

"لیکن جھگڑا تو میرے اور تمہارے درمیان ہے، کسی اور کو اس میں ملوث کرنے کی کیا ضرورت تھی......؟"

"بس...... آ گئے ہوش ٹھکانے ڈاکٹر صاحب......! دنیا صرف ایک کلینک تک محدود نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ جو کچھ کر رہے ہیں، دنیا کو اس کی خبر نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" ڈاکٹر شیراز گل نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

"مطلب صاف ہے۔ اس نوٹس سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ آپ کے اپنے کلینک کی ایک نرس سے گہرے تعلقات ہیں اور انہی تعلقات کی وجہ سے آپ مجھے طلاق دینا چاہتے ہیں۔"

"شرم نہیں آتی تمہیں......! کچھ شرم کرو......! صدف......! میری بیوی ہو تم......تمہارے بارے میں دنیا کچھ بھی کہے، مجھے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا کرتے ہوئے غیرت آتی ہے۔ کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا ہے تم نے...... میں نے اپنی درخواست میں کوئی نام نہیں لیا۔ حالانکہ مین چاہتا تو بہت سے نام گنوا سکتا تھا اور وہ سب سچ ہوتا۔"

"اور میں نے اپنی درخواست میں جو تحریر کیا ہے، وہ جھوٹ ہے......؟ فرمائیں گے آپ ڈاکٹر صاحب......! کہ زرمین سے...... بلکہ نرس زرمین سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تم جانتی ہو کہ وہ میری کزن ہے۔ میری پھوپھی کی بیٹی......شوہر کے انتقال کے بعد اس کا میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔"

"شوہر کے انتقال سے پہلے بھی اس کا آپ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس بات سے آپ انکار کریں گے......؟"

"تمہیں یہی کہنا چاہئے صدف......! کیونکہ تم جس قدر بگڑ چکی ہو ن کے بعد تمہاری زبان سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔"

"جھوٹ تو نہیں بولا میں نے...... آپ اور زرمین ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، مجھے معلوم ہے۔ آپ کی پھوپھی نے مرنے سے قبل اس کی شادی ایک گھٹیا آدمی سے کر دی تھی اور تم اس وقت اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے اور اس کے لئے تمہیں ایک لمبا وقت درکار تھا۔ کیونکہ تمہاری پھوپھی بستر مرگ پر تھیں اور ہر قیمت پر اپنی بیٹی کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ چنانچہ انہیں جو بھی ملا، انہوں نے اس سے اس کی شادی کر دی۔ لیکن اس نے کبھی شوہر کو شوہر نہیں سمجھا۔ یہاں تک کہ اس غریب کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ یہ تو بظاہر کہا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب......! ورنہ زرمین سے آپ جس قدر قریب تھے اور وہ جس طرح کسی اور کی امانت بن گئی تھی، آپ سے بھلا کہاں برداشت ہو سکتا تھا۔ اور پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ سچ مچ حادثے میں مرا تھا یا...... خیر......! میں کیا کہوں......؟ آپ جیسے اس کی موت کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ آپ نے زرمین کو فوراً بلا لیا۔ پہلے اسے نرسنگ اسکول کے ہاسٹل میں رکھا، نرسنگ کی تعلیم دلوائی کیونکہ مجھ سے شادی کرنے کے بعد آپ اسے بھی صرف ایک نرس کے بھیس میں ہی اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے۔"

ڈاکٹر شیراز گل کے اندر غصے کی جو بھی کیفیت ہو...... لیکن غصے کی

اس کیفیت پر حیرت شدت سے غالب تھی۔ وہ حیرت بھرے انداز میں
صدف کو دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''صدف......! تمہیں یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں......؟''

صدف کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ ابھر آئی۔

''میں نے عرض کیا ناں...... کسی کو اتنا کمزور سمجھ لینا بے وقوفی کی
علامت ہوتی ہے اور پھر آپ کا اعتراف میری کاوشوں کی ضمانت ہے۔''

''میں کوئی اقرار یا اعتراف نہیں کر رہا۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا
ہوں کہ یہ سارے حالات تمہارے علم میں کیسے آئے......؟ اور جہاں تک
میرے اور زرمین کے درمیان تعلقات کا سوال ہے تو میں ہر طرح کی قسم کھا
سکتا ہوں کہ ہمارے جذبے ہر گناہ سے پاک ہیں۔''

''یہ قسمیں تو آپ عدالت کے سامنے کھائیے گا۔ میرا مقصد
درخواست دینے سے صرف اتنا تھا کہ اگر آپ مجھے میرے حقوق سے محروم
کرنے کی کوشش کریں گے اور میرے لئے اُلجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر
دیں گے تو پھر آپ یہ سمجھ لیجئے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر
صاحب......! غور فرمائیے......غور فرمائیے......!'' صدف یہ کہہ کر کمرے کے
اس دروازے سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر دیر تک کمرے کے اس دروازے کو
دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار تھے۔ انہوں نے
سمن تہہ کر کے جیب میں رکھا اور میز پر سے اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئے۔



کلینک میں ابھی نرس زرمین کے سوا اور کوئی نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر
شیراز گل وقت سے کچھ پہلے ہی آجاتے تھے اور پہلا مریض ان کے پہنچنے

کے بعد ہی پہنچتا تھا۔ آج بھی وہ جلد ہی پہنچے تھے۔ ان پر ایک عجیب سی
کیفیت طاری تھی۔ عدالتی سمن ملتے ہی وہ انتہائی پریشان ہوگئے تھے۔ وہ اس
سلسلے میں زرمین سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔

کلینک کے عملے کے دوسرے افراد تھوڑا سا پہلے ہی آجاتے تھے۔
انہی میں زرمین بھی ہوا کرتی تھی اور آج بھی وہ پہلے سے موجود تھی۔

زرمین بھی کچھ دنوں سے ڈاکٹر شیراز گل کو معمول سے زیادہ پریشان
اور فکرمند دیکھ رہی تھی لیکن آج وہ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونک
گئی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کسی نئی فکر نے ڈاکٹر کے اضطراب میں شدت
پیدا کردی ہے۔ وہ ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے ان کے آفس میں چلی آئی۔

''خیریت ہے سر......؟'' اس نے ادب سے پوچھا۔

''نہیں زرمین......! خیریت نہیں ہے۔ ذرا مجھے ایک گلاس پانی
پلاؤ......!'' انہوں نے کہا۔ زرمین تیزی سے الیکٹرک کولر کی جانب بڑھ گئی۔
وہ اپنے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھتی تھی اور اس نے اس وقت بھی ڈاکٹر شیراز گل
کو بڑے احترام سے پانی کا گلاس پیش کیا۔ اس کے چہرے پر سوالیہ نشان
تھا۔ ڈاکٹر نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور پھر بولے۔

''صدف نے عدالت میں ایک جوابی درخواست دی ہے جس میں
بدکرداری کا الزام عائد کرتے ہوئے عدالت سے گزارش کی ہے کہ اسے خلع
کی ڈگری دی جائے اور میری تمام جائیداد اور زر نقد اس کی ملکیت قرار دیئے
جائیں اور سب سے بری بات یہ ہے زرمین......! کہ اس نے تمہارا نام بھی
اس درخواست میں شامل کیا ہے۔''

''مم...... میرا......؟ مم...... مگر کیوں......؟ اوہ...... میرے

خدا......!'' زرمین کی آواز میں شدید گھبراہٹ تھی۔

''وہ جس قدر شاطر عورت ہے، تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ پتا نہیں میری تقدیر کے ستارے اس وقت کس گردش میں تھے جب میری اس سے شادی ہوئی۔''

''مگر اب کیا ہوگا......؟''

''ظاہر ہے...... میں تمہیں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونے کی اجازت تو نہیں دے سکتا۔ بچاؤ کی صرف ایک صورت ہے......؟''

''کیا......؟'' زرمین نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا اور ڈاکٹر شیراز اسے مدہم لہجے میں کچھ سمجھانے لگے۔



صدف کی درخواست کی ابتدائی سماعت کے لئے فیملی کورٹ کا پہلا سیشن ہوا تو معزز عدالت کو بتایا گیا کہ...... اہم گواہ جس کے بیان پر مدعیہ کی درخواست کا دار و مدار ہے، پُراسرار طریقے سے غائب کر دیا گیا ہے۔ اسے ڈاکٹر شیراز گل نے دانستہ کہیں غائب کیا ہے۔ اس لئے اس پر سمن کی تعمیل نہیں کرائی جاسکی۔ چنانچہ یہ عدالت گواہ کی گرفتاری کے لئے وارنٹ جاری کرنے کی اجازت دے اور مدعا علیہ کو حکم دے کہ وہ اگلی پیشی پر گواہ کو عدالت کے سامنے پیش کرے۔

دونوں جانب سے وکلاء نے اس نکتے کے حق میں اور اس کی مخالفت میں بحث کی۔ عدالت نے مزید سماعت کے لئے دوسری تاریخ دی اور مدعا علیہ کو اشارتاً ہدایت کی کہ اگر اسے گواہ کے بارے میں کوئی علم ہے تو اس سمن پر تعمیل کرانے میں تعاون کرے۔

ابھی تک مقامی پریس کو اس نئی درخواست کا علم نہیں تھا۔ سماعت کے بعد جب اس بارے میں ایک مقامی اخباری رپورٹر نے ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو لینا چاہا تو انہوں نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ کل اس بارے میں ایک پریس کانفرنس کریں گے اور تمام واقعات عوام کے سامنے پیش کریں گے۔ مگر وہ کل کبھی نہیں آیا کیونکہ دوسرے دن نادرہ آباد کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک یہ افواہ گردش کر رہی تھی کہ ڈاکٹر شیراز گل پُراسرار طور پر کہیں غائب ہو چکے ہیں۔



زیر سماعت مقدمے کی کئی پیشیوں کے بعد آخر عدالت نے وکیل استغاثہ کے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے مدعا علیہ کی مسلسل غیر حاضری کے باعث مدعیہ کی درخواست اپنے شوہر کی جائیداد اور جملہ املاک پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں منظور کر لی اور خلع یا طلاق کے بارے میں کوئی فیصلہ اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا جب تک کہ پولیس مدعیہ کے شوہر ڈاکٹر شیراز گل کو تلاش کر کے عدالت کے سامنے پیش نہ کر سکے۔ کوئی اپیل کرنے والا یا جوابی کارروائی کرنے والا نہیں تھا۔

چنانچہ صدف نے مکان، کلینک اور بینک بیلنس بغیر کسی دشواری کے حاصل کر لئے اور اس کے فوراً بعد اس نے کلینک اپنے ایک شناسا ڈاکٹر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بینک سے تمام بیلنس نکلوا کر اکاؤنٹ کلوز کر دیا۔ کچھ ہفتوں تک وہ نادرہ آباد میں دیکھی جاتی رہی اور اس کے دوست ہمیشہ اس کے ساتھ نظر آتے رہے۔ انہی دوستوں میں سے ایک دوست ڈاکٹر زمان خان نے وہ کلینک خریدا تھا۔ پھر اس کے بعد خاموشی سے وہ مکان بھی

فروخت کر دیا گیا اور ایک رات اچانک وہ بھی نادرہ آباد سے غائب ہوگئی۔
کہاں......؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔

کچھ عرصے تک اس کا نام مختلف افواہوں کے ساتھ شہر کی فضاؤں میں گونجتا رہا اور آخرکار معمول کے مطابق اسے فراموش کر دیا گیا۔



اس دن نادر ہمدانی، عادل پاشا کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ عادل پاشا نے اسے فون کر کے بلایا تھا اور کہا کہ دوپہر کا کھانا وہ اس کے ساتھ کھائے۔ اس وقت کھانے سے فراغت حاصل کر کے وہ دونوں چائے پی رہے تھے کہ پاشا کے چپڑاسی نے اسے کسی کلائنٹ کی آمد کی خبر دی اور دونوں مستعد ہوگئے۔ آنے والا ایک خوش شکل آدمی تھا۔ اس نے سادہ لباس پہنا ہوا تھا اور چہرے ہی سے پڑھا لکھا اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اندر آکر اس نے سلام کیا تو عادل پاشا اور نادر ہمدانی نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور بیٹھنے کی پیش کش کی۔

''میرا نام فیروز ہے۔ ایک خاص سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ وکیل صاحب......! میری پہلے تو آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن اتنا اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ ہی عادل پاشا ہیں۔'' اس نے عادل پاشا سے کہا۔

''شکریہ فیروز صاحب......! تشریف رکھیئے۔''

''ایک ذاتی مسئلے کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو تھوڑی سی تنہائی عنایت فرما دیں۔''

''آپ یوں سمجھیے کہ ہم تنہا ہی ہیں۔ یہ میرے دست راست ہیں۔''

''نہیں......! ایک کلائنٹ اور وکیل کے درمیان ہونے والی گفتگو میں مداخلت غیر مناسب ہے۔ میں اپنی چائے لے کر دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔'' نادر ہمدانی نے کہا اور چائے کا کپ اٹھا کر دوسرے کمرے کی جانب چل پڑا۔ عادل پاشا نے کہا۔

''جی جناب......! فرمایئے فیروز صاحب......! کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی۔ ویسے میں نے آپ سے غلط نہیں کہا تھا۔ کتنے ہی کانفیڈینشل کیس ہوں، ہمدانی ہی میرے دست راست ہوتے ہیں۔''

''بعد میں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر آپ مناسب سمجھیں گے اور میرا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ اصل میں، میں نے آپ کے بارے میں یہی سنا ہے بلکہ یوں سمجھئے مجھے ایسے ہی کسی وکیل کی تلاش تھی جو صرف دفتر اور عدالت میں میرا ساتھی نہ ہو بلکہ میرا کیس لینے سے پہلے تھوڑا سا کام اور کرے۔

مجھے ایک بہت ہی اہم اور نجی نوعیت کے کام میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ عدالتی کیس ہو لیکن اس سے پہلے میں آپ کو صورتِ حال بتا دینا چاہتا ہوں۔ میرا اصل کام صدف نامی ایک خاتون کی تلاش ہے۔ یہ خاتون آج سے بیس بائیس سال قبل دارالحکومت کے ایک کلب میں موسیقی کے پروگرام پیش کرتی تھی۔ پھر اس نے نادرہ آباد کے ایک ڈاکٹر شیراز گل سے شادی کر لی مگر یہ رشتہ ایک سال سے زیادہ برقرار نہیں رہ سکا۔ ڈاکٹر شیراز گل ایک انتہائی نفیس انسان تھے اور نہ جانے کس طرح صدف کے جال میں گرفتار ہوگئے تھے۔

بہرحال......! ڈاکٹر اس کی آزاد مزاجی اور بے راہ روی سے تنگ

آکر اسے چھوڑ کر چلے گئے اور صدف نے ڈاکٹر کی تمام املاک اور بینک بیلنس پر قبضہ کر لیا اور کچھ دنوں کے بعد اس طرح غائب ہوئی کہ آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا۔''

''ٹھیک ہے...... اب مجھے کیا کرنا ہے......؟''

''میں اس عورت کو تلاش کر کے عدالت کے کٹہرے میں لانا چاہتا ہوں۔ چونکہ آپ ذرا منفرد قسم کے وکیل ہیں، اس لئے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔''

''آپ اسے کیوں تلاش کر کے عدالت تک لانا چاہتے ہیں......؟''

''اس لئے کہ ڈاکٹر شیراز گل میرے بچپن کے دوست ہیں۔''

''گویا آپ اپنے دوست کے لئے یہ کام کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی......!''

''دوسری بات یہ ہے کہ خود ڈاکٹر شیراز آج کل کہاں ہیں......؟''

''افسوس......! میں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو پہلے اس شاطر عورت کو تلاش کر لیں۔ بعد میں آپ سے میں دوسری ذمے داری لینے کی کوشش کروں گا۔ پہلے مرحلے کے لئے آپ جو بھی فیس مقرر کریں گے، میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اور ایک اور درخواست ہے کہ جب تک ہم صدف کو تلاش نہ کر لیں، آپ ڈاکٹر شیراز کے بارے میں کوئی تحقیقات نہیں کریں گے۔'' عادل پاشا سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''حالانکہ بیس بائیس سال تو ایک لمبی مدت ہوتی ہے۔ اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ یہ خاتون مر چکی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ

صدف......''

''اگر ایسا ہے تو آپ کو اس کی موت کا کوئی ثبوت حاصل کرنا ہوگا۔''

''ڈاکٹر شیراز گل سے اس کی کوئی اولاد ہوئی تھی......؟''

''نہیں......!''

''آپ نے بتایا ہے کہ صدف شادی سے پہلے دارالحکومت کے ایک کلب میں اسٹیج پر گاتی تھی۔ اس کلب کا نام کیا تھا......؟''

''جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کا نام گرین اسٹار تھا۔''

''صدف کی کوئی تصویر ہے آپ کے پاس......؟''

''تصویر تو نہیں ہے لیکن وہ بہت خوب صورت تھی۔ کتابی چہرہ، شہابی رنگت، سرخی مائل بال، بھوری آنکھیں، دلکش اور متناسب جسم۔''

''یہ حلیہ تو بہت سی خوب صورت خواتین کا ہو سکتا ہے۔ مزید کوئی اور تفصیل اس کے بارے میں......؟''

''نہیں جانتا...... مجھے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں معلوم۔''

''یہ تو بتا سکتے ہیں آپ کہ نادرہ آباد میں وہ کہاں رہتی تھی......؟''

''ڈاکٹر شیراز کا کلینک ایک مشہور شاہراہ پر تھا اور ان کا مکان وہاں سے کافی دُور تھا۔ میں آپ کو دونوں پتے دے دیتا ہوں لیکن اس وقت جب آپ اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لینے کا وعدہ کریں۔''

''ٹھیک ہے...... لیکن ڈاکٹر شیراز گل کے حوالے سے صدف کے بارے میں تو معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔''

''ہاں......! یہ ضروری ہوگا۔''

''وہ شخص جو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا جیسا کہ میں نے بتایا کہ میرا دست راست ہے اور میرے کیسز کی تحقیقات کے سلسلے میں معلومات وہی کرتا ہے، اس کا نام نادر ہمدانی ہے۔''

''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اگر آپ یہ ذمے داری اپنے شانوں پر لینے کا وعدہ کریں۔''

''ٹھیک ہے...... میں آپ کا یہ کام ضرور کروں گا۔''

''میں آپ کی کیا خدمت کروں......؟''

''وہ بعد میں طے کرلیا جائے گا لیکن ایک بات بتایئے......! آپ سے رابطے کا کیا ذریعہ ہے......؟''

''پلیز......! آپ مجھ سے میرا پتا نہ پوچھیں۔ میں آپ کو خود ہی فون کرتا رہوں گا۔ لیکن آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اس سلسلے میں تمام معاملات خفیہ رہیں گے۔ اور اگر آپ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ احسان نہ صرف مجھ پر بلکہ میرے دوست پر بھی ہوگا۔''

''ٹھیک ہے...... آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کا یہ کیس میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔'' اس شخص کے جانے کے بعد عادل پاشا نے ہمدانی کو طلب کیا اور اسے فیروز سے ہونے والی ساری گفتگو بتانے لگا۔



نادرہ آباد دارالحکومت سے کوئی تین سو میل کے فاصلے پر ایک خوب صورت شہر کی شکل میں ابھرا تھا۔ پہلے اسے ایک شہر نما قصبہ یا قصبہ نما شہر کہا جا سکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا پھیلاؤ بڑھنے لگا اور پھر وہ بڑا شہر بننے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا ہوا یہ شہر اب خاصی اچھی حالت میں تھا۔

پاشا نے ہمدانی کو اپنی کار دے کر یہاں بھیجا تھا۔ ہوٹل نور نادرہ آباد کا سب سے پرانا اور اچھا ہوٹل تھا۔ اس کا منیجر ایک زندہ دل اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس کا نام شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ عام طور سے لوگ اسے ڈیوڈ صاحب کہتے تھے۔ حالانکہ وہ عیسائی نہیں تھا۔ پتا نہیں، اس کا یہ نام کیوں پڑ گیا تھا۔ بہرحال یہاں قیام کے بعد نادر ہمدانی نے سب سے پہلے ڈیوڈ سے ہی رابطہ قائم کیا۔

''نادرہ آباد میرے لئے ایک چھوٹے سے بچے کی طرح ہے جو جوان ہوگیا ہو۔ میں نے اس کا بچپن بھی دیکھا ہے اور جوانی بھی......'' ڈیوڈ صاحب نے محبت بھرے لہجے میں کہا جیسے درحقیقت کوئی کسی کو اپنی اولاد کے بارے میں بتا رہا ہو۔

''مجھے تھوڑی بہت معلومات درکار ہیں ڈیوڈ صاحب......!''

''کہو...... کیا نادرہ آباد کے بارے میں......؟''

''ہاں......! کچھ عرصے پہلے یہاں...... ڈاکٹر شیراز گل نے کلینک کھولا تھا اور اس کے بعد کچھ عجیب وغریب واقعات ہوئے کہ کلینک بھی بند ہوگیا اور ڈاکٹر صاحب بھی لاپتا ہوگئے۔''

''لو...... مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے اس بارے میں...... اور میں تمہیں سچ بتاؤں...... میں نے تو اپنی آنکھوں سے اس عورت کو بھی دیکھا ہے جس کا نام صدف تھا۔ بہت سی ایسی باتیں مجھے اس کے بارے میں معلوم ہیں جو شاید کسی اور کو نہیں معلوم ہیں۔'' ڈیوڈ صاحب نے اعتماد سے کہا۔

''لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوا......؟ وہ کہاں چلی گئی اور اب کہاں ہے......؟''

''صرف ایک آدمی بتا سکتا ہے تمہیں اس کے بارے میں.....''

''کون.....؟''

''ڈاکٹر زمان خان جنہوں نے یہ کلینک خریدا تھا اور وہ اس کے بہت قریبی دوست تھے۔ اب بھی وہ کلینک چلا رہے ہیں جس میں کبھی ڈاکٹر شیراز بیٹھا کرتے تھے۔''

''اچھا..... بہت بہت شکریہ ڈیوڈ صاحب.....!''

''لیکن تم اس کے بارے میں کیوں معلوم کر رہے ہو.....؟''

''بس..... کچھ ایسے ہی معاملات ہیں کہ میں ان واقعات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

آخر کار نادر ہمدانی اس پتے پر پہنچا جو اسے ڈیوڈ سے معلوم ہوا تھا اور یہاں اس کی ملاقات ایک خوب صورت لڑکی سے ہوئی، اس کا نام نورالعین تھا۔

''ہم نے اس کلینک کے پچھلے حصے میں تھوڑی سی زمین خرید کر اپنا گھر بنا لیا ہے۔ وہ وہیں پر رہتے ہیں لیکن عام طور سے کسی سے نہیں ملتے۔'' نورالعین نے بتایا۔

''کیا مطلب.....؟ کلینک تو قائم ہے، کیا یہاں کوئی مریض نہیں آتا.....؟''

''کہاں آتے ہیں، یہ کلینک اب نہیں چلتا۔ نزلہ، زکام، کھانسی، بخار کے مریض کبھی کبھی آجاتے ہیں تو میں ہی انہیں دوا دیتی ہوں۔ ویسے آپ مجھے بتایئے آپ کو کیا تکلیف ہے.....؟''

''نہیں.....! مجھے کچھ ذاتی کام ہے۔'' ہمدانی نے کہا۔

''بتایئے.....! شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔''

نادر ہمدانی نے اس لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا پھر بولا۔

''تقریباً بیس سال پہلے اس جگہ ڈاکٹر شیراز گل پریکٹس کیا کرتے تھے۔''

''اوہو..... کہیں آپ ان کی بیگم صدف کے بارے میں معلوم کرنے تو نہیں آئے.....؟''

''اوہ..... بڑی باکمال شخصیت ہیں آپ مس نورالعین.....! یہ اندازہ آپ کو کس طرح ہوا.....؟''

''اس لئے کہ پہلے دو افراد اور بھی اس سلسلے میں آ چکے ہیں۔'' نورالعین نے بتایا۔

''اس زمانے میں میں بہت چھوٹی تھی مگر مجھے اب بھی تھوڑا بہت یاد ہے کہ لوگ صدف کے بارے میں بہت باتیں بتایا کرتے تھے۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی، وہ یہ کہ ان واقعات کو تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں۔ اب اچانک یہ سلسلہ پھر سے کیوں جاگ اُٹھا ہے.....؟''

''وہ دو افراد کون تھے جو مجھ سے پہل صدف کے بارے میں پوچھ رہے تھے.....؟''

''آیئے بیٹھئے.....! آپ کو کوئی کام تو نہیں ہے یہاں..... میں بھی بس اپنی زندگی بیکار گزار رہی ہوں۔ دراصل جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں ڈاکٹر زمان خان کی بھتیجی ہوں۔ میرے والدین مر چکے ہیں اور میں زمان انکل کے ساتھ رہتی ہوں۔ نہ ان کے پاس کوئی مریض آتا ہے نہ ہی ہمارے حالات میں کوئی بہتری پیدا ہوتی ہے۔ میں ہر شخص سے اچھے اخلاق کے

ساتھ ملتی ہوں کہ ہو سکتا ہے کوئی میرے لئے نوکری وغیرہ کا بندوبست کر دے۔ آیئے......! میں آپ کو چائے پلاؤں۔ تھوڑا سا مکھن آپ کو بھی لگا دیتی ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ ہی میرے بارے میں کسی اچھے انداز میں سوچ لیں۔'' نورالعین بے تکلف سی لڑکی تھی۔ اس سے مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے نادر ہمدانی نے اس کی چائے کی دعوت قبول کر لی اور نورالعین نے ایک معمولی سے کمرے میں قدیم طرز کے صوفے پر اسے بٹھایا اور بولی۔

''بس .... چائے لانے میں ذرا دیر لگے گی، میں ابھی لائی۔''

نادر ہمدانی اس دلچسپ صورت حال کے بارے میں غور کرنے لگا۔

واقعی یہ بات قابل غور تھی کہ اگر ڈاکٹر شیراز اور صدف کے معاملات کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے تو اس کے بعد یہ صورت حال کیوں پیدا ہوئی ہے۔ وہ شخص جو فیروز خان کے نام سے عادل پاشا سے ملا، کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ یہ واقعات خاصے سنسنی خیز تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک کرائم رپورٹر کی حیثیت سے نادر ہمدانی بہت سے معاملات کی اسی انداز میں تحقیقات کر چکا تھا لیکن یہ کیس اسے کافی دلچسپ لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد نورالعین چائے لے کر آ گئی۔ چائے واقعی بہت عمدہ تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اتنی اچھی چائے کے بدلے میں آپ کی کیا خدمت کر سکوں گا۔'' نادر ہمدانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے۔ میرا نام نورالعین ہے۔ ڈاکٹر زمان خان صاحب کی بھتیجی ہوں۔ جن کا کلینک بالکل نہیں چلتا۔ ایک طرح سے ان کلینک میں ڈاکٹر اور نرس دونوں کے فرائض سرانجام دیتی ہوں۔ تھوڑی بہت

دواؤں کے بارے میں معلومات ہیں جو نزلہ، زکام اور بخار کے سلسلے میں دی جاتی ہیں۔ اب چونکہ مریض ہی نہیں آتے اور یہاں نادرہ آباد میں ملازمت کے زیادہ مواقع ہیں نہیں، اس لئے کسی اہل دل کی تلاش میں ہوں جو دارالحکومت میں میرے لئے کسی نوکری کا بندوبست کر دے۔

کہنے میں کیا حرج ہے۔ اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اب پتا نہیں آپ کے سینے میں دل کی کیا کیفیت ہے۔ میرا مطلب ہے، وہ اہل دل آپ ہو سکتے ہیں یا نہیں......!'' نورالعین نے دلچسپی سے باتیں کرتے ہوئے کہا اور چائے کے گھونٹ لینے لگی۔

''مس نورالعین......! بڑی توقع ہو گئی ہے مجھے آپ سے کہ آپ میری معلومات میں اضافہ کریں گی۔''

''اصولی طور پر مجھے یہ پوچھنا چاہئے جناب......! کہ بیس سال کے بعد اچانک زندہ ہو جانے والے یہ مردے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور اچانک ان میں جان کیسے پڑ گئی......؟ اگر بتانا پسند کریں تو بتا دیں...... البتہ نام ضرور بتا دینا چاہئے تھا آپ کو اپنا۔''

''میرا نام نادر ہمدانی ہے۔'' نادر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شکریہ......!'' عینی بھی جواباً ہنسنے لگی پھر بولی۔

''آپ پوچھ رہے تھے کہ وہ دونوں کون تھے جو یہاں پہلے آئے تھے۔ انہوں نے اپنا نام احمد یار بتایا تھا۔ دبلے پتلے اور لمبے قد کے مالک تھے۔ رنگ سانولا تھا۔ ضرورت سے زیادہ چالاک ظاہر کر رہے تھے اپنے آپ کو...... اور مجھے تو یوں لگا جیسے انہوں نے اپنا نام بھی غلط بتایا ہو۔

بہر حال...... کچھ ایسی شخصیت تھی ان کی جس سے بلاوجہ چڑ ہو جاتی

ہے۔ میں انہیں کوئی خاص بات نہیں بتا سکی تھی۔

انہوں نے جس طرح کے سوالات کئے تھے اس کے بعد میرے دل میں بھی ذرا تجسس سا جاگ اٹھا اور میں نے مختلف ذرائع سے صدف کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ خود میرے انکل یعنی زمان خان صاحب تھے۔

میں نے معلومات کیں تو پتا چلا کہ زمان خان بھی صدف کے چاہنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ میرے اور انکل کے درمیان احترام کا رشتہ ہے لیکن میں نے دبے الفاظ میں ان سے صدف کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔'' نورالعین مسکرا کر بولی۔

''اور مس عینی...... ! آپ نے ایک دوسری شخصیت کا بھی ذکر کیا تھا، وہ کون تھا......؟''

''وہ تھا نہیں بلکہ تھی...... ایک خاصی خوب صورت عورت جس نے اپنا نام فرزانہ بتایا تھا۔ ویسے وہ بھی نوجوان تھی اور اس کی عمر تقریباً پچیس سال کی تھی لیکن ایک نگاہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا کہ میرے پاس آنے سے پہلے وہ بہت سے لوگوں سے ملاقات کر چکی تھی اور وہ اپنے آپ کو صدف کی بھانجی بتاتی تھی۔

اس نے کہا تھا کہ اس کی والدہ جو صدف کی بڑی بہن تھیں، کچھ عرصے قبل انتقال کر گئی تھیں اور انہوں نے اپنی وصیت میں اپنی بہن کے لئے کچھ جائیداد اور روپیہ چھوڑا ہے۔ وہ حق دار کو اس کا حق پہنچانے کے لئے اپنی خالہ کو تلاش کر رہی ہے اور چونکہ اسے اپنی خالہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم اور نہ ہی ان کی کوئی تصویر اس کے پاس ہے، اس لئے جو کوئی ان کے

بارے میں معلومات فراہم کرے گا یا اگر کسی کے پاس صدف کی کوئی تصویر بھی ہے تو وہ معقول معاوضے پر اس سے خریدنے کے لئے تیار ہے۔

میں نے جب یہ بات سنی تو اس سے رابطے کی کوشش کرنے لگی اور جب وہ کچھ اشارے ملنے پر میرے پاس آئی تو سب سے پہلے اس نے انکل زمان سے ملنے پر اصرار کیا۔ کچھ ملنے والوں نے اسے بتایا تھا کہ زمان صاحب سے صدف کے گہرے تعلقات رہ چکے ہیں۔

جب میں نے انکل کو اس کی آمد کی خبر دی تو انہوں نے انتہائی سختی سے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ فرزانہ کوشش کرتی رہی۔ اس نے مجھے بھی کریدنا چاہا۔ میں نے اسے چائے پینے کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی لیکن بہرحال میں نے موقع نکال لیا اور تھوڑی سی دیر کے لئے جب وہ واش روم گئی تو میں نے اس کے ہینڈ بیگ کی تلاشی لی اور کئی کارآمد باتیں معلوم کر لیں۔'' نورالعین نے بچوں کی طرح بتایا تو نادر ہمدانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ عینی کی باتیں سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

''ویری گڈ...... ! آپ تو بہت ذہین خاتون ہیں مس عینی...... !''

''وہی تو میں کہہ رہی تھی کہ یہاں نادرہ آباد میں میری شخصیت ضائع ہو رہی ہے۔ بحالت مجبوری انکل کے کلینک میں پڑی ہوئی ہوں جہاں نہ کوئی مریض آتا ہے نہ کوئی اور...... بس مکھیوں کی تعداد یہاں کافی ہے جن میں سے بہت سی مکھیوں کو میں نے کم کر دیا ہے۔ اب بتائیے ناں...... خالی بیٹھا ہوا انسان کیا کرے......؟'' وہ بولی اور ہنس پڑی۔ نادر ہمدانی اس کے آگے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر جب وہ دوسرے معاملات میں کھو گئی تو اس نے کہا۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ ہینڈ بیگ سے ایسی کون سی چیز برآمد ہوئی جس سے آپ کو کچھ کارآمد باتیں معلوم ہوئیں......؟''

''ہاں...... سب سے پہلی بات یہ کہ فرزانہ بیگم کا پورا نام فرزانہ اسلام ہے اور وہ دارالحکومت کے ایک کلب میں ملازمت کرتی ہے۔ یہ باتیں مجھے اس کے ہینڈ بیگ سے ملنے والے وزیٹنگ کارڈ سے معلوم ہوئیں۔ ان میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ بھی تھا جس میں بڑی خراب انگریزی میں کسی پولیس انسپکٹر کا نام اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔''

''پولیس انسپکٹر......؟'' نادر ہمدانی نے چونک کر کہا۔

''ہاں...... مجھے بھی بڑی حیرت ہوئی تھی اور اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ صدف کی تلاش کے پیچھے ضرور کوئی خاص راز پوشیدہ ہے۔ ورنہ پولیس کو اس سے اتنی دلچسپی نہ ہوتی۔ میرا تو خیال تھا کہ پولیس انسپکٹر نے ہی فرزانہ کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ضرور کوئی ایسا گہرا معاملہ تھا جس میں پولیس براہِ راست سامنے نہیں آنا چاہتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرزانہ یہ وزیٹنگ کارڈ خود کسی کو دھوکا دینے کے لئے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتی ہو اور خود اس کا تعلق پولیس سے ہو۔''

''ویری گڈ......! آپ واقعی بہت ذہین ہیں عینی......! اب مجھے اس بات کا بھرپور طریقے سے یقین ہوگیا ہے۔'' عینی انکساری سے ہنسنے لگی۔ نادر ہمدانی نے کہا۔

''آپ نے مجھے اس پولیس انسپکٹر کا نام نہیں بتایا......؟''

''جی ہاں...... وہ ذرا ایسا ہی مٹاٹا سا تھا۔ پھر بھی شاید اس کا نام ایل اور این سے ہو، ایسے ہی کچھ پڑھنے میں آرہا تھا۔''

''اور آپ کو بیگ میں فرزانہ کا پتا نہیں ملا......؟''

''ہاں...... ملا تھا۔ کارڈ میں اس کے گھر کا پتا بھی لکھا تھا۔ وہ نیو گیریژن ٹاؤن کے فلیٹ نمبر اٹھائیس میں رہتی ہے۔ یہی پتا لکھا ہوا تھا۔''

چند رسمی باتیں کرنے کے بعد ہمدانی وہاں سے اٹھ گیا۔

اسے جو معلومات عینی سے حاصل ہوئی تھیں، وہ خاصی دلچسپ تھیں اور وہ ان کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ زمان خان جو اس کے لئے ایک کارآمد شخصیت ثابت ہوسکتا تھا، کیا ہی دلچسپ بات تھی کہ بیس سال کے بعد ایک ایسا کیس اچانک نمودار ہوگیا جس میں بہت سے لوگ ملوث تھے۔

اب پتا نہیں کون کس چکر میں تھا۔ اس کا اندازہ تو فوری طور پر نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

بہرحال...... وہ اپنی کار تک پہنچا تھا کہ اچانک ہی عقب سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس کا کالر پکڑ لیا۔ نادر ہمدانی ایک دم پلٹا تو اس شخص نے اس کی گردن اپنے چوڑے ہاتھوں میں جکڑ لی۔

''جو کچھ تم کر رہے ہو وہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو......؟ سنو......! جان کی سلامتی چاہتے ہو تو فوراً نادرہ آباد چھوڑ کر چلے جاؤ۔'' نادر ہمدانی نے بمشکل تمام اس کی کلائی سے اپنی گردن چھڑائی۔ وہ شخص ڈیل ڈول میں ہمدانی سے دُگنا تھا اور چہرے ہی سے بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے اور اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو تم کیا کرلو گے......؟'' ہمدانی یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ اس شخص نے ہاتھ میں تانبے کا کلپ پہن رکھا ہے۔

"میں جو کچھ کروں گا، اس کا نمونہ دیکھ لو...... اس کے بعد غور کرنا۔"

یہ کہہ کر اس نے پیچھے ہٹ کر ہمدانی پر وار کیا۔ ہمدانی کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ضرب اس قدر شدید ہوگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور کچھ ہی لمحوں بعد وہ لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بل نیچے آ رہا۔ اس کے ہوش وحواس گہری تاریکیوں میں ڈوبتے چلے گئے۔

نہ جانے کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تھا۔ اس وقت وہ کار کے اندر سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے ایک سسکاری سی لی اور بدن کو تھوڑا سا کھسکا کر بیٹھ گیا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے سر کی چوٹ پر ہاتھ پھیرا۔ شکر ہے، خون نہیں نکلا تھا۔ البتہ چوٹ کی جگہ ایک گومڑا ابھرا ہوا تھا۔

اس سے پہلے کبھی اس نے اس طرح چوٹ نہیں کھائی تھی۔ اجنبی نے جو کچھ کیا تھا، غیر متوقع طور پر کیا تھا مگر کیوں؟ وہ اس کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ ونڈ اسکرین کے اس پار دیکھ رہا تھا۔ کوئی بہت ہی خاص بات تھی جس نے اس کی یہ کیفیت کر دی تھی۔

شاید سر پر پڑنے والی چوٹ نے یادداشت کے کسی خانے کو کھول دیا تھا۔ حالانکہ وہ شخص جب سامنے آیا تھا، اس وقت اس کے ذہن میں اس سے شناسائی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ لیکن اب اسے یاد آیا کہ اس نے دارالحکومت میں اس شخص کو پولیس آفس میں دیکھا تھا اور اس کے جسم پر پولیس کی وردی تھی۔ یہ بات اسے اسی وقت یاد آئی تھی اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اسے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ اس شخص کا تعلق

پولیس ہی سے ہے لیکن پولیس کے کسی فرد کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس سے کہے کہ وہ اپنی تحقیقات بند کر کے واپس چلا جائے؟ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

بہرحال...... وہ کرائم رپورٹر تھا۔ جرائم کی کوریج کرنا اس کا کام تھا اور اس سلسلے میں اس کا واسطہ کافی خطرناک لوگوں سے پڑ چکا تھا۔ اسے جس طرح مجرموں کے عادات و اطوار کا پتا تھا، اسی طرح اسے پولیس والوں کے ہتھکنڈوں کا بھی پتا تھا۔ وہ کسی کے کہنے سے اس طرح تو واپس جا نہیں سکتا تھا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس شخص نے اس معاملے میں مداخلت کر کے اس کے ذہن کے بہت سے خانے کھول دیئے تھے اور وہ اب زیادہ بہتر طریقے سے کام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اچھی طرح اپنے آپ کو سنبھال کر اس نے کار اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔

ہوٹل کے کمرے کے اندر داخل ہوا تو ایک لمحے میں اس کو احساس ہوگیا کہ اس کے سامان کی تلاشی لی گئی ہے۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان چیک کیا لیکن اس میں سے کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا۔ کوئی ہے جو اسے اس کام سے روکنا چاہتا ہے۔ ابھی تو کئی کام اسے کرنے تھے۔ ڈاکٹر زمان خان سے ملنا تھا اور خصوصی طور پر یہاں کے پولیس اسٹیشن کا بھی جائزہ لینا تھا۔

اپنے طور پر اس نے جو معلومات حاصل کیں، وہ بہت ہی دلچسپ تھیں۔ اسے اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی کہ کسی نے اسے یہاں سے جانے کے لئے کہا ہے اور اس پر حملہ بھی کیا ہے۔

بہرحال...... اسے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ تقریباً

پچیس سال پہلے ڈاکٹر شیراز گل نے ایک فزیشن اور سرجن کی حیثیت سے اپنا رجسٹریشن کرایا تھا۔ اس کے ساتھ سال بعد انہوں نے درخواست دی کہ ان کا اصل نام جو ان کے والدین نے رکھا تھا اور جس کے ثبوت میں وہ اپنا برتھ سٹیفکیٹ بھی پیش کر رہے ہیں، اصل میں عثمان شاہ ہے لیکن والد کے انتقال کے بعد جب وہ آٹھویں کلاس میں تھے، انہوں نے اپنا نام تبدیل کیا تھا اور اس کی اطلاع اخبار میں بھی دی تھی۔

انہوں نے اپنا نام شیراز گل رکھا اور یہی نام بعد میں میٹرک کی سند اور ایم بی بی ایس کی ڈگری پر درج کیا گیا لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے والد نے کچھ جائیداد چھوڑی ہے جو ان کی وصیت کے مطابق ان کے بیٹے عثمان شاہ کو ملتی تھی چونکہ ڈاکٹر شیراز گل نے اپنا نام تبدیل کر لیا تھا، اس لئے اس جائیداد پر دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس خیال سے کہ انہیں والدین کا رکھا ہوا نام ہی برقرار رکھنا چاہئے۔ وہ اپنی اس غلطی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔

اس سلسلے میں میٹرک اور ایم بی بی ایس کی سند میں تصحیح کرانے کے بعد ڈاکٹر شیراز گل کی یہ درخواست منظور ہوگئی۔ چنانچہ سرکاری کاغذات میں ڈاکٹر شیراز کا نام عثمان شاہ ہی تھا۔ گویا ڈاکٹر شیراز گل، نادرہ آباد چھوڑ کر اگر چلا گیا ہے تو بڑے اطمینان سے ایک نئے نام سے اپنی پریکٹس جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ تمام معلومات لے کر وہ عادل پاشا کے پاس پہنچا۔

''کافی چاق و چوبند نظر آ رہے ہو۔ کیا رپورٹ ہے.....؟'' جواب میں ہمدانی نے اسے پوری تفصیل بتائی اور عادل پاشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کمال ہے..... میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلے میں کوئی مقدمے باز

ہوگی اور کیس میرے پاس آئے گا۔ یہ تو اصل میں تمہارا ہی کام تھا جو تم نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

بہرحال..... فیروز خان نے مجھ سے رابطہ قائم کیا ہے، میرا خیال ہے میں اسے یقینی طور پر ایک بہترین رپورٹ پیش کر سکوں گا۔ چنانچہ اب دو پوائنٹ ہیں ہمارے پاس۔ نمبر ایک یہ کہ کیا عثمان شاہ یا سابقہ ڈاکٹر شیراز گل زندہ ہے اور اس نے اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد اور روپوش ہونے کے بعد کہیں اور رہائش اختیار کر لی ہے یا پھر صدف نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ اصل کام تو صدف کی تلاش تھا اور میرا خیال ہے کہ تم خاصی محنت سے آگے بڑھ رہے ہو۔ اب کیا ارادہ ہے.....؟''

''میری نادرہ آباد واپسی بہت ضروری ہے۔ ابھی اس لئے آ گیا تھا کہ آپ کو کار کی ضرورت ہوگی اگر آپ چاہیں.....''

''نہیں نہیں.....! تم اپنی تفتیش جاری رکھو..... کم از کم اس کیس میں میری ٹانگ یا پھر میری کار پھنسی رہے گی۔'' عادل پاشا نے ہنس کر کہا اور ہمدانی نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اپنی قیمتی کار اسے دے رکھی ہے۔

ایک بار پھر نادر ہمدانی کو نادرہ آباد واپس آنا پڑا۔ قیام کے لئے وہی ایک ہوٹل تھا جو اب نادرہ آباد میں رہنے کے قابل رہ گیا تھا۔ چھوٹے موٹے کئی ہوٹل وہاں موجود تھے لیکن جو اچھے اور صاحب حیثیت لوگ تھے، وہ اسی ہوٹل میں آ کر قیام کیا کرتے تھے اور دوسری بار بھی ہمدانی نے اسی ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا تھا۔

اس کے علاوہ ڈیوڈ صاحب بھی اس کے لئے دلچسپی کا باعث تھے کیونکہ ڈیوڈ صاحب نے اسے خاصی معلومات فراہم کی تھیں۔ ہوٹل میں آنے

کے بعد اس نے ڈیوڈ صاحب سے ملنے کی کوشش کی تو کاؤنٹر کلرک نے اسے بتایا کہ پرسوں رات ڈیوڈ صاحب تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہوٹل سے پیدل اپنے گھر واپس جا رہے تھے کہ کچھ غنڈوں نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں اچھی طرح مار پیٹ کر فرار ہو گئے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت ڈیوڈ صاحب کی جیب میں اچھی خاصی رقم موجود تھی مگر انہوں نے رقم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ڈیوڈ صاحب کے کافی چوٹیں آئی تھیں اور وہ ہسپتال میں تھے۔ ہمدانی سیدھا اسپتال پہنچا اور اس نے ڈیوڈ صاحب سے بات کی۔

''آپ کی تو میرے خیال میں کسی سے کوئی دُشمنی بھی نہیں۔''

''میں خود حیران ہوں۔ میری زندگی میں یہ پہلا تجربہ ہے کہ مجھ پر اس طرح حملہ کیا گیا اور میں نہیں جانتا کہ وہ غنڈے کون تھے۔ تم یقین کرو، یہاں نادرہ آباد میں تقریباً چالیس سال سے رہتا ہوں اور میری کسی سے کوئی دُشمنی نہیں ہے۔''

''کیا آپ نے پولیس میں رپورٹ درج کرا دی ہے......؟''

''ہاں...... ظاہر ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا مجھے کسی پر شبہ ہے مگر مجھے کس پر شبہ ہو سکتا تھا اور میں اندھیرے میں کسی کو پہچان بھی نہیں سکا تھا۔''

کافی دیر تک وہ ڈیوڈ صاحب کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہا لیکن کوئی ایسی بات پتا نہ چل سکی جس سے معاملات پر کچھ روشنی پڑتی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈاکٹر زمان خان سے ملاقات کرے۔ کچھ ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو اور اس کے ہر قدم

ے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جب وہ ڈاکٹر زمان خان کے کلینک پہنچا تو اس کی ملاقات عینی سے ہوئی۔ اسے دیکھ کر وہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔

''کہاں چلے گئے تھے آپ...... اور اگر گئے ہی تھے تو مجھے بتا کر کیوں نہیں گئے......؟''

''بس کچھ ضرورت پیش آ گئی تھی اس لئے چلا گیا۔''

''آپ کو معلوم ہے، کیا ہوا ہے......؟'' عینی نے بچوں کے انداز ں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''خیریت......! کیا ہوا ہے......؟''

''گڈ......! اس کا مطلب ہے کہ اتنی بڑی اطلاع میں ہی آپ کو وں گی۔''

''کتنی بڑی اطلاع ہے عینی......! آپ تو مجھے پہیلیاں بجھوا رہی ں۔''

''جناب عالی......! محترمہ صدف صاحبہ نادرہ آباد پہنچ چکی ہیں۔''

''کیا......؟'' ہمدانی حیرت سے اچھل پڑا۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا......؟''

''بس...... ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں...... کیا سمجھے آپ......؟''

''وہ تو خیر میں مانتا ہوں اس بات کو لیکن خاتون کہاں ہیں......؟''

''ہوٹل میں ٹھہری ہیں۔'' عینی نے اسی ہوٹل کے بارے میں بتایا ل میں خود ہمدانی کا قیام تھا۔ یہ مزید حیرانی کی بات تھی، ہمدانی تھوڑی دیر ں سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔

"واقعی آپ کسی سے کم نہیں ہیں...... مس عینی......! کیا آپ کو پتا چلا کہ محترمہ یہاں دوبارہ کیوں آئی ہیں......؟ اور اتنے عرصے کے بعد......"

"جی جناب......! بڑی معلومات حاصل کی ہیں میں نے......اور چالاکی میں تو میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ میں نے بڑے طریقے سے معلومات حاصل کی ہیں۔ بہت سے ذرائع ہیں میرے پاس اور ویسے بھی صدف صاحبہ نے اپنی آمد کو راز نہیں رکھا۔ کچھ لوگوں نے ان سے سوالات کئے تو انہوں نے بتایا کہ بیس سال پہلے انہوں نے اپنے شوہر ڈاکٹر شیراز گل کے خلاف خلع کی جو درخواست دی تھی، وہ اسے واپس لینے آئی ہیں۔

انہوں نے واپس آتے ہی نادرہ آباد کا ایک مشہور وکیل کرلیا ہے۔ وکیل صاحب نے کل ہی فیملی کورٹ میں مقدمہ واپس لینے کی درخواست دی ہے۔ عام خیال ہے کہ کیونکہ معاملہ بیس برس سے التواء میں پڑا ہوا تھا اس لئے عدالت خوشی سے اسے ختم کرنے کی اجازت دے دے گی۔ ویسے بھی ان کاغذات کا اب کوئی پتہ نہیں ہوگا...... ہوں گے کسی فائل کیبنٹ میں۔"

"ویری گڈ......! ویری گڈ......! اچھا......ایک بات بتایئے......! کیا ڈاکٹر زمان کو بھی اس بارے میں علم ہو چکا ہے......؟"

"میں نے ہی بتایا تھا۔" عینی نے کہا تو نادر ہمدانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ یہ عینی واقعی کمال کی لڑکی تھی۔

"پھر ان کا کیا ردِعمل ہوا......؟"

"حیرت انگیز...... وہ بہت ہی کم اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہیں لیکن وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ بیٹا......! میں دو چار دن کے لئے باہر جا رہا ہوں اور اس کے بعد چلے گئے اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔ کوئی

سامان وغیرہ بھی لے کر نہیں گئے۔"

"ایک بات بتایئے مس عینی......! کیا آپ نے محترمہ صدف سے ملاقات کی ہے......؟"

"لیجئے...... جان نہ پہچان...... بڑی خالہ سلام...... میں کیسے ملاقات کرتی......؟ البتہ یہ ضرور معلوم ہوا ہے وہ بہت بدل گئی ہیں۔ پہلے دبلی پتلی ہوا کرتی تھیں، اب بے حد موٹی ہوگئی ہیں۔ چہرہ پھول گیا ہے۔ کمر تک لمبی چوٹی کی جگہ کٹے ہوئے بال اور نظر کمزور ہوگئی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا تھا میرے مخبر نے کہ جس دن وہ آئی تھیں، اسی دن ان کا چشمہ گر گیا تھا۔ چنانچہ آنکھوں کی تکلیف سے بچنے کے لئے ہر وقت گہرے سبز رنگ کے شیشوں کی عینک لگائے رکھتی ہیں۔ ان کے ایک دو جاننے والے گئے تھے تو بہت اخلاق سے پیش آئیں۔"

"بھئی......آپ کا مخبر تو کمال کا ہے۔ بڑی دلچسپ باتیں بتائی ہیں اس نے۔"

"اچھا چلئے چھوڑیئے......! ہمیں کیا لینا دینا......مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ اپنا وعدہ پورا کرنے کی کوشش کریں گے......؟ اب دیکھئے ناں......! میں آپ کے لئے کتنی محنت کر رہی ہوں۔"

"میرا وعدہ......؟"

"آپ نے کہا تھا ناں کہ مجھے دارالحکومت میں کوئی نوکری دلا دیں گے......؟"

"ہاں......! یہ میرا وعدہ ہے، ذرا اس مسئلے کو حل ہو جائے دیجئے۔ شکریہ عینی......! مجھے امید نہیں تھی کہ تم میرے لئے اس قدر کارآمد ثابت

ہوگی۔'' نادر ہمدانی نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

ہوٹل تک سفر کے دوران اس کا ذہن مختلف خیالات کا شکار رہا۔ عزیز
کا مخبر کون ہوسکتا تھا؟ وہ جس قدر معصوم نظر آنے کی کوشش کر رہی ہے، اتنی
معصوم بھی ہے کہ نہیں؟ ڈاکٹر زمان خان، صدف کی آمد کے بارے میں سنتے
ہی کہاں غائب ہوگیا؟ بہت سی باتیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔

کار ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کر کے اس نے صدف کے کمرے
کے بارے میں معلوم کیا اور پھر اس کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دستک
دی تو اندر سے آواز آئی۔

''آؤ...... کون ہے......؟'' وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا
سامنے صوفے پر ایک پختہ عمر کی عورت جس کے جسم کو موٹاپے نے بھدا کر دیا
تھا، سبز رنگ کا چشمہ لگائے بیٹھی تھی۔ کٹے ہوئے بال...... جن میں کہیں کہیں
سفید جھلک رہی تھی، شانوں تک آ رہے تھے۔ اس نے سفید ساڑھی باندھ
رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر گوشت کی مقدار زیادہ تھی لیکن چہرے کے نقوش
اب بھی یہی بتا رہے تھے کہ ماضی میں وہ کافی خوب صورت رہی ہوگی
عورت نے کسی قدر تند نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔

''تم کون ہو......؟ میں تو سمجھی تھی کہ ویٹر آیا ہے۔''

''وہ دراصل میڈم...... میں ایک اخبار کا نمائندہ ہوں۔ آپ
انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ آپ صدف شیراز گل ہیں ناں......؟''

''ہاں......! میں وہی ہوں لیکن تمہیں کس نے کہہ دیا کہ میں تمہیں
کوئی انٹرویو دوں گی......؟ اور کسی اخبار کو مجھ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے......؟''

''آپ معمولی خاتون تو نہیں ہیں میڈم......! ایک زمانے میں آپ

ایک انتہائی ممتاز فنکارہ رہ چکی ہیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر شیراز سے
شادی کرنے کے بعد آپ یہاں کی اعلیٰ سوسائٹی کی روح رواں تھیں۔ پھر
جن حالات میں آپ نے ڈاکٹر صاحب سے خلع حاصل کرنے کے لئے
عدالتی چارہ جوئی کی اور اس کے بعد جس طرح آپ اور ڈاکٹر صاحب خود
عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے تو فطری طور پر آپ کی شخصیت نے بہت
بڑی حیثیت اختیار کر لی۔ اصل میں آپ کو پتا ہے کہ لوگ حقیقی زندگی کی
کہانیوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔
میڈم......! آپ نیوز ویلیو رکھتی ہیں۔''

''سوری......! میں معذرت خواہ ہوں۔'' وہ بولی۔

''اور اب تو میں بالکل ہی عجیب سی کیفیت کا شکار ہوں کیونکہ میری
نظر کا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔ مجھے تو تمہاری صورت تک صاف نظر نہیں آ رہی۔''

''ایسی باتیں کر کے آپ میرا دل دکھا رہی ہیں کیونکہ میں اس طرح
کے لوگوں کی بہت قدر کرتا ہوں جو اس قدر ویلیو رکھتے ہیں۔'' ہمدانی نے کچھ
اس انداز میں کہا کہ عورت کے چہرے کے نقوش متاثر ہونے لگے اور اس
نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم جو سوالات کرنا چاہتے ہو جلدی کر لو۔ میں نے
اپنے وکیل کو بلایا ہے، وہ آتے ہی ہوں گے۔ مجھے ان کے ساتھ جانا ہے۔''

''میرا سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آپ نے اچانک نادرہ آباد
کیوں چھوڑ دیا......؟''

''وجہ تو صاف ہے۔ اختلافات کے باوجود مجھے اپنے شوہر سے
بہت محبت تھی اور اب بھی ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو بھی سلوک کیا، وہ

یک الگ بات ہے لیکن ان کے بغیر میری زندگی زخم بن گئی تھی اور ان کے
جانے کے بعد میرا دل بھی اس شہر میں نہیں لگا۔"

"یہ طویل عرصہ یعنی بیس برس آپ نے کہاں گزارے......؟"

"بس مختلف شہروں میں...... اور حقیقت یہ ہے کہ میں بھی جگہ جگہ
ڈاکٹر شیراز کو تلاش کر رہی تھی۔ جہاں بھی ان کی موجودگی کی اطلاع ملتی، میں
وہاں پہنچ جاتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ ڈاکٹر شیراز گل کے بغیر میں اس ادھوری
زندگی کو مکمل نہیں کر سکتی۔"

"تو کیا وہ آپ کو ملے......؟"

"نہیں......! میں آج تک ان کی تلاش میں ہوں۔ میرا دل کہتا ہے
کہ وہ زندہ ہیں اور کبھی نہ کبھی انہیں ضرور پالوں گی۔"

"اتنے عرصے کے بعد آپ نے نادرہ آباد کا رخ کیوں کیا......؟"

"دونوں ہی باتیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ شاید ڈاکٹر شیراز کو بھی
نادرہ آباد یاد آجائے اور وہ یہاں واپس آجائیں۔ اس کے علاوہ وہ
درخواست بھی واپس لینی تھی جو میں نے غصے میں محض ایک جوابی کارروائی کی
حیثیت سے دی تھی۔ ورنہ سچ مچ میں اپنے شوہر سے خلع نہیں چاہتی تھی۔"

"طلاق کی ایک درخواست ڈاکٹر شیراز نے بھی تو دی تھی......؟"

"ہاں......! مگر وہ درخواست بہت پہلے ہی عدالت نے عدم پیروی
کی وجہ سے خارج کر دی تھی۔"

"گستاخی معاف محترمہ......! آپ کو یہ درخواست واپس لینے کا
خیال اتنے عرصے بعد کیوں آیا......؟"

"دیکھئے......! میں نے آپ کے ہر سوال کا جواب بڑی فراخ دلی

سے دیا ہے لیکن بہت سے معاملات نجی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں اس بارے
میں آپ کو کوئی جواب نہیں دینا چاہتی۔ اور پلیز......! میں نے آپ سے کہا
ہے کہ میرے وکیل آنے والے ہیں، میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو ان سے
ملاقات کے لئے تیار کر رہی ہوں۔ آپ ان سوالات پر اکتفا کیجئے اور مجھے
اجازت دے دیجئے۔"

"آخری سوال اور......" ہمدانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"پوچھئے......!"

"کیا مقدمہ واپس لینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اب بھی خود کو ڈاکٹر
شیراز کی جائز اور قانونی بیوی خیال کرتی ہیں......؟"

"قطعی...... صرف میں ہی ان کی جائز بیوی ہوں اور کوئی مجھ سے
میرا یہ مقام نہیں چھین سکتا۔ پلیز......! اب آپ جائیے۔" اس نے خاصی
ناگواری سے کہا تو ہمدانی واپسی کے لئے اٹھ گیا۔

بہرحال...... ابھی نادرہ آباد میں کافی وقت گزارنا تھا اور نادر ہمدانی
بڑے اہتمام سے ان کی چھان بین کر رہا تھا۔ اس نے اس مقدمے کا نتیجہ
معلوم کرنے کے لئے کورٹ کا رخ بھی کیا تھا اور اس کے بعد یہ پتا چلا تھا
کہ عدالت نے کسی باقاعدہ اجلاس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ صدف یا اس کے
وکیل کو اپنے چیمبر میں بلوایا اور ان سے دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد
مدعیہ کو اپنی درخواست واپس لینے کی اجازت دے دی۔

بہرحال...... صدف بہت خوش خوش باہر آئی تھی اور اپنے وکیل کے
ساتھ رخصت ہوگئی تھی۔ یہ سارے واقعات بڑی تیزی سے ہوئے تھے اور
ایک طرح سے بظاہر ان کا خاتمہ ہی نظر آ رہا تھا کیونکہ صدف کے انداز سے

یہ پتا چلتا تھا کہ وہ نادرہ آباد نہیں چھوڑے گی۔ پھر ہمدانی نے دوبارہ عینی سے ملاقات کی۔ وہ دارالحکومت واپس جا رہا تھا۔ اس نے عینی کے چہرے پر غم کے تاثرات دیکھے۔

''میں نہیں جانتی کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے لیکن میں بڑی بدنصیب ہوں۔ ہمدانی صاحب......! کیا آپ واقعی مجھے دارالحکومت بلوالیں گے۔ دیکھئے میں آپ سے کوئی ضد نہیں کر رہی لیکن میرے بارے میں ہمدردی سے غور کیجئے۔ مجھے کم از کم اپنا فون نمبر تو دیتے جایئے...... اگر میں دوبار آپ سے ملاقات کرنا چاہوں تو کوئی مشکل نہ ہو۔ ویسے یہ بھی آپ کی مرضی پر منحصر ہے، اس میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔''

ہمدانی نے اسے اپنا فون نمبر دے دیا۔ عینی کے لئے وہ بھی دل میں ہمدردی کے جذبات لئے واپس لوٹا۔ ڈاکٹر زمان خان کے گم ہونے کے بعد سے واقعی عینی کا چہرہ اترا اترا ہی سا نظر آتا تھا ورنہ وہ ایک شگفتہ لڑکی تھی۔
عادل پاشا نے اس کا پرُجوش خیر مقدم کیا اور ہنستے ہوئے کہا۔

''بڑا دلچسپ مسئلہ رہا ہے لیکن بہرحال ان دلچسپیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ مجھے صرف ایک بات کی تشویش ہے۔ فیروز خان نے مجھ سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا جبکہ اسے مجھ سے صدف کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئے تھیں۔ وہ کردار ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر...... میرے تمہارے معاملات جس انداز میں چل رہے ہیں، وہ چلتے رہیں گے۔ مجھے جگہ جگہ تمہاری ضرورت پیش آئے گی۔''

''میں حاضر ہوں پاشا صاحب......!''

''اور وہ آپ کا معاوضہ......؟''

''وہ بھی لے لیں گے...... جلدی کیا ہے......؟''

''اگر تم فیروز خان کا انتظار کرنا چاہئے ہو تو ضرور کرو۔ وہ جب بھی آیا اور جو بھی سلسلہ ہو......''

''آپ پلیز......! اس طرح کی باتیں نہ کریں۔'' نادر ہمدانی نے کہا اور پھر وہ اپنے معمولات میں مصروف ہوگیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد اسے عینی کا فون موصول ہوا، عینی نے کہا۔

''نادر صاحب......! معافی چاہتی ہوں۔ ایک اطلاع ہے آپ کے لئے اور مجھے آپ کی ضرورت ہے۔''

''ہاں ہاں......! بتایئے......!''

''انکل کی لاش پائی گئی ہے، ایک پہاڑی ٹیلے کے پاس۔ انہوں نے خودکشی کر لی ہے۔ آپ بتایئے آپ......''

''میں آ رہا ہوں عینی......!'' یہ اطلاع بھی ہمدانی نے پاشا کو دی اور پاشا نے فوراً ہی کہا۔

''میں جانتا تھا کہ یہ کیس ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس کیس کا مرکزی کردار یعنی صدف نادرہ آباد میں موجود ہے تو کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ اور پھر جو واقعات تم نے بتائے تھے، اس کے بعد یہ فیصلہ کر لینا کہ کیس ختم ہوگیا ہے، کم از کم میرا ذہن تو اسے قبول نہیں کرتا۔ تم میری گاڑی لے جاؤ۔ کوئی تکلف کی ضرورت نہیں۔''

نادر ہمدانی جب ڈاکٹر زمان خان کے کلینک پہنچا تو اس نے باہر پولیس کی گاڑی کھڑی دیکھی۔ اندر ایک پولیس آفیسر عینی سے سوالات کر رہا تھا۔ جب ہمدانی اندر داخل ہوا تو عینی کے چہرے پر اسے دیکھ کر رونق

آ گئی۔

''آپ نے بہت اچھا کیا جو اس وقت آ گئے ہیں۔ میں خود کو بڑا تنہا محسوس کر رہی تھی۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں عینی......! بے فکر رہو۔''

''آپ کے آ جانے سے مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ میں اب تنہا نہیں ہوں۔''

''کون صاحب ہیں آپ......؟'' پولیس آفیسر نے سرد لہجے میں کہا۔

''میں اس خاندان کا ایک دوست اور بہی خواہ ہوں۔ میرا نام نادر ہمدانی ہے۔''

''میں انسپکٹر ثناء اللہ ہوں اور ڈاکٹر زمان خان صاحب کے خودکشی کیس کی تحقیقات کر رہا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب کی موت ایک المناک سانحہ ہے، انسپکٹر صاحب......! کیا تعاون کے طور پر آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے کہ انہوں نے کس انداز میں خودکشی کی......؟''

''پچھلے دن دوپہر کے ایک بجے کے قریب ایک مقامی باشندے نے اطلاع دی کہ ٹیلے کے پاس ایک لاش پڑی ہوئی ہے۔ میں جب تحقیقات کے لئے گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ لاش ڈاکٹر زمان خان کی ہے۔ ڈاکٹر زمان خان بہرحال ایک معروف شخصیت تھے اور نادرہ آباد کے قدیم باسی بھی......

بہرحال...... ان کی لاش اسپتال میں پہنچائی گئی اور معائنہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ ان کی موت کو تقریباً دو دن گزر چکے ہیں اور ان کی

لاش ایک ایسی جگہ پڑی ہوئی تھی جو عام گزرگاہ نہیں تھی۔ لاش کے پاس ایک ریوالور بھی پایا گیا ہے اور بائیں کنپٹی پر گولی کا نشان بھی تھا۔ ان کی جیب سے ایک کاغذ بھی نکلا ہے جس پر تحریر تھا کہ وہ مختلف وجوہات کی بنا پر دلبرداشتہ ہو کر اپنے ہاتھوں زندگی ختم کر رہے ہیں اور کسی کو ان کی موت کا ذمے دار نہ سمجھا جائے۔''

اپنے تجربے کی بنیاد پر نادر ہمدانی نے اندازہ لگایا کہ انسپکٹر ثناء اللہ سیدھا سادہ آدمی ہے، زیادہ الجھنوں میں نہیں پڑتا۔ اس کے نزدیک سو فیصدی یہ خودکشی کا کیس تھا۔ ڈاکٹر زمان خان کی بھتیجی سے وہ صرف رسمی سوالات کرنے آ گیا تھا تاکہ وہ اپنی یہ رپورٹ مکمل کر سکے۔ اگر انسپکٹر ذہین ہوتا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ خط کی تحریر ڈاکٹر زمان خان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے بھی یا نہیں۔ لیکن نادر ہمدانی اس خیال کو بھی پی گیا۔ ریوالور کے بارے میں البتہ اس نے کچھ سوالات کئے۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ ریوالور زمان خان صاحب ہی کا ہے......؟'' انسپکٹر چونکا پھر اس نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔

''یہ معلوم کرنا کون سی مشکل بات ہے......؟ پولیس اپنا کام کرنا جانتی ہے۔''

ہمدانی نے اپنے آپ کو اس خاندان کا بہی خواہ بتایا تھا۔ چنانچہ اس نے باقی معاملات میں پورا پورا حصہ لیا اور ضروری کارروائیوں کے بعد ڈاکٹر زمان خان کی تدفین کر دی گئی۔ انسپکٹر ثناء اللہ نے تو ابھی تک ریوالور کے بارے میں کوئی تحقیقات نہیں کی تھی لیکن موقع ملتے ہی نادر ہمدانی نے اس بارے میں عینی سے پوچھا۔

''نہیں......! پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم چچا بھتیجی کے درمیان زیادہ روابط نہیں تھے۔ کچھ ہی معاملات ایسے ہوا کرتے تھے جن میں میں انکل زمان سے کچھ سوالات کر لیا کرتی تھی۔ لیکن انہوں نے کبھی مجھ سے کھل کر گفتگو نہیں کی۔ اس ریوالور کے بارے میں...... میں کچھ بھی نہیں جانتی کہ یہ ان کا ہے بھی یا نہیں۔ ویسے ایک ذاتی بات میں آپ کو بتاؤں ہمدانی صاحب......! وہ گوشہ نشین ضرور ہوگئے تھے لیکن میں نے کبھی انہیں افسردہ یا غمگین نہیں دیکھا۔ نہ ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی زندگی سے بے زار ہوں۔''

''ہوں......!''

''لیکن ہمدانی صاحب......! انکل کی موت کے بعد تو میں بالکل ہی تنہا رہ گئی ہوں۔ کلینک میں تالا ڈالنا پڑے گا کیونکہ میں تو نزلہ زکام کا علاج بھی نہیں کر سکتی۔ صرف اس لئے کلینک میں نظر آتی رہی ہوں کہ ایک ڈاکٹر کی بھتیجی ہوں۔ دیکھئے میرا آپ پر کوئی حق تو نہیں ہے لیکن انسان چھوٹے چھوٹے سہارے تلاش کرتا ہے۔ خدارا......! میرے بارے میں کچھ سوچئے......!''

''میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، تم بے فکر رہو...... میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔'' ہمدانی نے جواب دیا۔

بہرحال...... فی الحال کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس کے لئے ہمدانی کو یہاں رکنا پڑتا۔ البتہ ہوٹل سے روانگی سے پہلے اس نے صدف کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ کوئی صدف سے ملنے آیا تھا اور اس کے جانے کے بعد صدف نے ہوٹل کا بل ادا کیا، ٹیکسی منگوائی اور ریلوے

اسٹیشن روانہ ہوگئی۔

''جو شخص اس سے ملنے آیا تھا کیا تم مجھے اس کا حلیہ بتا سکتے ہو......؟'' ہمدانی نے سوال کیا اور کلرک نے اسے جو حلیہ بتایا وہ سو فیصد اسی شخص کا تھا جس نے ہمدانی پر حملہ کیا تھا۔

بہرحال...... اس نے وہاں سے واپسی کا فیصلہ کیا پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ ڈاکٹر شیراز گل نے اپنا نام بدل لیا تھا اور اپنے بچپن کا نام استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگر وہ زندہ تھا تو ہو سکتا ہے کہیں آس پاس ہی عثمان شاہ کے نام سے پریکٹس کر رہا ہو۔ چنانچہ اس نے قرب و جوار کے علاقوں میں اس کی تلاش شروع کر دی۔ آخر کار ڈاکٹر عثمان شاہ کے کلینک کا سراغ لگا ہی لیا جو دارالحکومت سے کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ایک درمیانے سے قصبے میں تھا۔

آخر کار وہ سابق شیراز گل اور موجودہ عثمان شاہ کے کلینک پہنچ گیا۔ اس نے ڈاکٹر عثمان شاہ سے ملاقات کی اور جب وہ عثمان شاہ کے سامنے پہنچا تو اس نے اس کی جگہ فیروز کو سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ کچھ دیر تک دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر ڈاکٹر شیراز گل یا عثمان شاہ نے سنبھل کر کہا۔

''تشریف رکھئے......! میں تو یہ بالکل نہیں کہوں گا کہ میں آپ کو نہیں جانتا۔'' یہ کہہ کر اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ہمدانی نے بھی اس سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اور ایسا کہنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں کیونکہ بہرحال آپ نے بے شک دوبارہ عادل پاشا سے ملاقات نہیں کی لیکن پھر بھی ہم نے آپ کا کیس

اپنے پاس ہی رکھا ہے۔''

''آپ یقین کیجئے اس میں، میں کسی بددیانتی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بددیانتی سے میری مراد یہ ہے کہ میں نے وعدے کے باوجود عادل پاشا صاحب سے ملاقات نہیں کی اور ان کی کاوشوں کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا لیکن آپ اس بات پر یقین کر لیجئے کہ میں نے ان سے اسی وقت پوچھا تھا کہ اس کارروائی کے صلے میں مجھے کیا نذرانہ پیش کرنا ہوگا۔ اس کے لئے انہوں نے کہا تھا کہ یہ تمام باتیں بعد میں طے کر لیں گے۔'' عثمان شاہ کے ان الفاظ پر ہمدانی مسکرا دیا پھر بولا۔

''تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے عادل پاشا کا معاوضہ وصول کرنے آیا ہوں......؟''

''بخدا نہیں......! آپ اس پائے کے لوگ نہیں ہیں لیکن پھر بھی اصل میں کچھ مشکوک حالات میرے سامنے آ گئے تھے اور مجھے خدشہ ہو گیا تھا کہ کہیں میری شخصیت منظر عام پر نہ آ جائے۔ اسی لئے میں نے عادل پاشا سے نہ تو فون پر بات چیت کی اور نہ ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں مسلسل اس کھوج میں رہا ہوں کہ جیسے ہی مجھے موقع ملے، میں ان کے آفس میں نہ سہی، ان کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات کروں۔ آپ کا نام نادر ہمدانی ہے ناں......؟''

''جی جی......!''

''پاشا صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ اصل میں میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ میں عادل پاشا صاحب کی قانونی خدمات حاصل کروں۔ لیکن میرا مقدمہ اسی وقت بنتا تھا جب تک صدف مجھے نظر

آ جاتی یا مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہ ہو جاتا۔ میں اپنی چھان بین میں لگا ہوا تھا اور......''

''آپ اتنی وضاحتیں نہ کیجئے عثمان صاحب......! آپ یقین کریں آپ کے نہ آنے پر ہمیں حیرت ضرور تھی لیکن ہم آپ کے بارے میں کسی ایسے احساس کا شکار نہیں ہوئے تھے کہ آپ جان بوجھ کر گم ہو گئے ہیں...... کیونکہ بہرحال آپ نے ہمیں باقاعدگی کے ساتھ محترمہ صدف کی تلاش کے لئے مخصوص کیا تھا۔''

''میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کسی شبہے سے بالاتر ہو کر مجھ سے بات کریں...... کیا میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ آپ کو میرا پتا کس طرح چلا......؟''

''وزاراتِ صحت کے ذریعے......!'' نادر ہمدانی نے جواب دیا اور عثمان شاہ اپنی کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمدانی کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ظاہر ہے، اتنی ذہانت آپ ہی کے پاس ہو سکتی ہے کیونکہ آپ یہ کام باقاعدہ کرتے ہیں۔ میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا اور شاید میری تقدیر ہی میرا ساتھ دیتی رہی ہے کہ کسی اور کو اس ذریعے سے میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا خیال نہیں آیا۔''

''خیر...... اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اگر آپ عادل پاشا صاحب کو اپنے بارے میں تفصیل بتا دیتے تو اب تک بہت سا کام ہو چکا ہوتا۔ آپ کو یہ سن کر شاید خوشی ہو یا ہو سکتا ہے، یہ بات آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہو کہ محترمہ صدف کل رات تک نادرہ آباد میں موجود تھیں۔'' عثمان شاہ کے چہرے کے تاثرات سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ اسے اس بات کا

علم نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر تک نادر ہمدانی کی صورت دیکھتا رہا پھر بولا۔

’’کیا آپ نے اسے اپنے قبضے میں کر لیا ہے......؟‘‘

’’یہ کیسے ممکن تھا......؟ ہم لوگ قانونی معاملات کی نگرانی ضرور کرتے ہیں، کوئی غیر قانونی حرکت کبھی نہیں کرتے۔‘‘

’’آپ ٹھیک کہتے ہیں۔‘‘ ڈاکٹر عثمان شاہ نے نڈھال لہجے میں کہا پھر بولا۔

’’جب آپ اس قدر معلومات حاصل کر رہے ہیں تو یقیناً آپ نادرہ آباد بھی گئے ہوں گے اور وہاں سے بہت سی باتیں آپ کے علم میں آ چکی ہوں گی۔ تاہم تھوڑی سی وضاحت کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔‘‘ ڈاکٹر عثمان شاہ نے کہا۔

’’صدف سے شادی کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔‘‘ عثمان نے قدرے توقف کے بعد بتانا شروع کیا۔

’’حالانکہ میں بچپن ہی سے زرمین کو پسند کرتا تھا مگر حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ میری پھوپھی صاحبہ اس کی شادی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ اس وقت جب میں صدف سے شادی کر چکا تھا، مجھے زرمین کے حالات کا پتا چلا اور اسے انتہائی مشکلات کا شکار پا کر میں نے اسے نادرہ آباد بلا لیا۔

’’پھر میں نے اسے نرسنگ کی ٹریننگ دلوائی اور اپنے کلینک میں رکھ لیا۔ اگر میری اور صدف کی گھریلو زندگی خوشگوار ہوتی تو شاید میں دوبارہ زرمین کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن میرے پریشان کن ازدواجی حالات نے ایک بار پھر مجھے زرمین کے قریب کر دیا۔ میں صدف کو طلاق دے کر زرمین سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن صدف نے مکاری اور چالاکی سے کام لے کر

مجھے نادرہ آباد میں رسوا کر دیا اور حالات یہاں تک پہنچا دیئے کہ مجبوراً وہ شہر چھوڑنا پڑا۔

میں زرمین کے ساتھ مختلف شہروں میں تھوڑی تھوڑی مدت قیام کرتے ہوئے آخرکار یہاں پہنچ گیا اور یہ کام میں نے اس لئے کیا تھا کہ صدف مجھے تلاش نہ کر سکے۔ یہاں میں نے زرمین سے شادی کر لی جبکہ موجودہ قوانین کے مطابق میں دوسری شادی اس وقت تک نہیں کر سکتا تھا جب تک صدف کو طلاق نہ دے دیتا یا اس سے دوسری شادی کی اجازت نہ حاصل کر لیتا۔

نکاح کے فارم پر میں اس سلسلے میں کیے جانے والے سوالات کے صحیح جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے نکاح تو کر لیا مگر اس کی رجسٹریشن نہیں کرائی۔ حالانکہ قانوناً یہ جرم ہے۔ اگر آج یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے تو عوام کی نظروں میں اپنی شخصیت کے احترام کو مجروح کرنے کے علاوہ مجھے شاید کچھ سزا بھی ہو جائے لیکن خیر...... اس وقت مجھے ان باتوں کی زیادہ پرواہ نہیں تھی اور نہ میں نے یہ سوچا تھا کہ آئندہ ایسا کوئی وقت بھی آ سکتا ہے کہ مجھے عوام کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے ان حالات کو پھر سے کریدنا پڑے گا۔

بہرحال...... میں نے اپنا نام تبدیل کر لیا اور اس کے بعد میں سکون سے پریکٹس کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ نادرہ آباد کی طرح مجھے یہاں بھی عزت اور ہر طرح کے عیش و آرام میں کوئی کمی پیش نہ آئی۔ گزشتہ دنوں ملکی حالات بہت تبدیل ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ انسان دشمن عناصر ابھر کر اوپر آئے اور بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں۔ یہاں اس جگہ بھی جہاں میں

پریکٹس کر رہا ہوں اسے مفاد پرستوں کی کمی نہیں۔

بہرحال...... میں اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا کہ کچھ لوگوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں مقامی طور پر الیکشن میں حصہ لوں۔ چنانچہ میں نے پہلے تو بڑی معذرت کی لیکن ایک حلقہ ایسا بن گیا جو بضد ہے کہ میں انتخاب میں حصہ لوں۔ مجھے تیار ہونے کے بعد اس تشویش کا سامنا کرنا پڑا کہ اگر انہیں میرے ماضی کے بارے میں معلوم ہوا تو یہ میری نا اہلی تصور ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ میرے مخالف افراد اور ان کے ساتھ شامل سماج دشمن عناصر میری اس حیثیت کو قبول نہیں کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔

مجھے طرح طرح کی دھمکیاں دینے کے علاوہ انہوں نے میرے ماضی کی کوئی ایسی بات تلاش کرنا شروع کر دی جو مجھے عوام کی نگاہوں میں گرا دے اور ان کے اعتماد سے محروم کر دے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی یہاں بڑا احترام کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ مجھے الیکشن لڑنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔

بہرحال......میری پوری زندگی میں صدف کے سوا کوئی اور سیاہ دھبہ نہیں ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ میں اسے تلاش کر کے اس کو کسی طرح مفاہمت پر رضامند کر لوں۔ اس سے نجات حاصل کر لوں۔ باقاعدہ طلاق کے بعد دشمن مجھے ذلیل نہیں کر سکتے اسی لئے میں نے عادل پاشا سے رابطہ قائم کیا۔

الیکشن کی تاریخ میں ابھی کچھ وقت ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب بھی اگر کسی طرح سے صدف مل جائے اور آپ اسے اس بات کے لئے تیار کر لیں تو میرے مخالفین کا یہ حربہ بھی بے اثر ہو سکتا ہے لیکن میں نہیں جانتا......؟

بڑا آگے کی صورت حال کیا ہو......؟''

نادر ہمدانی اس داستان کو بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اس نے بہت سے پیچیدہ مسائل حل کئے تھے اور ان کے بارے میں رپورٹ بنا کر ان کی شاندار کوریج کی تھی لیکن یہ کیس کافی دلچسپ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ایسی بات ہے تو مقدمہ کس قسم کا بنتا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ سنانے والے کی بات صرف ایک کہانی ہو اور ڈاکٹر عثمان شاہ کسی ایسے وکیل کو ہم نوا بنا کر اپنے لئے قانونی بہتری چاہتا ہو یا پھر اس کے ذہن میں صرف اتنا خیال ہو کہ پاشا کے ذریعے صدف کو تلاش کر کے وہ اپنے اور صدف کے درمیان مفاہمت کرا سکے۔

''دیکھئے نادر ہمدانی صاحب......! ایک بہت ہی گھٹیا بات کر رہا ہوں، آپ اسے محسوس نہ کریں، پلیز......!''

''ہاں بتایئے......!''

''عادل پاشا سے بے شک میری دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی اور اس کی وجہ کچھ ایسے ہنگامے تھے جو درمیان میں پیش آ گئے ہیں اور جن کی تھوڑی سی وضاحت میں کر چکا ہوں لیکن میرے اور ان کے درمیان جو مالی معاملات......''

''میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات...... وہ ہم بعد میں طے کر لیں گے جیسا کہ عادل صاحب نے کہا، میں آپ کو مکمل تفصیل بتائے دیتا ہوں، اس کے بعد غور کیجئے کہ یہ سارا قصہ کیا ہے۔''

ہمدانی نے اس دوران میں پیش آنے والے تمام واقعات عثمان شاہ کو بتائے اور اس نے پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"سو فیصدی...... سو فیصدی...... وہ لوگ میرا مطلب ہے، میرے
مخالف، ہدف تک پہنچ چکے ہیں اور اس نے یقیناً خلع کی درخواست اسی لئے
واپس لے لی ہے کہ خود کو میری قانونی بیوی ثابت کر کے زرمین سے میری
شادی کو ناجائز قرار دلوا سکے اور مجھے عوام کی نگاہوں میں بدنام کر دے
اوہ...... میرے خدا...... ! یہ تو بڑی مشکل پیش آگئی۔"

"ایک بات بتایئے...... ! آپ نے پاشا صاحب کے علاوہ کسی اور
سے بھی صدف کی تلاش کے لئے رابطہ کیا ہے......؟"

"ہرگز نہیں...... ! لیکن آپ نے ابھی فرزانہ نامی ایک لڑکی کا ذکر کیا
ہے اور کسی اور شخص کا بھی۔ میں یہی سوچ رہا ہوں کہ وہ کون ہو سکتے ہیں
صدف کا پتا لانے کے بارے میں کام کر رہے ہیں۔ خاص طور سے وہ لڑکی
فرزانہ کیونکہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ صدف کی کوئی بھانجی یا بھتیجی نہیں
ہے۔ ایک بات بتایئے...... ! کیا فرزانہ نے اپنا کوئی پتہ وغیرہ بھی دیا
تھا......؟"

"ہاں......!" ہمدانی نے کہا۔

"مجھے بتانا پسند کریں گے......؟"

"کیوں نہیں......!" ہمدانی نے کہا اور اس نے وہ پتا دہرا دیا
ہمدانی نے سوال کیا۔

"ویسے ایک بات بتایئے...... ! آپ ان حالات کا شکار تھے
آپ نے اس کے باوجود الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا...... کیا آپ کو
بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ بات آپ کے لئے مشکل کا باعث بن
ہے......؟"

"میں نے کوئی فراڈ نہیں کیا، میرا اصل نام واقعی عثمان شاہ ہی ہے
اور میں اسی نام سے الیکشن لڑنا چاہتا تھا اور مجھے امید تھی کہ اگر کوئی اسکینڈل
نہیں کھڑا ہوا تو میں سو فیصدی الیکشن جیت جاؤں گا۔ ایک دشمن ہے میرا، نام
اس کا گلزار ہے اور وہ خاصا بااثر آدمی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فیئر الیکشن میں وہ
مجھ سے نہیں جیت سکتا۔

مجھے یقین ہے کہ مجھے بدنام کرنے کی مہم اسی نے شروع کر رکھی
ہے۔ اس کا ایک اخبار بھی اثر ہے اور اس اخبار کے ذریعے وہ میرے خلاف
خبریں اور افواہیں شائع کراتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی پولیس کے افراد
بھی اس کے ساتھ شامل ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ایک دو اعلیٰ افسروں کو اس
نے ٹرانس میں لے رکھا ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا لیکن اگر انہوں نے
صدف کو میرے سامنے لاکر کھڑا کر دیا اور اس سے یہ بیان دلوا دیا کہ وہ
میری جائز بیوی ہے اور زرمین سے میں نے جو شادی کی ہے وہ غلط اور
ناجائز ہے تو مجھے کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"محترمہ صدف ابھی کچھ دنوں پہلے نادرہ آباد سے غائب ہوگئی ہیں
لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک بار پھر میری ڈیوٹی ہے کہ میں ان کا پتا چلاؤں
اور انہیں مجبور کروں کہ وہ آپ کے خلاف کام کرنا چھوڑ دیں۔"

"بڑے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑے گا مجھے ہمدانی
صاحب...... ! بار بار کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے لیکن میں آپ لوگوں
کے معاوضے کا مقروض ہوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ صدف ایک آدھ دن میں
یہاں تک پہنچ جائے گی۔" عثمان شاہ نے افسردگی سے کہا۔

"دیکھئے...... جو کچھ بھی بہتر ہو سکتا ہے میں کرنے کی کوشش کروں

گا۔ مجھے اجازت دیجئے۔'' ڈاکٹر عثمان شاہ نے بڑی نیازمندی سے ہمدانی کو رخصت کیا۔

ڈاکٹر عثمان شاہ کے کلینک سے نکلنے کے بعد ہمدانی کے ذہن میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے۔ اچانک ہی اسے خیال آیا کہ اس کا دوست جو محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھا، ایک زمانے میں ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا تھا۔ اس کا نام نعمان غزالی تھا۔

اگر وہ اس وقت بھی یہیں موجود ہے کیونکہ یہاں آنے کے بعد اس سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا تو وہ اس سے بہت سے معاملات میں مدد لے سکتا ہے۔ اس نے نعمان سے ملاقات کی لیکن نعمان غزالی نے زیادہ پُرجوش انداز کا مظاہرہ نہیں کیا جس پر نادر ہمدانی کو بڑی حیرت ہوئی۔

''کیا بات ہے......؟ اس دوران ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے تم شاید کچھ الجھ گئے ہو......؟''

''یہ بات نہیں ہے...... تمہیں معلوم نہیں کہ آج کل یہاں محکمہ پولیس میں بڑی سیاست چل رہی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رپورٹ ہو جاتی ہے اور ایس پی صاحب سب سے پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ سروس معطل کرا دیتے ہیں۔ انکوائری کے بہانے مہینوں پریشان کرتے ہیں۔

ایسے بہت سے کیس ہو چکے ہیں اور تم ایک بدنام کرائم رپورٹر ہو۔ معاف کرنا، بدنام اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم ہر ایک کے خلاف ہر بات سچ لکھ دیتے ہو۔ یہ بات میرے لئے خطرناک ہے۔ پہلے ہی تمہاری یہاں آمد میرے لئے الجھن کا باعث ہے۔''

اچانک ہی ہمدانی چونک پڑا۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹک

رہی تھیں۔ سامنے والی دیوار پر ایک گروپ فوٹو لگا ہوا تھا جو شاید ڈی آئی جی صاحب کی یہاں آمد کے موقع پر اسٹاف کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ گروپ فوٹو نے ہمدانی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ وہ چونک کر اٹھا اور تصویر کے پاس جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ وہی طویل قامت آدمی جس کے بارے میں ہمدانی کو بعد میں یاد آیا تھا اور جس نے اس پر حملہ کیا تھا، یونیفارم پہنے کھڑا تھا۔ نعمان غزالی اسے غور سے دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا......؟''

''کیا تم مجھے اس شخص کے بارے میں بتا سکتے ہو......؟'' ہمدانی نے اس شخص کے چہرے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''شاید تم اسے بھول گئے۔ دارالحکومت ہی سے تبدیل ہو کر یہاں آیا ہے، بہت خطرناک آدمی ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ ایک بار ایک ایس پی نے اس کا تبادلہ اس کی مرضی کے خلاف کہیں کر دیا تھا تو اس نے ایس پی کو گولی مارنے کی دھمکی دی تھی۔ عام طور سے محکمے کے عتاب کا شکار رہتا ہے مگر باز نہیں آتا۔ تم یوں سمجھ لو کہ بدنام ترین پولیس آفیسرز میں سے ہے۔ تمہیں گلاب خان کے بارے میں تو معلوم ہوگا؟ گلاب خان جس کی دھاک پورے دارالحکومت میں بیٹھی ہوئی ہے، یہ اس کا شاگرد ہے۔''

''کیا ان دنوں یہ یہاں تعینات ہے......؟''

''ہاں......! انسپکٹر کی حیثیت سے۔''

''گڈ......!''

''کیوں......؟ کوئی خاص بات ہے......؟''

''نہیں......! بس جانی پہچانی شکل تھی۔ اس لئے میں نے اس

بارے میں سوال کر لیا۔'' نادر ہمدانی نے بات کو ٹال دیا پھر بولا۔

''چلو...... اگر تمہیں میری یہاں آمد سے کچھ الجھنیں درپیش آ سکتی ہیں تو میرا خیال ہے مجھے تمہارے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔''

''نہیں یار......! ایسی بات نہیں ہے۔ بس دیکھو ناں...... ہر شخص نوکری بچانے کے چکر میں رہتا ہے اور ہمارے افسر اعلیٰ صاحب باہر کے لوگوں سے زیادہ اندر کے کے لوگوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کون کیا کر رہا ہے۔ اصل میں بس ایک سیٹ اَپ بنایا ہوا ہے انہوں نے کہ یہاں محکمہ پولیس میں بھی جو کچھ ہو، وہ صرف ان کی مرضی کے مطابق ہو۔'' ہمدانی کے ہونٹوں پر بے اختیار ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

''اور ان کی مرضی......؟ چلو خیر چھوڑو...... اچھا اب اجازت......؟''

نعمان غزالی سے اس کے اچھے تعلقات تھے لیکن اس وقت نعمان غزالی کی جو کیفیت تھی، اس کے بعد اس کے پاس مزید رکنا خود اپنی بے عزتی کے مترادف تھا۔ بہرحال...... ہمدانی محسوس کر رہا تھا کہ یہاں آنا بالکل ہی بے مقصد نہیں رہا ہے۔ کم از کم اس شبہے کی تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ شخص جس نے حملہ کیا تھا وہی تھا جسے اس نے دارالحکومت کے پولیس ہیڈ آفس میں دیکھا تھا اور جس کا نام شہروز خان تھا۔ نادر ہمدانی کو یہ اندازہ تھا، کیس بڑی خوش اسلوبی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ نئے نئے کردار سامنے آ رہے ہیں۔

بہت سی باتیں غور طلب تھیں۔ عثمان شاہ نے اسے بتایا تھا کہ صدف کی اس سے ملاقات دارالحکومت ہی میں ہوئی تھی اور اس وقت وہ ایک کلب میں موسیقی کے پروگرام پیش کرتی تھی۔ بہرحال صدف نادرہ آباد سے غائب ہوگئی تھی۔ کیا وہ دارالحکومت کے کسی حصے میں اسے مل سکتی ہے؟

وہ واپس چل پڑا۔ عادل پاشا سے فوری ملاقات کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کام جاری تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عثمان شاہ اسے دستیاب ہوگیا تھا اور عادل پاشا کے لئے یہ خبر کافی دلچسپ ہوتی۔ البتہ اس نے سب سے پہلے وہ کلب تلاش کیا جہاں بیس برس پہلے صدف موسیقی کا پروگرام پیش کیا کرتی تھی اور وہاں کی روح رواں تھی۔ محتاط انداز میں وہ کلب کے نچلے درجے کے اسٹاف کو تلاش کرنے لگا تاکہ ان سے معلومات حاصل کرے۔ سب سے پہلے اس کی ملاقات ایک بوڑھے چوکیدار سے ہوئی اور ہمدانی نے اسے اپنی باتوں میں الجھا لیا۔ اسے پتا چلا کہ چوکیدار کم از کم پچیس سال سے یہاں چوکیداری کرتا رہا ہے، اس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

اس نے چوکیدار کو تھوڑی سی رقم دے دی تو وہ خوش ہوگیا اور پھر ہمدانی نے اس سے معلومات حاصل کیں جس کا لب لباب یہ تھا کہ جن دنوں وہ نیا نیا آیا تھا، کلب میں صدف نامی ایک لڑکی جو بہت خوب صورت تھی اور بہت اچھا گاتی تھی، اس نے ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ کچھ عرصے بعد وہ واپس لوٹ آئی اور دوبارہ کلب میں ملازم ہوگئی۔

اس دوران میں اسٹیج کے ایک اور اداکار سے اس کی دوستی ہوگئی اور صدف نے ایک مقامی عدالت میں درخواست دے کر اپنے ڈاکٹر شوہر سے خلع حاصل کی اور اس اداکار سے شادی کر لی لیکن کچھ عرصے بعد اداکار کو بیرونِ ملک کوئی ملازمت مل گئی اور وہ صدف کو لے کر چلا گیا۔ جب سے اب تک وہ واپس نہیں آئی ہے یا پھر اسے اس بوڑھے چوکیدار نے نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا ہے۔

نادر ہمدانی کے ایک اور سوال کے جواب میں چوکیدار نے بتایا کہ

صدف کی سب سے قریبی اور گہری دوست راحیلہ تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ کلب میں کام کرتی تھیں اور ساتھ ہی رہتی تھیں۔ صدف نے شادی کر لی، تب بھی راحیلہ اسی مکان میں رہتی اور کلب میں کام کرتی رہی اور پھر جب صدف آئی تو سیدھی راحیلہ کے پاس ہی پہنچی اور پھر جب واپس بیرونِ ملک گئی تو راحیلہ کو ساتھ لے گئی لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد راحیلہ واپس آ کر دوبارہ کلب میں کام کرنے لگی۔ البتہ وہ بہت ہی موٹی اور بھدی ہوگئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ کلب کے مالک نے اسے کام دینے سے منع کر دیا۔

اب اس کے بعد راحیلہ اسٹیج اور فلموں میں ایکسٹرا کا کام کرتی ہے اور کبھی کبھی پرانے وقتوں کو یاد کرنے کے لئے کلب بھی آجاتی ہے۔ چوکیدار نے اس کے گھر کا پتا بھی بتایا لیکن اس نے کہا کہ وہ پچھلے ہفتے اس سے ملنے گیا تھا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پڑوسیوں نے بتایا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے باہر گئی ہے۔ پتانہیں ابھی واپس آئی ہے یانہیں۔

ہمدانی ابھی یہ معلومات حاصل کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ اٹھی۔ پولیس کی ایک جیپ تھوڑے فاصلے پر آ کر رُکی تھی اور اس میں سے شہروز خان نیچے اتر رہا تھا۔ پتانہیں شہروز خان نے نادر کو دیکھا تھا یانہیں لیکن ہمدانی نے اسے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ شہروز خان اسی کلب کی جانب آرہا تھا لیکن وہ بری طرح چونک پڑا۔

واقعات کے ڈانڈے مل رہے تھے۔ شہروز خان کلب میں کیوں آیا ہے؟ یہ بعد میں معلوم کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت شہروز خان کی نگاہوں سے محفوظ رہنا تھا۔ چوکیدار کے پاس دوبارہ جانا یا اس کلب کا چکر لگانا خطرناک ہوسکتا تھا کیونکہ اگر شہروز خان اسے وہاں دیکھ لیتا تو وہ ضرور بوڑھے چوکیدار

سے معلومات حاصل کرتا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بے چارے بوڑھے چوکیدار کو اس کی وجہ سے کوئی نقصان پہنچ جاتا۔ چنانچہ اب اس کے بعد ایک اور فیصلہ کر کے وہ ایک اور نام کی ٹرائی کرنا چاہتا تھا۔ نیوکیریژن ٹاؤن فلیٹ نمبر اٹھائیس جہاں فرزانہ رہتی تھی۔

تیسری منزل پر اس نے مطلوبہ فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں ایک نوجوان لڑکی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور غور سے ہمدانی کو دیکھا جو خود بھی اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی کی عمر پچیس سال سے کچھ زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ رنگت گندمی تھی، نقوش میں ایک کشش تھی مگر چہرے پر معصومیت کے بجائے مکاری اور چالاکی کا تاثر حاوی تھا۔

”جی فرمایئے......!“

”میں فرزانہ صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں......؟“ وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

”کیا آپ فرزانہ ہیں......؟ کچھ ضروری باتیں آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میں آپ کو نادرہ آباد کا حوالہ دوں یا آپ سے یہ کہوں کہ آپ کسی کے کہنے پر صدف کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی ہیں اور آپ نے...... چلئے چھوڑیئے...... یوں سمجھ لیجئے کہ میں آپ کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دیتا ہوں۔“

”جی...... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر نادر ہمدانی صاحب......! لیکن پولیس اسٹیشن آپ اکیلے نہیں جائیں گے، میں آپ کو پولیس اسٹیشن لے چلوں گا۔“ اس آواز پر چونک کر ہمدانی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے شہروز خان نظر آیا۔ وہ کڑی نگاہوں سے ہمدانی کو دیکھ رہا تھا۔ فرزانہ کے ہونٹوں پر

ایک مسکراہٹ آ گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو......؟" ہمدانی نے شہروز خان سے پوچھا۔ پہلے کی بات اور تھی جب شہروز خان تیزی سے اپنا کام دکھا کر نکل گیا تھا لیکن اب ہمدانی پوری طرح ہوشیار تھا۔

"میں کیا کر رہا ہوں اور کیا نہیں...... اس کو چھوڑیئے اور فرمایئے میرے پاس ایک رپورٹ ہے کہ نادرہ آباد میں ایک عورت کار کے حادثے میں ہلاک ہوگئی تھی اور جس کار نے اس بوڑھی عورت کو کچلا تھا، وہ آپ کی تھی۔ میں آپ کو اس بوڑھی عورت کو کچل کر فرار ہونے کے شبہے میں گرفتار کر رہا ہوں۔"

"غور کرلو......شہروز خان......! میرا نام ہمدانی ہے۔"

"اور میرا نام شہروز خان ہے۔ آیئے حوالات آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ حالانکہ میں نے نادرہ آباد میں آپ کو سمجھایا تھا لیکن آپ باز نہیں آئے۔ ویسے میرا استاد کہتا ہے کہ آپ اپنے آپ کو بہت زیادہ اسمارٹ سمجھتے ہیں اور بڑی چھان بین کرتے رہتے ہیں۔ گلاب خان نے کبھی براہِ راست آپ پر ہاتھ نہیں ڈالا لیکن میرا خیال ہے کہ اب آپ نے اسے موقع دے دیا ہے۔"

"جتنا بے وقوف وہ ہے شہروز خان......! تم اس سے کہیں زیادہ بے وقوف معلوم ہوتے ہو۔ ایک بے وقوف کا شاگرد بے وقوف ہی ہو سکتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ کیا تم اتنے ہی طاقتور ہو کہ مجھ جیسے آدمی پر آسانی سے ہاتھ ڈال سکو......؟ میں بھی کچے کام نہیں کرتا۔ سینٹرل انٹیلی جنس کا نام سنا ہے......؟"

"کیا مطلب......؟"

"ملک گیر ادارہ ہے اور اس کا تعلق ہر معاملے سے ہے۔ تم بے شک محکمہ پولیس سے تعلق رکھتے ہو لیکن بہرحال اتنے ذہین نہیں ہو، جتنا عام طور پر پولیس والوں کو ہونا چاہیے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے نادرہ آباد میں مجھے زخمی کر کے مجھے میری ہی کار میں ڈال دیا تھا لیکن ایسا کرتے ہوئے تم نے اپنی انگلیوں کے نشانات چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تمہاری انگلیوں کے کتنے ہی نشانات میری کار پر رہ گئے تھے اور میں نے اس پورے واقعے کی رپورٹ انٹیلی جنس کو دے دی تھی اور ساتھ ہی تمہارے وہ نشانات بھی......"

ہمدانی نے ایک لمحے کے اندر شہروز خان کے چہرے کے پھیکے پن کو محسوس کر لیا تھا۔ البتہ فرزانہ دلچسپی سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ شہروز خان تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"بہت چالاک ہو تم...... لیکن میں تمہیں وارننگ دے رہا ہوں کہ زندگی میں کبھی دوبارہ شہروز خان کے سامنے آنے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو یہ سمجھ لو کہ میرے لئے کہیں سے تمہاری لاش برآمد کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ کیا سمجھے......! اور تم فرزانہ......! تم اس شخص کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔ تمہاری قسمت اچھی تھی ورنہ میں تمہیں پولیس لاک اَپ میں لے جا کر الٹا لٹکاتا اور تمہاری کھال ادھیڑ کر تمہارے پیروں میں پھینک دیتا۔ چلو فرزانہ......! اندر چلو۔" اس نے کہا اور فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر فرزانہ کو اندر دھکیلا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

بہرحال...... یہ فرزانہ کا فلیٹ تھا اور شہروز خان کے فرزانہ سے کس طرح کے تعلقات تھے، اس کا اندازہ تو کچھ لمحوں میں ہی ہوگیا تھا لیکن اس

وقت یہاں کوئی ہنگامہ آرائی بے مقصد تھی۔ چنانچہ ہمدانی ایک گہری سانس لے کر وہاں سے پلٹ آیا۔ اسی دوران میں اسے ڈاکٹر عثمان کا فون موصول ہوا۔ ڈاکٹر عثمان شاہ بہت پُر جوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''اب جبکہ تم میری زندگی کے اہم واقعات میں شریک ہو چکے ہو، ڈیئر ہمدانی......! میں تم سے یہ درخواست کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ تم میری مدد کرو۔''

''جی فرمایئے......!''

''میں نے تمہیں گلزار کے بارے میں بتایا تھا، یہ لوگ پرسوں ایک پریس کانفرنس کر رہے ہیں جس میں میرے بارے میں تمام حالات بیان کر دیئے جائیں گے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے کیریئر کا اختتام ہوگا، مجھے تمہاری مدد چاہیئے۔''

''آپ بے فکر رہیں، میں حالات کا جائزہ لے کر آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔'' ہمدانی نے جواب دیا لیکن اس وقت وہ کافی الجھ گیا تھا۔ حالات پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ اس دن جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچا اور کار کھڑی کر کے کار سے نیچے اترا تو گوشت فروش خلیفہ جی نے مسکراتے ہوئے آنکھ ماری اور بولے۔

''اماں......ادھر تو آؤ چندا...... بڑے اونچے اڑ رہے ہو آج کل...... یہ بہترین کار اور لونڈیا...... جاؤ تمہارے فلیٹ میں بٹھا دیا ہے اسے۔''

''لونڈیا......لڑکی......؟''

''اماں......تو اور کیا......؟ جاؤ پیارے جاؤ......! جوانی کا تھیم ہے؟ اس وقت کچھ نہ کرو گے تو پھر کیا بوڑھے ہو کر کرو گے......؟ جاؤ......!'' یہاں

کا سسٹم ذرا الگ تھا۔ گھروں کی چابیاں ایک دوسرے کے پاس رہا کرتی تھیں۔ خلیفہ جی گوشت والے یہاں کی یونین کے صدر بھی تھے۔ چھڑے چھانٹ لوگوں کے گھروں کی چابیاں بھی ان کے پاس رہا کرتی تھیں۔ اس لئے فلیٹ کھل گیا تھا مگر یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے......؟ نادر ہانپتا کانپتا جب اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو اس نے عینی کو دیکھا، وہ حیران پریشان بیٹھی تھی۔ چہرہ اترا ہوا تھا۔

''خدا کا شکر ہے نادر......! تم آ گئے۔ میں تو بے موت ماری گئی۔''

''کیا ہوا عینی......! خیریت تو ہے......؟''

''اللہ جانتا ہے کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ نادر......! میرے پاس فرزانہ کا پیغام آیا تھا۔ میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا فلیٹ نیو گیریژن ٹاؤن میں ہے اور وہ فلیٹ نمبر اٹھائیس میں رہتی ہے۔ فرزانہ نے مجھے کچھ بتایا تھا کہ وہ انکل زمان کی موت کے بارے میں مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ میں اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں انکل زمان کے مسئلے میں جس قدر غمزدہ ہوں شاید تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔ فرزانہ کی طلبی پر میں وہاں پہنچ گئی۔

میں تقریباً تین بجے اس کے فلیٹ پر پہنچی تو میں نے فرزانہ کے فلیٹ سے ایک شخص کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو مجھے دیکھا پھر سر جھکا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ چہرے مہرے سے وہ شریف آدمی معلوم ہو رہا تھا۔

بہرحال ...... میں نے فرزانہ کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں نے پٹ کو تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا اور پھر اندر داخل ہوگئی۔ اندر ایک عجیب سی

خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے آواز دی لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ تب میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو فرزانہ پلنگ پر دراز تھی۔ میں نے اسے کئی آوازیں دیں تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سو نہیں رہی بلکہ حقیقت میں وہ مر چکی تھی۔

میری حالت خراب ہوگئی۔ اگر کوئی آجاتا تو مجھے اس کا قاتل تصور کر سکتا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکل آئی اور دروازہ کے باہر آکر یہ سوچتی رہی کہ اب ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں بہت دیر تک پریشان ہوکر سوچتی رہی۔ تم نے مجھے اپنا پتا بتایا تھا۔ اتفاق سے میرے پاس موبائل فون نہیں تھا لیکن تمہارا پتا مجھے یاد تھا تو میں یہاں چلی آئی۔ یہاں کے رہنے والے تو بہت اچھے لوگ ہیں۔ گوشت والے صاحب نے مجھ سے بڑی محبت سے بات کی، ان کے پاس تمہارے فلیٹ کی چابی بھی تھی اور پھر وہ مجھے یہاں بٹھا کر چلے گئے۔''

''اوہ...... میرے خدا......! تو فرزانہ قتل کر دی گئی۔''

''سو فیصد...... میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ یقیناً اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔''

''اور وہ شخص...... کیا تم مجھے اس کا حلیہ بتا سکتی ہو جسے تم نے فرزانہ کے فلیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا......؟''

عینی نے جو حلیہ بتایا، وہ سو فیصد شہروز خان کا تھا۔ شہروز خان نے اپنا موجودہ حلیہ تھوڑا سا تبدیل کر لیا تھا۔ فرنچ کٹ داڑھی، خاص قسم کی گول عینک نے اسے یقینی طور پر تبدیل کر دیا تھا۔ بہرحال عینی تو اسے ویسے بھی نہیں پہچان سکتی تھی۔

''اب مجھے بتاؤ میں کیا کروں......؟''

''میرا خیال ہے تمہیں پولیس میں رپورٹ درج کرا دینی چاہئے۔ پہلے ہی تم نے بہت دیر کر دی ہے۔ اگر اس دوران میں پولیس وہاں پہنچ گئی تو تمہارے لئے بڑی پریشانی ہو سکتی ہے۔ جاؤ تم سیدھی پولیس ہیڈ کوارٹر جاؤ۔ اپنا کوئی خیال ظاہر مت کرنا۔ بس تم یہی کہنا کہ فرزانہ تمہارے پاس آئی تھی۔ اس کی تم سے ملاقات ہوئی تو تم نے اس سے اپنی ملازمت کی بات کی اور اس نے اپنا پتا تمہیں دے دیا تھا۔ چونکہ تمہارے انکل مر چکے ہیں اس لئے نادرہ آباد تمہیں کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ جب تم فرزانہ کے فلیٹ میں پہنچیں تو وہ اپنے فلیٹ میں مردہ پڑی ہوئی تھی۔ کسی آدمی کے وہاں سے نکلنے کے بارے میں کچھ مت بتانا۔''

''لیکن نادر......! وہ شخص قاتل بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''وہ جو کوئی بھی ہوگا، ہمیں پتا چل جائے گا لیکن تم اس چکر میں مت پڑنا۔ اور اس کے علاوہ ایک اور بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے۔''

''وہ کیا......؟''

''تم بتانا کہ جب تم فرزانہ کے فلیٹ کے سامنے پہنچیں تو تم نے کوریڈور میں ایک شخص کو دیکھا جس کے چہرے پر سختی اور بے رحمی کے تاثرات تھے۔ تم اس کا حلیہ جو بتاؤ گی اسے نوٹ کر لو۔ تمہیں دیکھ کر وہ چھپنے کی کوشش کرنے لگا جس سے تمہیں اس پر شک ہوا اور اس کے بعد وہ شخص چلا گیا۔''

''مم...... مگر میں نے تو......''

''عینی......! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اگر مناسب سمجھو تو وہی کرو اور

فکر مت کرو۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کروں گا۔"

"پولیس ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ درج کرانے کے بعد میں تمہارے پاس آجاؤں......؟"

"ہرگز نہیں......! تمہیں واپس نادرہ آباد ہی جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے......!" عینی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔



عادل پاشا کا فون موصول ہوا تھا۔ چنانچہ وہ کچھ دیر کے بعد ہمدانی کے آفس پہنچ گیا۔

"چائے کی سخت طلب ہو رہی تھی لیکن میں تمہارے ساتھ چائے پینا چاہ رہا تھا۔"

"شکریہ......!" ہمدانی نے کہا۔ چائے کے کچھ گھونٹ لینے کے بعد عادل پاشا نے کہا۔

"ڈاکٹر عثمان شاہ یا شیراز گل میرے پاس آیا تھا۔ تفصیل تو تم سے معلوم ہو ہی چکی تھی۔ وہ بھی جانتا تھا کہ تم نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ خود اس نے اپنی زبان سے بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ الیکشن لڑ رہا ہے اور اس کا واحد مد مقابل گلزار اس کے خلاف مواد حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ اس کے علاوہ گلزار کو کچھ قانونی لوگوں کی بھی ہر طرح کی مدد حاصل ہے اس لئے وہ اپنی ضمانت قبل از گرفتاری بھی چاہتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اپنا کام کر لیا ہے۔ اس تمام سلسلے میں ایک اہم ترین بات بھی ہے۔"

"وہ کیا......؟" نادر ہمدانی نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، اس نے بھی اپنے پاس کچھ ذرائع رکھے ہوں گے۔

انہی ذرائع نے اسے بتایا کہ صدف پہلے نادرہ آباد میں نظر آئی پھر وہاں سے غائب ہوگئی۔ اس وقت وہ دارالحکومت کے ہوٹل نور کے روم نمبر چالیس میں مقیم ہے۔"

"زبردست......!" ہمدانی نے مسکرا کر کہا۔

"ماضی کے کچھ فوٹو گرافس دے کر گیا ہے جن میں وہ صدف کے ساتھ ہے۔" عادل پاشا نے کچھ فوٹو گراف نکال کر ہمدانی کو دیئے تو ہمدانی انہیں دیکھ کر اچھل پڑا۔ اب وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ چھ سات تصویریں تھیں۔ انہیں میں کچھ تصویریں ایسی بھی تھیں جس میں اس کے چند دوست احباب بھی تھے۔

"کوئی خاص بات......؟" عادل پاشا نے پوچھا۔

"ہاں...... بہت خاص......!"

"مجھے بھی بتاؤ......!"

"وہ عورت جو کچھ دن پہلے نادرہ آباد پہنچی تھی اور جس نے وکیل کی مدد سے خلع کی درخواست واپس لی تھی، وہ صدف نہیں تھی۔"

"کیا......؟" عادل پاشا نے حیرت سے کہا۔

"ہر چند کہ یہ تصویریں بیس سال پرانی ہیں لیکن...... اوہ میرے خدا...... اتنا بڑا فراڈ......؟"

"تو پھر وہ کون تھی......؟"

"راحیلہ...... ایک اسٹیج آرٹسٹ...... ان دونوں کی دوست اور یہ اس کی خود کی تصویر ہے۔" نادر ہمدانی نے گروپ فوٹو میں سے ایک کا چہرہ اٹھایا۔

''اب تم کیا کرو گے......؟'' عادل پاشا نے کہا۔

''کام......!'' نادر ہمدانی مسکرا کر بولا۔ اس کے بعد دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ دونوں ہی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عادل پاشا نے کہا۔

''اب تو میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کیس کے سلسلے میں شدید تجسس کا شکار ہیں۔ چنانچہ میں یہ درخواست کروں گا کہ صورت حال سے مجھے بھی آگاہ کرتے رہنا۔''

''یقیناً......!''

''اور پلیز......! یہ لفافہ رکھو۔ اور ڈاکٹر عثمان شاہ یا ہمارے محترم کلائنٹ فیروز صاحب فیس دے گئے ہیں اور اس میں ایمانداری کا حصہ آپ کی نذر۔'' ہمدانی نے ہنستے ہوئے لفافہ لے کر جیب میں رکھ لیا اور پھر اس کے بعد وہ اجازت لے کر وہاں سے چل پڑا۔

درحقیقت اس اطلاع نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں کہ صدف کے بھیس میں راحیلہ نادرہ آباد پہنچی تھی۔ اس بات کا فائدہ اٹھا کر کہ واقعات بیس سال پرانے تھے اور اب اتنے لوگ موجود نہیں ہوں گے جو راحیلہ کو پہچان سکیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز اس کے ذہن میں ابھری تھی۔ یہ ایک خیال تھا۔ ڈاکٹر زمان خان جو صدف کو پسند بھی کرتا تھا، عینی نے یہ بات اسے بتائی تھی اور ڈاکٹر زمان کی لاش مل چکی تھی۔ دوسری فرزانہ تھی جو صدف کی تلاش میں نادرہ آباد پہنچی تھی۔ یقیناً اسے بھی کچھ سن گن ملی ہوگی جس کی وجہ سے وہ موت کا شکار ہوگئی۔

بہرحال ہمدانی جانتا تھا کہ اب اسے کہاں جانا ہے۔ چنانچہ وہ کلب

پہنچا۔ اس سلسلے میں وہ چوکیدار بھی اہم تھا اور چوکیدار نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ وہ راحیلہ یہ تھی جس کی جوانی کی تصویر عثمان شاہ اور صدف کے ساتھ ہے۔ چوکیدار کو تھوڑا بہت انعام دینے کے بعد اس نے راحیلہ کے گھر کا پتا بھی معلوم کیا اور اب اس کے بعد اس کا رخ راحیلہ کے گھر کی جانب ہی تھا۔ بہت سے معاملات میں ذرا غلط ہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے لیکن تفتیش کے لئے یہ سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس رات ایک بجے کے قریب وہ راحیلہ کے گھر میں داخل ہوا جس کا دروازہ باہر سے بدستور بند تھا اور اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے راحیلہ کے پورے گھر کی تلاشی لی اور اسے یہاں آکر خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ راحیلہ کا گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ہمدانی نے دو کمروں کی تلاشی لی اور پھر تیسرے کمرے میں داخل ہوگیا جو خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا لیکن ان دنوں چونکہ راحیلہ اپنے گھر میں نہیں رہ رہی تھی، اس لئے وہ اجڑا سا پڑا تھا۔

ہمدانی پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ ایک ایک چیز کو دیکھتا پھر رہا تھا۔ پھر اسے ایک ایسی چیز نظر آگئی جو بے مثال تھی۔ یہ ایک بڑا سا پیکٹ تھا جس میں کچھ کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کاغذ اٹھا کر اس کی تہہ کھولی۔ یہ ایک عدالتی کاغذ تھا جس میں تنسیخ نکاح کی ڈگری فیملی کورٹ کی طرف سے تھی۔

فیملی کورٹ نے صدف کی درخواست منظور کرتے ہوئے خلع کا فیصلہ دے دیا تھا۔ دوسرا اور تیسرا کاغذ نکاح کے فارم کی نقلیں تھیں جو رجسٹریشن کے بعد دولہا دلہن کو واپس کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کاغذ

صدف کی شادی کا تھا لیکن ڈاکٹر شیراز گل کے ساتھ نہیں بلکہ اس اداکار کے ساتھ جس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ صدف نے اس سے شادی کر لی ہے۔ ہمدانی کا دل خوشی سے بھر گیا۔ یہ تمام چیزیں اس نے اپنی تحویل میں لیں اور اس کے بعد خاموشی سے اس مکان سے باہر نکل آیا۔

لیکن اس کے بعد اسے عینی کا خیال آیا۔ عینی نادرہ آباد پہنچ چکی ہوگی اور جس طرح شیطانی ذہن اس سارے کیس کے سلسلے میں اپنے جال بنتے پھر رہے تھے، اس طرح عینی کی خبر گیری ضروری تھی کیونکہ وہ اچانک ہی خطرے میں گھر گئی تھی۔

وہ دن کی روشنی میں ڈاکٹر زمان کے کلینک پہنچا جو اب بند ہو گیا تھا اور اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ صرف پچھلا رہائشی حصہ کھلا ہوا تھا لیکن وہاں پولیس کی جیپ موجود تھی۔ ہمدانی کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

یقیناً شہروز خان عینی کو پریشان کر رہا ہوگا۔ وہ غصے میں ڈوبا اندر گھستا چلا گیا۔ اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ شہروز خان کے ساتھ ساتھ اس کا استاد گلاب خان بھی موجود تھا اور انسپکٹر غزالی بھی۔ عینی سہمی سہمی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر ہمدانی کو دیکھ کر اس کے اندر زندگی کی لہر پیدا ہوئی اور وہ بے اختیار اٹھ کر ہمدانی کی طرف دوڑی اور اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ شہروز خان کی تالیاں گونج اٹھیں۔ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''واقعی......! فلمی سچویشن چل رہی ہے۔ جب بھی ہیروئن پر کوئی مشکل آتی ہے، ہیرو فوراً نازل ہو جاتا ہے۔ پہلے بھی ایک بار ایسا ہو چکا ہے۔ نادر ہمدانی صاحب......! آپ کو اس کے سوا اور کوئی کام نہیں

ہے......؟''

''آپ یہاں کیسے تشریف لائے......؟ اور جناب چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں بھی موجود ہیں۔ کہیے گلاب خان صاحب......! بڑی ہنگامہ آرائیاں ہو رہی ہیں آج کل آپ کی طرف سے۔ دارالحکومت چھوڑ کر یہاں نادرہ آباد میں اپنے ہنگامے کر رہے ہیں۔''

''اور تم کرائم رپورٹر......! تم بھی اپنی پہنچ سے زیادہ اونچے نہیں اُڑ رہے ہو......؟'' گلاب خان نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

''اصل میں غلطی آپ لوگوں کی ہے۔ میری پرواز کا تعین آپ نے غلط کیا ہے۔'' اس نے کچھ توقف کیا پھر بولا۔

''میرا خیال ہے بات غلط ہو رہی ہے گلاب خان صاحب......! اور شہروز خان، بجائے یہ طنزیہ گفتگو کرنے کے اصل گفتگو کیوں نہ کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ مجھے اپنی ڈیوٹی کرنے دیں گے۔''

''ہاں ہاں......! ضرور......!'' گلاب خان نے کہا۔

''اچھا ہوا آپ آ گئے ہمدانی صاحب......! ذرا ان خاتون کی طرف سے دیئے گئے بیان پر آپ بھی غور کر لیجیے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسی خاتون سے ملازمت کی درخواست کرنے گئی تھیں جن کی لاش انہیں ان کے فلیٹ میں پڑی ہوئی ملی۔ انہوں نے اس لاش کو دیکھنے کے بعد پولیس میں رپورٹ کی لیکن شہروز کا کہنا ہے کہ پولیس میں جانے سے پہلے یہ آپ سے ملیں اور اس کے بعد ان کا بیان مختلف نکلا۔

انہوں نے ایک ایسے شخص کا حوالہ دیا جسے انہوں نے اس راہ داری میں دیکھا تھا۔ یہ صحیح طور سے انہیں دیکھ نہیں سکی تھیں لیکن جو حلیہ انہوں نے

اس شخص کا بتایا، وہ شہروز خان کا حلیہ تھا۔ حالانکہ یہ پہلے بھی شہروز خان سے مل چکی تھیں لیکن ان کا بیان ٹوٹا پھوٹا محسوس ہوتا ہے۔ خاص طور سے گلاب خان صاحب کو۔''

''اصل میں گلاب خان صاحب، ان دنوں الیکشن کے سلسلے میں اپنی پسندیدہ شخصیت کے لئے جو کام کر رہے ہیں، ان کے تحت ان کی سرگرمیاں دارالحکومت میں ڈیوٹی انجام دینے کے بجائے نادرہ آباد میں زیادہ دیکھی جا رہی ہیں۔ اور شہروز خان...... شہروز خان کے بارے میں تو کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ خاص طور سے بہت زیادہ معروف ہیں اور میری ان سے دو تین ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ان ملاقاتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے جبکہ ہمارے پاس پولیس کی ایک رپورٹ ہے جس میں کار کے حادثے میں ایک بوڑھی عورت کو کچل کر مار دیا گیا تھا اور موقع کے گواہوں نے جس کار کو دیکھا تھا، وہ تمہاری کار تھی۔ تمہیں اس سلسلے میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''میں شہروز خان صاحب کو بتا چکا ہوں کہ جو کارروائیاں وہ کرتے رہے ہیں، وہ بہت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ اگر ایسا ہی کوئی سلسلہ ہے تو چلئے ٹھیک ٹھاک کام شروع ہو جائے گا۔ اصل میں مسٹر غزالی......! یہ سارا سلسلہ آپ جانتے ہیں کہ صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ یہ محض فرزانہ کے قتل کا معاملہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

یہاں جو سیاسی جنگ ہو رہی ہے اس کا ایک حصہ گلزار صاحب ہیں جو اپنے مخالف ڈاکٹر کے خلاف الیکشن لڑ رہے ہیں۔ اس کے لئے گلزار صاحب نے ڈاکٹر عثمان شاہ کے ماضی کا ایک ایسا باب کھولنے کا فیصلہ کیا ہے

جو ووٹروں کی رائے کو متاثر کر سکتا ہے۔ آدمی، آدمی ہے، فرشتہ نہیں۔ چھوٹی بڑی غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ کم و بیش ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہے جسے وہ سب کے سامنے لانا نہیں چاہتا۔

بہرحال...... میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ فرزانہ، صدف، شہروز خان نہ جانے کتنے افراد اس سیاسی بساط کے مہرے ہیں۔ بہرحال...... میں دوسری طرف کام کر رہا ہوں۔ میں یہ گورکھ دھندا بڑی حد تک سمجھ چکا ہوں۔ چند گھنٹوں کی مہلت درکار ہے۔ مسٹر شہروز خان، گلاب خان اور نعمان غزالی صاحب......! میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سلسلے کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے۔ پھر اس کے بعد باقی تفصیلات بہت جلد سامنے آ جائیں گی۔''

''گویا تم دھمکی دے رہے ہو......؟''

''یہ دھمکی نہیں قانون ہے...... آپ کا قانون۔ آپ فوری طور پر اس لڑکی کو تنگ کرنا چھوڑ دیجئے۔ اس پر الزامات لگانا بالکل بیکار ہے۔ یہ بے چاری تو کچھ بھی نہیں جانتی۔ میں آپ کے سامنے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر دوں گا۔ آپ اگر دس منٹ کے اندر یہاں سے باہر نہ آئے اور آپ نے اسے تنگ کرنا نہ چھوڑا تو پھر میری مشینری حرکت میں آ جائے گی اور آپ جانتے ہیں کہ اخبار کی طاقت کم نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہے عینی......! میں چلتا ہوں۔ دس منٹ کے بعد اگر یہ لوگ باہر نہ نکلے پھر تم نادر ہمدانی کی کارروائیاں دیکھنا۔'' یہ کہہ کر ہمدانی دروازے کی طرف بڑھا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

وہ ایک ایسی جگہ کھڑے ہو کر اندر کا جائزہ لینے لگا جہاں سے وہ ڈاکٹر زمان خان کے کلینک کا نظارہ کر سکتا تھا اور کچھ ہی لمحوں بعد نعمان

غزالی، گلاب خان اور شہروز خان باہر نکل آئے اور جیپ میں بیٹھ کر چل دیئے۔ ہمدانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن اس وقت عینی سے ملنا مناسب نہیں تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ بھی بہرحال پولیس سے تعلق رکھتے ہیں اور یقینی طور پر کوئی ایسا چکر چلا سکتے ہیں جس سے ہمدانی ان کے جال میں پھنس جائے۔ چنانچہ وہ تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے واپس چل پڑا۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ انہوں نے عینی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہوگا کیونکہ وہ انہیں وارننگ دے آیا تھا۔ اس کے بعد اس کی منزل ہوٹل نور تھی جہاں ایک اہم ہستی مقیم تھی اور اس وقت وہ اس کیس کا سب سے اہم کردار تھی۔ نور ہوٹل کے کمرہ نمبر چالیس کا دروازہ بند تھا اور یہ اچھا موقع تھا۔ وہ ایک دم اندر داخل ہوگیا۔ سامنے ہی موٹی عورت صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی جو اسے دیکھ کر اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے......؟ تم......“ وہ چیخی۔

”اب تم مجھے اخلاقیات کا سبق مت دو۔ شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا راحیلہ بیگم......!“

”میں...... ابھی......“ وہ غرائی۔

”کچھ نہیں کرو گی تم......! اب بھی تمہیں اپنی خطرناک پوزیشن کا احساس نہیں ہوا......؟“

”کیا مطلب......؟“

”کتنا بڑا فراڈ کیا ہے تم نے جو تمہاری اس موٹی گردن کو پھانسی کے پھندے میں پھنسا سکتا ہے۔ میں تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی

اپنا۔ چند الفاظ میں تمہاری اصلیت بتاتا ہوں۔ صدف تمہاری دوست تھی اور تم اس کے تمام حالات سے واقف تھیں۔ تم جانتی تھیں کہ اس نے نادرہ آباد میں ڈاکٹر شیراز گل یا عثمان شاہ سے خلع حاصل کر کے اپنے پسندیدہ اداکار سے شادی کر لی تھی اور پھر وہ دونوں بیرونِ ملک چلے گئے تھے۔ تم نے نادرہ آباد کے ایک خطرناک بدمعاش سے گٹھ جوڑ کیا۔ ایک پولیس آفیسر کے کہنے پر خود کو صدف کی حیثیت سے پیش کیا۔ وہاں تم نے صدف کے فوٹوگراف بھی خریدنے کی کوشش کی۔ یہ کام تمہارے ساتھیوں نے کئے تاکہ جب تم صدف کی حیثیت سے وہاں پہنچو تو تمہیں جھٹلانے والا کوئی نہ ہو۔ لیکن دو افراد ایسے بھی تھے جو تصویر کے بغیر تمہیں شناخت کر سکتے تھے۔ ایک نادرہ آباد کے مقامی ہوٹل کے منیجر ڈیوڈ صاحب جنہیں شہروز خان نے غنڈوں کے ذریعے اتنا پٹوایا کہ وہ تمہارے ہوٹل میں قیام کے دوران وہاں آنے کے قابل ہی نہ رہے اور دوسرے ڈاکٹر زمان خان جنہیں تم نے گلزار خان اور شہروز خان کے ہاتھوں قتل کرا دیا۔

تم نے صدف کی حیثیت سے عدالت جا کر خلع کی درخواست واپس لی اور یہاں آ گئیں تاکہ خود کو ڈاکٹر شیراز گل کی جائز بیوی کی حیثیت سے پولیس اور پبلک کے سامنے پیش کر کے عوام کی رائے ڈاکٹر شیراز گل یا عثمان شاہ کے خلاف کر دو اور الیکشن میں گلزار کو کامیاب کراؤ۔ لیکن یہاں تم لوگوں کے لئے ایک نئی پریشانی شروع ہوگئی...... یعنی فرزانہ جو تمہاری کافی باتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ اور اس کے بعد تم نے فرزانہ کو بھی قتل کرا دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟

لیکن افسوس تم نے اپنے فلیٹ میں وہ کاغذات مناسب طریقے سے

نہیں چھپائے جن میں اس گھناؤنی سازش کا انکشاف موجود تھا۔ میں تمہیں پیش کش کرتا ہوں کہ اگر اب بھی چاہو تو خود کو بچا سکتی ہو۔ میں تمہیں اعلیٰ پولیس افسران کے سامنے پیش کر دوں گا تا کہ ان کے سامنے اپنا بیان دے کر ساری اصلیت سامنے لے آؤ۔“

راحیلہ کے چہرے کا جیسے سارا خون خشک ہوگیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے کہا۔

”تم مجھے سوچنے کی مہلت دو۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی۔“

”ٹھیک ہے......! اپنا خیال رکھنا۔ میں چلتا ہوں اور دوبارہ تم سے رابطہ قائم کروں گا۔“

ہمدانی وہاں سے نکل آیا لیکن اب اسے ذرا تیزی سے کام کرنا تھا کیونکہ اگر پریس کانفرنس میں ڈاکٹر عثمان شاہ کے خلاف کچھ غلط باتیں ہو جاتیں تو اسے نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔ اپنے منصوبے کے تحت اس نے نعمان غزالی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ جسے اب تک صدف سمجھا جاتا رہا ہے، حقیقت میں وہ اس کی دوست راحیلہ ہے اور اس کی اس کیس میں بنیادی حیثیت ہے۔ وہ اس وقت قانون سے تعاون کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہے۔

”میں چاہتا ہوں کہ جب تک وہ پولیس کو اپنا بیان دینے کے لئے تیار ہو جائے، اس کی حفاظت کا معقول انتظام کر دیا جائے۔“

”ٹھیک ہے......! میں کوشش کرتا ہوں۔“ غزالی جب چند پولیس افسران کو لے کر دارالحکومت پہنچا تو انہیں نور کے کمرہ نمبر چالیس کے دروازے پر شہروز خان نظر آیا اور اسے دیکھ کر نعمان غزالی چونک پڑا۔ شہروز

خان کمرہ نمبر چالیس سے باہر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”خوب...... وقت پہ پہنچے انسپکٹر غزالی......! اندر راحیلہ کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اس نے خودکشی کر لی ہے۔ دراصل میں بھی ان تمام واقعات کی تفتیش کر رہا تھا۔ مجھے اپنی تفتیش سے معلوم ہوا کہ صدف اصل میں صدف نہیں بلکہ اس کی دوست راحیلہ ہے اور وہ کسی سازش کے تحت خود کو صدف ظاہر کر رہی ہے۔ میں اسے گرفتار کرنے یہاں آیا تھا مگر کمرے کے اندر اس کی لاش پڑی ہوئی ہے۔“ غزالی کے جبڑے بھینچ گئے۔ وہ جب پولیس افسران کے ساتھ اندر پہنچا تو یہاں واقعی راحیلہ خون میں نہائی ہوئی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ کے قریب ایک سائیلنسر لگا ہوا ریوالور نظر آ رہا تھا۔

بہر حال...... اس کے بعد موقع کی کارروائی کرنی تھی جس کے لئے غزالی نے انسپکٹر گلاب خان کو فون کر دیا تھا اور گلاب خان فوراً اس کے پاس پہنچ گیا۔ ضروری کارروائیوں کے بعد راحیلہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دی گئی۔ اس دوران میں شہروز خان ان لوگوں کے ساتھ ہی لگا رہا۔ گلاب خان البتہ اب کچھ متاثر نظر آ رہا تھا اور اس کے ذہن میں شاید کوئی احساس جنم لے رہا تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہمدانی کو بھی فون کر دیا اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں اس سے ملاقات ہوئی۔ ہمدانی کو پوری تفصیل معلوم ہوئی تو اس نے شہروز خان سے کہا۔

”تو تم راحیلہ کے بارے میں تحقیقات کر رہے تھے......؟“

”ہاں...... کیوں......؟“

”مگر تمہیں اس سے کیا دلچسپی تھی......؟ بظاہر وہ کسی فوجداری جرم میں ملوث نہیں تھی۔ تمہیں کس نے اس کے بارے میں تحقیقات کرنے کا حکم

دیا تھا......؟"

"کیا بکواس کر رہا ہے یہ پریس رپورٹر......؟ کیا میں اس شخص کو جواب دینے کا پابند ہوں......؟"

"انسپکٹر نعمان غزالی......! میں یہ کیس تقریباً حل کر چکا ہوں مگر شہروز خان سے یہ سوالات پوچھنا ضروری ہیں۔ تم لوگ جانتے ہو کہ میں نے کبھی مجرموں کا ساتھ نہیں دیا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ اس کیس میں تمہاری پوزیشن بہت مشکوک ہے۔ شہروز خان......! نادرہ آباد پولیس کی طرف سے میں اس کیس کا انچارج ہوں۔ تمہیں ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ میں تمہیں حراست میں لینے کا حکم بھی دے سکتا ہوں۔" غزالی کے لہجے پر شہروز خان نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"مجھے میرے افسر اعلیٰ نے صدف کے بارے میں تحقیقات کا حکم دیا تھا۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ صدف نہیں بلکہ راحیلہ ہے۔"

"اس تحقیقات کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی......؟" ہمدانی نے سوال کیا۔

"تم لوگ جانتے ہو کہ نادرہ آباد میں ایک اہم الیکشن ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر عثمان شاہ شہر کی بہت نمایاں اور محترم شخصیت ہیں۔ ان کے مخالف امیدوار انہیں بدنام کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم حکومت کے کارندے ہیں جو فیئر الیکشن چاہتی ہے۔ چنانچہ میرے افسر نے دور اندیشی کے تحت مجھے اس معاملے میں تحقیقات کی ہدایت کی تھی۔ مجھے فوراً ہی پتا چل گیا کہ ڈاکٹر عثمان شاہ پہلے ڈاکٹر شیراز گل کہلاتے تھے اور بیس سال قبل نادرہ آباد

میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔ یہ تمام باتیں تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"اچھی کہانی سنا رہے ہو۔ مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا تم نے......؟"

"تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ تم اپنے آپ کو خواہ کچھ بھی سمجھو مگر پولیس کسی شخص کو اپنے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتی۔"

"اور فرزانہ سے دوستی بھی اسی تحقیقات کے لئے ہوگی......؟"

"ہاں...... وہ مخالف امیدواروں کی آلۂ کار تھی۔"

"تمہیں اس کے قتل کے دن اس بلڈنگ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس بارے میں کیا کہتے ہو......؟" اس بار غزالی نے سوال کیا تھا۔

"یہ صرف ہمدانی کا الزام ہے۔ اس کا مقصد محض پولیس کو الجھانا نہیں بلکہ مجھ سے اس کارروائی کا انتقام بھی لینا تھا۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" گلاب خان نے سر ہلایا۔

"تم کہاں تھے......؟"

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ آپ اس شخص کو منع کریں کہ مجھ سے اس طرح کے سوالات نہ کرے۔ اس سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ لیکن مجھے کیا کرنا ہے۔ جناب نعمان صاحب......! آپ اس کے لئے تیار رہئے۔" یہ کہہ کر ہمدانی وہاں سے چلا آیا۔ پھر اس کے بعد ظاہر ہے، عادل پاشا ہی سے رجوع کرنا تھا کیونکہ اس کیس کا سارا کچا چٹھا اس کے پاس آ چکا تھا۔ جب اس نے عادل شاہ کے سامنے صدف کے وہ کاغذات پیش کئے تو عادل پاشا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ دیر تک وہ اسی طرح سر تھامے بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

"یار......! میں اور تم مل کر تو قیامت برپا کر دیں گے۔ قسم خدا کی

مجھے اس بات کی ذرّہ برابر خوشی نہیں ہے کہ ہمیں ہمارے کیس کا مناسب معاوضہ ملا ہے بلکہ خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ کتنی بڑی سازش پکڑی ہے اور کیسے عجیب مجرم نگاہوں کے سامنے آئے ہیں۔''

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کرنا ہے......؟''

''میں تم سے یہ نہیں کہوں گا ہمدانی......! کہ تمہارا کام ختم ہوگیا اور اب میرے کام کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم تو لمحہ لمحہ ساتھ چلیں گے۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ تم ہی دوڑتے رہے ہو۔ میں تو بس آفس میں بیٹھا رہا ہوں۔''

''لیکن یہ بات بھی میں سمجھتا ہوں مسٹر پاشا کہ اب آپ کا کام شروع ہوا ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ تجاویز اور دینا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں...... بولو......!''

''ہمیں جتنا جلد ممکن ہو، ڈیوڈ صاحب کو نادرہ آباد کے اسپتال سے دارالحکومت کے کسی پرائیویٹ کلینک میں منتقل کر لینا چاہئے جہاں ان کا علاج بھی ہو سکے۔ اس وقت ہمارے پاس وہ ایک ایسے گواہ کی حیثیت سے موجود ہیں جو اس کیس میں بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔'' عادل پاشا پُرخیال انداز میں گال کھجانے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

''ڈاکٹر سہیل میرے بہترین دوست ہیں۔ مسئلہ صرف ڈیوڈ صاحب کو وہاں سے یہاں تک لانے کا ہے اور یہ بات تم نے بالکل صحیح وقت پر کہی کہ ڈیوڈ صاحب کو وہاں سے یہاں منتقل کر دینا چاہئے۔ پتا نہیں شہروز خان سے یہ حماقت کیسے ہوئی۔ ڈاکٹر زمان خان کو تو اس نے قتل کرا دیا لیکن نہ جانے کیوں اس نے ڈیوڈ صاحب کو صرف مار پیٹ کر چھوڑ دیا۔ ہوسکتا ہے انہیں دھمکی دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا ہو کہ وہ زبان بند رکھیں۔''

''جو کچھ بھی ہے۔ اس وقت صورت حال بدل چکی ہے۔ چنانچہ ڈیوڈ صاحب کو وہاں سے لانا ہے۔''

اس کے لئے عادل پاشا نے اپنے وسائل سے کام لیا۔ رات کو تین بجے وہ نادر ہمدانی صاحب اور چند افراد کے ساتھ نادرہ آباد پہنچا تھا۔ ان لوگوں کو ڈر تھا کہ یہ بات کہیں شہروز خان کے ذہن میں آگئی تو ڈیوڈ صاحب کا خاتمہ یقینی تھا لیکن ڈیوڈ صاحب کو وہاں زندہ سلامت دیکھ کر انہیں بڑی خوشی ہوئی تھی۔ پھر بہت ہی جدوجہد کے بعد ڈیوڈ صاحب ان کے ساتھ آنے پر رضامند ہوئے۔ نہ جانے کیا کیا کہانیاں سنا کر انہیں لایا گیا تھا۔ ویسے اس وقت ان کی حالت کافی بہتر تھی۔ لیکن پھر بھی کلینک میں انہیں داخل کر کے ڈاکٹر سہیل کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ ڈیوڈ صاحب کی حفاظت کرنی ہے۔ اس کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد دوسرے ہی دن ڈاکٹر عثمان شاہ سے ملاقات کی گئی اور ڈاکٹر عثمان شاہ فوراً ہی طلبی پر عادل پاشا کے آفس پہنچ گئے۔

''جی فیروز خان صاحب......! کیسے مزاج ہیں آپ کے......؟'' عادل پاشا نے کہا تو ڈاکٹر عثمان شاہ مسکرا دیا اور پھر اس نے کہا۔

''یارو......! کتنے نام بدلوں۔ مجھے خود شرم آتی ہے۔ عثمان شاہ میرا اصل نام ہی ہے۔ بس ڈاکٹر شیراز گل کا نام میں نے مصلحتاً اختیار کیا تھا اور فیروز خان بھی۔''

''وہ پریس کانفرنس ملتوی کرا دی جائے گی جس میں آپ کے سلسلے میں کارروائی ہو رہی ہے۔ ہم اس کیس کی آخری منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

"جی فرمایئے......!"

"کیا آپ فرزانہ سے ملنے گئے تھے......؟"

"ہاں...... فرزانہ سے میری کافی سلام دعا تھی اور میں اس سے صدف کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ خاص طور سے جب مجھے یہ علم ہوا تھا کہ صدف کسی طرح نادرہ آباد پہنچی ہے۔ فرزانہ کو اس بارے میں خاصی تفصیلات معلوم تھیں۔"

"ٹھیک ہے...... اب ہم اس سلسلے میں ساری کارروائی عدالت کو پیش کر رہے ہیں اور یہ کیس آپ کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔ میں نے کاغذات تیار کر لئے ہیں۔ آپ کو ان کاغذات پر دستخط کرنے ہیں۔"

کیس گلزار خان کے خلاف پیش کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں عادل پاشا کے خصوصی مراسم کام آئے تھے جس کی وجہ سے فوراً اس کی ہیئرنگ شروع ہوگئی تھی۔ عادل پاشا نے اس کیس کے بخیے ادھیڑ دیئے۔ گلزار خان کے وکیل کو بالآخر منہ چھپا کر خاموش ہونا پڑا۔ عادل پاشا نے تفصیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب والا......! یہ مقدمہ اس لئے خصوصی توجہ اور فوری کارروائی کا مستحق ہے کیونکہ تھوڑے عرصے میں الیکشن ہونے والے ہیں اور دونوں فریق ایک دوسرے کو الیکشن میں حصہ لینے کے لئے نااہل قرار دینا چاہتے ہیں۔ میرے مؤکل ڈاکٹر عثمان شاہ ایک شریف النفس انسان ہیں۔ جب انہوں نے اپنے حلقے میں اپنی مقبولیت دیکھی اور ان کے شناساؤں نے انہیں انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کیا تو وہاں کے بدعنوان عناصر پریشان ہوگئے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ڈاکٹر صاحب جیت گئے تو ان کا یومِ حساب

آجائے گا اور ان کی بدعنوانیوں کا کچا چٹھا کھل جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے ایک خطرناک شخص گلزار خان کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دیا او رڈاکٹر صاحب کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔

انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ماضی کا سہارا لیا جس میں انہوں نے ایک گلوکارہ سے شادی کر لی تھی اور پھر اس کی بے باکی اور غلط فطرت کی بناء پر اس سے طلاق اور دوسری طرف سے خلع کی کارروائی کے مراحل برداشت کئے پھران حالات سے دلبرداشتہ ہو کر انہوں نے نادرہ آباد چھوڑ دیا اور اپنے اصل نام ڈاکٹر عثمان شاہ سے ایک دوسرے شہر میں پریکٹس کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی کزن زرمین سے شادی کر لی۔ ان کی سابقہ بیوی صدف نے ان کے خلاف خلع کی درخواست میں یہی الزام لگایا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی کزن زرمین سے عشق کرتے ہیں جو ان کے کلینک میں نرس ہے۔

مخالفوں نے اس کہانی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا لیکن انہیں صدف نہیں مل سکی۔ تب انہوں نے اسی کلب میں کام کرنے والی راحیلہ کو دریافت کیا اور چونکہ بات بیس برس پرانی تھی، اس لئے انہوں نے راحیلہ کو صدف بنا کر نادرہ آباد پہنچایا اور خلع کی درخواست واپس لے لی تاکہ ڈاکٹر صاحب کو ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کا مجرم قرار دلوایا جا سکے۔ اس دوران میں صدف کے شناسا مرکھپ گئے تھے۔ صرف دو ایسے افراد تھے جو اصل ہدف کو پہچان سکتے تھے۔ ایک ڈاکٹر زمان اور دوسرے ایک ہوٹل کے مالک ڈیوڈ صاحب۔

چنانچہ انہوں نے ایک پولیس آفیسر شہروز خان کے ذریعے ڈاکٹر زمان خان کو قتل کرایا۔ اسی شہروز خان نے ڈیوڈ صاحب پر حملہ کر کے انہیں

شدید زخمی کر دیا اور اس شرط پر انہیں زندگی دی کہ وہ اپنی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر لیں گے۔ راحیلہ نے صدف کی حیثیت سے خلع کی درخواست واپس لی اور طے یہ ہوا کہ ایک دو دن میں پریس کانفرنس بلوا کر ڈاکٹر عثمان شاہ کو نااہل قرار دلوا دیا جائے۔ لیکن ایک تیسرا کردار بیچ میں آیا۔ یہ فرزانہ تھی جو صدف اور راحیلہ کو پہچانتی تھی۔ اس نے راحیلہ کو بلیک میل کیا تو راحیلہ نے شہروز خان کے ذریعے اسے بھی قتل کرا دیا۔ راحیلہ کے بارے میں چھان بین کی گئی تو پتا چلا کہ وہ صدف نہیں ہے۔ کرائم رپورٹر ہمدانی نے راحیلہ سے ملاقات کی اور ظاہر کر دیا کہ اس کی شناخت ہوگئی ہے۔ بے وقوف راحیلہ نے فوراً ہی یہ اطلاع شہروز خان کو دے دی۔

شہروز خان جو ایک اعلیٰ افسر کی زیر ہدایت کام کر رہا تھا، راحیلہ کو بھی قتل کرنے نکل پڑا اور اس نے راحیلہ کو بھی زندگی سے محروم کر دیا۔ ان تمام واقعات کے جامع ثبوت پیش کیے جائیں گے۔ خاص طور سے وہی بات آ جاتی ہے جناب والا کہ مجرم اگر چھوٹی چھوٹی غلطیاں نہ کرتا رہے تو پھر اسے گرفتار کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہی اسے قانون کے شکنجے میں لاتی ہیں۔ مثلاً ایک ایسی تحریر جو راحیلہ نے نہ جانے کس خیال کے تحت چھوڑی تھی۔ اس میں اس نے شہروز خان کی تمام تر کارروائیوں کی تفصیل لکھی تھی کیونکہ اسے یہ خوف پیدا ہوگیا تھا کہ شہروز خان کہیں اسے بھی قتل نہ کر دے کیونکہ وہ ایک خوں خوار قاتل ہے۔

دوسری بات یہ جناب والا کہ شہروز خان نے ایک بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس نے نادرہ آباد کے ایک انتہائی معزز اور شریف آدمی ڈیوڈ کو شدید زخمی کر دیا کیونکہ وہ صدف کو پہچانتے تھے۔ وہ انہیں بھی قتل کر دیتا لیکن

انہوں نے زبان بند کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ ڈیوڈ صاحب زندہ ہیں اور عدالت میں گواہی دینے کے لئے حاضر ہیں۔''

پہلی بار شہروز خان کا چہرہ پھیکا نظر آیا۔

عدالت نے حکم دیا کہ ڈیوڈ صاحب کو پیش کیا جائے اور ڈیوڈ صاحب دو افراد کے سہارے وہیل چیئر پر عدالت کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی عادل پاشا نے ایک سفید لفافہ راحیلہ کے بیان کی حیثیت سے جیب سے نکال کر عدالت کی طرف بڑھایا تو شہروز خان کے حواس جواب دے گئے۔ اس نے گلاب خان اور نعمان غزالی کو دھکا دیا اور عدالت کے دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی لیکن اسے فوراً ہی میں پکڑ لیا گیا۔

شہروز خان کا اس طرح سے فرار ہونے کی کوشش کرنا اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تھا۔ اس کی موجودگی میں ہی ڈیوڈ صاحب نے اپنا بیان دیا اور پھر باقی کسی ثبوت کی ضرورت نہ رہی جبکہ ایک دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ وہ لفافہ جو راحیلہ کے اعتراف نامے کی شکل میں عدالت کو پیش کیا گیا تھا، بالکل خالی تھا۔ اس میں سادہ کاغذ تھا۔ عادل پاشا نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''جناب والا......! یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ مجرم کے حواس معطل کرنے کے لئے۔ ڈیوڈ صاحب تو بے شک ہماری تحویل میں تھے اور ہم نے اس لئے نہیں رات کو ان کے اسپتال سے نکال کے یہاں ایک پرائیویٹ کلینک میں رکھا تھا کیونکہ انہیں عدالت میں پیش کرنا تھا لیکن یہ لفافہ صرف ایک نفسیاتی تربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے میں شرمندہ ہوں۔''

شہروز خان کو گرفتار کر لیا گیا اور عدالتی کارروائی دوسری پیشی کے

لئے ملتوی کر دی گئی۔ تمام تر ثبوت حاصل ہو گئے تھے۔ گلاب خان نے سب سے پہلے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک وہ میرا ہم پیشہ تھا لیکن مجھے اس کے جرائم کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس سلسلے میں، میں اس کے بارے میں خود اپنی یادداشتیں پیش کروں گا۔" یہ اپنی جان بچانے کی ایک دلچسپ کوشش تھی۔ ڈاکٹر عثمان شاہ تمام الزامات سے بری ہو چکے تھے۔ صدف کا کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ اپنے پسندیدہ شخص کے ساتھ دنیا کے کون سے حصے میں ہے۔

چنانچہ یہ کیس اس انداز میں ختم ہو گیا۔ صرف اس لئے کہ شہروز خان پر مقدمہ چل رہا تھا اور اس کے ساتھ جن جن لوگوں کی اس نے نشاندہی کی تھی، انہیں خود نعمان غزالی نے پوری جدوجہد اور محنت کے ساتھ گرفتار کیا تھا۔ شہروز خان نے اپنے اوپر لگے ہوئے الزامات قبول کر لئے۔ اس نے اس دوران یہی چند قتل نہیں کئے تھے بلکہ ماضی میں بھی کچھ ایسے واقعات سامنے آئے جن میں وہ قاتل ثابت ہوتا تھا۔

چنانچہ اس کے بارے میں بہت ساری معلومات بمع ثبوت عدالت کو دی گئیں۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ تھیں۔ الیکشن ہوئے، ڈاکٹر عثمان شاہ نے شاندار کامیابی حاصل کی۔

لیکن اچھے انسان اچھے ہی ہوتے ہیں۔ انہوں نے ایک معقول رقم مزید معاوضے کی شکل میں عادل پاشا کو دی اور دلچسپ ترین بات یہ تھی کہ مس عینی کو عادل پاشا ہی کے دفتر میں ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی تھی۔



خیر خواہ

جمال شاہ کے بارے میں بہت سی روایات مشہور تھیں۔ کچھ لوگ انہیں ایک خدا رسیدہ آدمی سمجھتے تھے جس نے دولت کی ریل پیل کے باوجود تعیشات سے کنارہ کر رکھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شاہ صاحب کی جیبیں خالی ہو چکی ہیں۔ صرف حویلی باقی رہ گئی ہے اور محض اپنا بھرم رکھنے کے لئے انہوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔

بعض لوگ کہتے تھے کہ نادرہ بیگم کی موت کے بعد شاہ صاحب کا دنیا سے دل اُچاٹ ہو گیا ہے اور اسی لئے انہوں نے حویلی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔

غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ حقیقت بس اتنی سی تھی کہ شاہ صاحب فطرتاً بہت کنجوس انسان تھے۔ نادرہ بیگم کی زندگی میں تو ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ وہ ٹھہریں خاندانی رئیس، دھن، دولت میں کھیلی ہوئی اور شاہ صاحب......

نادرہ بیگم کی زندگی میں شاہ صاحب اکثر ان ہنگاموں پر جھنجلایا

کرتے جو نادرہ بیگم کے دم سے تھے۔ چار ملازم، شاگرد پیشہ میں، ان کے بال بچے، موت زندگی، شادی بیاہ، ملازموں کے ان سارے مسائل میں نادرہ بیگم برابر کی شریک رہتیں۔ میراثنیں، بھانڈ اور نقال بڑے مان سے آتے اور سینکڑوں روپے بطور انعام لے کر جاتے۔ ان کھیل تماشوں سے نادرہ بیگم بہت خوش ہوتیں اور شاہ صاحب دل ہی دل میں جلتے بھنتے رہتے۔ کبھی کبھی جب یہ سب کچھ ان کی برداشت سے باہر ہو جاتا تو وہ پھٹ جاتے۔

''یہ حویلی ہے یا کسی نوٹنکی کا منڈھوا......؟ ہر وقت یہاں نت نئے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ قطعاً برداشت نہیں کرسکتا۔''

نادرہ بیگم پہلے تو خاموشی سے ان کا گرجنا برداشت کرتیں پھر پیار سے کہتیں۔

''شاہ جی......! پھر تم ہی بتاؤ...... میں کیا کروں......؟ اللہ نے اولاد ہمارے مقدر میں ہی نہیں لکھی۔ اس کے لئے میں نہ تمہیں دوش دیتی ہوں نہ اپنے آپ کو۔ اولاد ہوتی تو گھر میں قلقاریاں گونجتیں...... مصروفیت ہوتی تو دل ان چونچلوں کو ہرگز نہ چاہتا...... یہ سارے بکھیڑے نہ پھیلاؤں تو زندہ کیسے رہوں......؟ انہی سے دل بہلا لیتی ہوں اور پھر یہ نوکر بھی بھلا کس کا منہ دیکھیں۔ ہم ان کا خیال نہیں رکھیں گے تو بھلا اور کون رکھے گا......؟''

''لٹا دو، سب کچھ ان پر لٹا دو۔ بڑھاپا نہ جانے کتنا طویل ہوگا......؟ جب ہمارے ہاتھ خالی ہو جائیں گے تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا۔ سارا نشہ ہرن ہو جائے گا۔ کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤ گی......؟ دنیا مذاق اُڑائے گی کہ کل کیا تھا آج کیا ہوگیا......؟''

''جو کل تھا، وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہ ہوگا۔ شاہ

جی......! پھر کل کی پرواہ کیوں کی جائے......؟''

''گویا میری بات نہیں مانو گی اور دولت یونہی لٹاتی رہو گی......؟''

''اتنا کچھ ہے، کرو گے کیا اس کا......؟ ساری عمر لٹاتے رہو گے تو بھی کم نہ ہوگا۔ کیوں مرے جاتے ہو......؟''

''کس کے لئے مر رہا ہوں۔ کل جب ہاتھ پاؤں نہیں ہلیں گے تو......تو......؟''

''اونہہ...... چھوڑو بھی شاہ جی......! تم نے کبھی ہاتھ پاؤں ہلائے بھی ہیں، جواب فکر مند ہو......؟ چلو کوئی اور بات کرو۔''

''بس...... میں تو صرف ایک بات کہہ سکتا ہوں۔ آئندہ اس گھر میں کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا اور نوکروں کی یہ فوج یہاں سے نکال دی جائے گی، سمجھیں تم......؟''

''جمالے......! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔'' نادرہ بیگم نے منہ کے یہ جملہ نکلتا تو اس جملے کے بعد شاہ صاحب کے ہونٹ سل جاتے، گردن لٹک جاتی اور پھر تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹ جاتے۔ بڑی سے بڑی لڑائی ہو جاتی۔ شاہ جی جنون میں کیا کچھ نہ کہہ دیتے لیکن نادرہ بیگم کے منہ سے جب لفظ ''جمالے'' نکلتا، لڑائی کا اختتام ہو جاتا۔ شاہ صاحب کی ٹانگوں کی جان نکل جاتی۔ ان کا دل چاہتا کہ وہ وہیں بیٹھ جائیں۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے کمرے تک پہنچ پاتے تھے۔

اس ایک لفظ ''جمالے'' کے کوزے میں پورا سمندر بند تھا۔ ایک ایسی کہانی جس سے شاہ صاحب کی زندگی کے تار بندھے ہوئے تھے۔ یہ لفظ ان کے لئے ایک دستی بم تھا جو ان کے کان کے قریب پھٹتا تھا اور ان کا سارا

وجود زخموں سے چور ہو جاتا تھا۔ ان کا دل اتنی تیزی سے دھڑکتا جیسے سینے
پنجرے کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ خوف سے کانپنے لگتے اور ان کی آنکھوں
کے سامنے تاریکی پھیل جاتی۔ موت کا سیاہ پھندا انہیں اپنے حلق پر تنگ ہوتا
محسوس ہوتا اور ان تمام کیفیات کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ''جمالے'' ہی تھے۔

ہاں! وہ جمال شاہ نہیں بلکہ ''جمالا'' ہی تھے، چودھری نواز کے
ڈرائیور۔ تک سک کے اچھے، سڈول اور چوڑے چکلے سینے کے مالک جبکہ
چودھری نواز نازوں کے پلے ہوئے چودھری تھے۔ دھان پان بدن، تیز ہوا
سے نزلے بخار میں مبتلا ہو جانے والے۔ میلا لباس دیکھ کر بیمار پڑ جانے
والے۔ یہی وجہ تھی کہ نادرہ بیگم کو ایک آنکھ نہ بھاتے۔ کوئی بات تو ہوتی
مردوں کی سی۔ وہ اس وقت تک کڑھتی رہیں جب تک جمال ڈرائیور بن کر نہ
آ گیا۔ جمالا، نادرہ بیگم کے من کو بھا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ان کے خشک
ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی تھی اور جمالے کے دن پھر گئے۔ کھدر کا کرتہ
اور گاڑھے کا پاجامہ، بوسکی کے کرتے اور سفید براق لباس میں بدل گئے۔
لکھنؤ کے ململ کے کرتے بڑی چاہ سے منگوائے گئے اور جمالے کے کڑیل
بدن کی زینت بن گئے۔ آنکھوں میں سرمہ اور ہونٹوں پر پان کی دھڑی
جمائے جب وہ نادرہ کے سامنے سے گزرتے تو ان کی آنکھوں میں قندیلیں
روشن ہو جاتیں۔

چودھری نواز، چودھری تھے اور سب کچھ دیکھ رہے تھے اور پھر جب
ایک روز ضرورت سے زیادہ دیکھ لیا تو دیوار پر آویزاں تلوار کھینچ کر جمالے کی
گردن پر ایک وار کیا۔ کامیاب ہو جاتے تو گردن ہی اُتر جاتی۔ ایک ماہ
اسپتال میں رہا اور نادرہ بیگم نے دن رات ایک کر دیا۔ اب وہ کھل کر آ گئی

تھیں، چودھری صاحب کے مقابلے پر۔ عزت بچانا مشکل ہوگئی تھی چودھری
صاحب کو۔ بیمار پڑ گئے اور ایک تاریک اور سرد رات، جب دم گھٹنے سے آنکھ
کھلی تو جمالے اور نادرہ بیگم سر پر موجود تھے اور ان کی گردن جمالے کے
چوڑے ہاتھوں کے شکنجے میں دبی ہوئی تھی۔

ان کی نازک گردن بھلا اس گرفت کی تاب کہاں سے لاتی......؟

منحنی سا بدن تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا۔ بیماری کا سہارا لے کر موت کا اعلان
کر دیا گیا اور پھر بڑے تزک و احتشام سے تدفین بھی ہوئی۔ کسی کو کانوں
کان خبر نہ ہوئی کہ اصل واقعہ کیا تھا لیکن دونوں کے دلوں میں چور تھا۔ ساری
دنیا کی نگاہیں مشتبہ محسوس ہوتی تھیں۔ لوگوں کو دکھانے کے لئے ایک
دوسرے سے دور ہی دور رہتے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں میں دونوں نے محسوس کیا کہ اس حویلی میں وہ
سکون سے نہیں جی سکیں گے۔ اس کے علاوہ نادرہ بیگم اگر ایک ڈرائیور سے
نکاح کر لیں تو دنیا کی نگاہیں اٹھیں گی۔ لوگ سوچیں گے اور ممکن ہے کہ کسی
کی سوچ گہرائی اختیار کر جائے۔ چنانچہ دونوں نے فیصلہ کیا کہ یہ جگہ ہی چھوڑ
دی جائے اور کسی اجنبی گوشے میں پناہ لی جائے۔

نادرہ بیگم بیوگی کا سوگ منا رہی تھیں۔ پروگرام کے تحت انہوں نے
لوگوں کے سامنے واویلا شروع کر دیا کہ چودھری صاحب کے بغیر یہ حویلی
کاٹنے کو دوڑتی ہے اور اب وہ کہیں اور جا کر رہیں گی۔ ہمدردوں نے بہت
دلاسے دیئے لیکن نادرہ بیگم نے کسی کی نہ سنی۔ جائیداد فروخت کر دی گئی اور
ساری دولت اکٹھی کرنے کے بعد ایک دن نادرہ بیگم چل دیں۔ جمالا بھی
ساتھ تھا لیکن بظاہر وہ بھی دوسرے ملازموں کی طرح علیحدہ کر دیا گیا اور اس

نے سفر بھی نادرہ بیگم کے ساتھ نہ کیا۔

پھر جب دونوں اس جگہ سے اتنی دور نکل آئے کہ کسی شناسا کا شبہ تک نہ رہا تو دونوں یکجا ہوگئے۔ نادرہ بیگم نے جمالے سے نکاح کر لیا۔ وہ حویلیوں کی عادی تھیں چنانچہ ملک کے ایک دُور افتادہ علاقے میں ایک حویلی خرید لی اور دونوں میاں بیوی اس میں مقیم ہوگئے۔

خاصی زندگی سکون سے گزر گئی تھی۔ جمالا اب جمال شاہ بن گیا تھا اور لوگ اسے اسی نام سے جانتے تھے۔ دونوں کی زندگی میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی تھی اور حویلی اسی طرح خاموش تھی۔ بس اس خاموشی میں کبھی کبھار اس وقت شگاف پڑ جاتا جب کسی ملازم کے ہاں بچہ پیدا ہوتا یا کسی کی بیٹی یا بیٹے کی شادی ہوتی۔ نادرہ بیگم خوب خوشیاں مناتیں۔ ناچ گانا ہوتا اور خوب رنگ جمتا۔ اس کے بعد پھر وہی خاموشی۔ جمال شاہ کو یہ ہنگامہ بالکل پسند نہیں تھا۔ انہوں نے زندگی میں تنگ دستی اور حسرت دیکھی تھی اور جب دولت ملی تو وہ اس خوف کا شکار ہوگئے کہ کہیں یہ سب کچھ ختم نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ دل کا چور بھی ابھر آتا تھا اور اس وقت ان کی حالت بری ہو جاتی تھی جب نادرہ بیگم انہیں غصے میں ''جمالا'' کہہ کر مخاطب کرتیں۔ انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے ان کی گردن چودھری نواز کے شکنجے میں ہے اور اس پر ان کی گرفت تنگ ہوتی جا رہی ہے۔

لیکن ہر درد کی دوا ضرور ہوتی ہے۔ بالآخر جمال شاہ اس خوف سے آزاد ہوگئے۔ اچانک نادرہ بیگم کا پتا خراب ہوگیا۔ کئی بار شدید درد اٹھا اور آخر کار یہ درد جان لیوا ثابت ہوا اور وہ زندگی کی قید سے آزاد ہوگئیں۔

شاہ صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے دل سے ایک عظیم بوجھ

اتر گیا ہو۔ اب حویلی پر صرف ان کی حکمرانی تھی۔ اب وہ اس دولت کے تنہا مالک تھے۔ لیکن وہ دولت کو خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ دولت خرچ ہو جائے تو پھر انسان دولت مند کہاں رہتا ہے؟ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام ملازمین کو نکال دیا۔ تمام فالتو اخراجات بھی بند کر دیئے۔ تنہا ذات تھی۔ کھانے پینے کے لئے بھی کوئی خاص چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی اور مصروفیت نہیں تھی۔ چھوٹے سے باغ کو سنوارتے، اپنا کھانا خود پکاتے اور اس کے بعد بھی کافی وقت بچ جاتا لیکن اس فالتو وقت کو بھی وہ تنہا گزارنا پسند کرتے۔ دوستوں کا جھنجٹ انہیں پسند نہیں تھا کیونکہ اس میں بھی روپے کے خرچ ہونے کا ڈر تھا۔

کچھ مدت کے بعد کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا اور بازار سے پرانی کتابیں خرید لائے لیکن یہ بھی پیسوں کا زیاں تھا۔ اس لئے ڈائری لکھنے کا شوق ہوا۔ ڈائری لکھنے بیٹھے تو سوچا کہ کیا لکھا جائے؟ دنیا سے اس قدر دور ہو چکے تھے کہ اب کسی سے ملاقات کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ ذہن میں یہ بات سما گئی کہ خود اپنی کتاب لکھی جائے اور اپنی کہانی میں نادرہ بیگم کے ذکر کے سوا اور کیا تھا۔

ابتدائی زندگی تو مصائب کا شکار تھی چنانچہ مصائب کا اختتام ہوا تو نادرہ بیگم کا ذکر آیا اور نادرہ بیگم کے تذکرے کے ساتھ چودھری نواز کے نام کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اپنے جرم کو انہوں نے الفاظ کی شکل دے دی۔ چودھری نواز کو قتل کرنے کے اعتراف کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے اس خوف کا اعتراف بھی کیا جس نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

ڈائری میں اپنی زندگی کے حالات بلاکم و کاست لکھ کر اٹھے تو

احساس ہوا کہ زندگی میں اب دولت کے سوا کچھ نہیں رہا۔ یہی بات باعث اطمینان تھی۔ وہ ایک ایک پیسے کی حفاظت کر رہے تھے، مبادا بڑھاپے میں کسی پریشانی کا منہ دیکھنا پڑے۔

لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تو نہ تھا لیکن افواہیں تھیں جو گردش کرتی رہتی تھیں، جس کا دل چاہتا ان کے بارے میں کوئی کہانی گھڑ لیتا جبکہ جمال شاہ صاحب خود ان کہانیوں سے بے خبر تھے۔

البتہ ان کی دولت کے قصے بہت سے لوگوں کے لئے کشش کا سبب تھے اور کبھی کبھی انہیں کسی ناخوشگوار واقعے سے دوچار بھی ہونا پڑتا تھا۔ تقریباً ایک ماہ قبل کی بات ہے کہ ایک صاحب ان سے ملاقات کے لئے آئے۔ وہ زبردستی اندر گھس آئے تھے، حالانکہ اس حویلی میں کسی تنہا انسان کو تلاش کرنا مشکل کام تھا لیکن آنے والے حضرت اس مرحلے سے بھی گزر گئے۔ جمال شاہ انہیں دیکھ کر بری طرح اچھل پڑے۔

''کون ہیں ..... کون ہیں آپ .....؟'' انہوں نے پوچھا۔

''خاکسار کو شمس الدین کہتے ہیں۔ آپ کا پڑوسی ہوں۔'' شیروانی پاجامے میں ملبوس مہمان نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''پڑوسی .....؟'' شاہ جی نے تعجب سے پوچھا۔

''جی ہاں .....! جی ہاں ..... یہ لیجئے ..... پان نوش فرمایئے .....!'' آنے والے صاحب نے جیب سے پانوں کی ڈبیا نکال کر شاہ جی کے سامنے کر دی اور پھر اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

''میں پان نہیں کھاتا۔'' شاہ صاحب نے برا سا منہ بنایا۔

''اوہ .....! اچھا اچھا .....! لیکن یہ شان کے خلاف ہے۔ خیر .....

کوئی حرج نہیں ہے۔'' شمس الدین نے خود ایک گلوری نکال کر گال میں دبا لی۔

''لیکن آپ میرے پڑوسی کہاں سے ہو گئے .....؟ حویلی کے قرب و جوار میں تو کوئی مکان نہیں ہے۔'' شاہ صاحب بے چین ہو رہے تھے۔

''جی ..... میل دو میل کا فرق بھی کوئی فرق ہوتا ہے۔ میں شہداد پور میں رہتا ہوں۔'' شمس الدین نے فرمایا۔ محلّہ شہداد پور حویلی سے تقریباً تین میل دور تھا۔

''فرمایئے کیسے آنا ہوا .....؟'' شاہ صاحب نے جھنجلاتے ہوئے پوچھا۔

''بس جناب .....! پڑوسی کا فرض نبھانے چلا آیا۔ بیگم صاحبہ کی وفات کا سن کر بخدا بڑا صدمہ ہوا۔ آپ کی تو ساری زندگی ہی ویران ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے واقعی بہت صدمہ ہے۔''

''شکریہ .....! لیکن اب تو ان کے انتقال کو بھی طویل عرصہ گزر گیا ہے۔'' شاہ صاحب بولے۔

''مرنے والے کی یاد بھی کبھی مرتی ہے۔ خواہ کتنا ہی وقت کیوں نہ گزر جائے؟ ویسے تنہا زندگی بڑی شاق گزرتی ہے۔''

''اب تو عادی ہو چکا ہوں اس زندگی کا اور بالکل ٹھیک ہوں۔'' شاہ صاحب نے بیزاری سے کہا۔

''خاک ٹھیک ہیں۔ صحت خراب ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے ہیں۔ بال پریشان ہیں، کیا اسے ہی سکون کہتے ہیں .....؟ ویسے شاہ صاحب .....! میں آپ کو ایک مشورہ دوں گا۔''

''کیسا مشورہ......؟''

''شادی کر لیں آپ......!'' شمس الدین نے کہا۔

''فضول...... یہ میری شادی کرنے کی عمر ہے......؟'' شاہ صاحب جھلا کر بولے۔

''عمر......؟ جی ابھی کیا بگڑا ہے......؟ پھر مرد تو ایک چھری کی مانند ہوتا ہے۔ جوں جوں گھسے تیز ہوتی جاتی ہے اور پھر کوئی جیون ساتھی مل جائے تو جوانی بھی ساتھ میں لگی چلی آتی ہے۔ ذرا یہ تصویر ملاحظہ فرمایئے۔'' شمس الدین نے جیب سے ایک تصویر نکال کر شاہ صاحب کے سامنے کر دی۔

''کیسی تصویر ہے یہ......؟''

''اجی دیکھئے...... دیکھئے تو سہی......!'' شمس الدین نے وہ تصویر زبردستی شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی۔ شاہ صاحب نے ایک نگاہ اسے دیکھا اور واپس ان کی طرف بڑھا دی۔

''میری بچی ہے۔ نام زرین ہے اور عمر اکیس سال، امورِ خانہ داری میں ماہر، روزے نماز کی پابند، سینے پرونے میں یکتا اور انتہائی سعادت مند بھی ہے۔ صورت شکل تو آپ نے خود دیکھ لی۔ سچ بات تو یہ ہے قبلہ شاہ صاحب......! کہ میں خلوصِ دل سے آپ کو اپنی فرزندی میں لینے کے لئے تیار ہوں۔''

''کیا فضول باتیں کر رہے ہیں آپ......؟ میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ براہِ کرم مجھ سے ایسی لغو گفتگو نہ کریں۔''

''اوہ...... قطعی فیصلہ معلوم ہوتا ہے۔ خیر کوئی حرج نہیں۔ میاں......!

میں تو پڑوسی کا حق نبھانا چاہتا ہوں۔ توبہ توبہ......! پڑوسی بے سکون ہو تو سکون سے سونا حرام ہے۔ بس اسی جذبے کے تحت چلا آیا تھا۔ کوئی مجبور نہیں ہے۔''

''آپ کو بلا اجازت اندر نہیں آنا چاہئے تھا۔'' شاہ صاحب بولے۔

''اجازت کس سے لیتا......؟ پوری حویلی سنسان پڑی بھائیں بھائیں کر رہی ہے۔ کم از کم ایک چوکیدار تو ہونا چاہئے تھا دروازے پر۔ آئے گئے کا پتا تو چلتا۔ اب دیکھ لیں میں ہی نہیں، کوئی دوسرا بھی آ سکتا ہے۔ آپ کو ایک چوکیدار ضرور رکھنا چاہئے۔ میں نے تین سال تک چوکیداری کی ہے، ایک سیٹھ صاحب کے ہاں۔ کیا تنخواہ دیں گے آپ......؟ کل سے اپنی ڈیوٹی سنبھال لوں گا۔''

''شمس الدین صاحب......! مجھے چوکیدار کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں ہے......! افوہ...... بہت ضدی ہیں آپ شاہ صاحب......! اس عمر میں بھی بچوں کی سی ضد ہے۔ چائے وائے نہیں ملے گی کیا......؟'' شمس الدین نے دروازے کی طرف دیکھا۔

''میں تنہا آدمی ہوں، خود ہی پکا کھا لیتا ہوں۔ چائے کون بنائے گا......؟''

''افسوس......! کتنا ظلم کر رہے ہیں آپ خود پر...... کیا پکاتے ہوں گے آپ۔ صحت سے پتا چل رہا ہے۔ چلئے درست ہے۔ کچھ تو حق ادا کریں۔ میں تو یہی جذبہ لے کر آیا ہوں۔ بڑے بڑے لوگوں کے ہاں کھانا پکاتا رہا ہوں۔ کیا نہیں پکا لیتا۔ قورمہ، بریانی، نرگسی کوفتے، شاہی ٹکڑے اور ہر چیز ایسی کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ لیکن بھئی پہلے تنخواہ طے ہو جائے۔ میں

کھری بات کرنے کا قائل ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کس قسم کے انسان ہیں۔ اپنے بارے میں ساری باتیں میں بھی سوچ سکتا ہوں لیکن میں نے ان سے کسی شئے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شمس الدین صاحب......! میں کی اس نظر کرم کا ممنون ہوں لیکن یقین کریں کہ مجھے شادی کی قطعاً خوا نہیں اور نہ ہی باورچی یا چوکیدار کی ضرورت ہے۔ آپ کا بہت شکریہ......! براہ کرم اب جائیے۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایں......! گویا حد ہوگئی بداخلاقی کی۔ میں تو کیا جذبہ لے کر آ اور آپ کس طرح اس کی پذیرائی کر رہے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ......! خد بداخلاق پڑوسی سے واسطہ نہ ڈالے۔ میاں......! بداخلاق پڑوسی کے تو پ میں رہنا بھی گناہ ہے۔ میں فوراً یہ مکان بدل لوں گا۔ لاحول ولاقوۃ......!

شمس الدین اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر شاہ صاحب کو گھورتے ہ باہر نکل گئے اور شاہ صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

بہرحال...... اس کے بعد شمس الدین نہ آئے۔ البتہ شاہ صاحب اپنی ڈائری کے لئے ایک دلچسپ واقعہ ضرور مل گیا۔

زندگی کے روز و شب اسی یکسانیت سے گزرتے رہے لیکن ایک جب شاہ صاحب جاگے تو انہیں اپنے کمرہ خاص میں کچھ تبدیلی محسوس ہو دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وہ سراسیمہ سے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ چیزیں غائب تھیں۔ الماری کھولی ہوئی تھی۔ وہ دیوانہ وار دوسرے کمر طرف بھاگے لیکن چور کی ہمت دوسرے کمروں میں جانے کی نہیں ہوئی اور وہ اسی کمرے تک محدود رہا تھا۔ شاہ صاحب کے حواس ہاتھ چھوڑ

لگے۔ وہ اس قیمتی سامان کی گمشدگی پر پریشانی میں تھے کہ کیا کریں؟ کیا پولیس کو اطلاع دیں؟ لیکن پولیس کے نام سے ہی ان کی روح کانپتی تھی۔ یہ لوگ بال کی کھال اتارنے کے ماہر ہوتے ہیں اور انہوں نے بال کی کھال نکالی تو؟

وہ شام تک رنج وغم میں ڈوبے رہے اور خود کو تسلیاں دیتے رہے لیکن رات کو اس وقت ان کا سکون ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا جب وہ چوری کا واقعہ ڈائری میں درج کرنے بیٹھے۔ ڈائری اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیل گئی۔ وہ ڈائری...... وہ ڈائری تو ان کے لئے موت کا پھندا بن سکتی ہے۔ اس میں تو...... اسی میں تو ان کے تمام راز محفوظ ہیں۔

"اب کیا ہوگا......؟"

رات بھر وہ ایک جگہ بیٹھے رہے۔ نیند کا آنکھوں میں شائبہ تک نہ تھا۔ پوری رات پریشان رہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس وقت کو جی بھر کر کوس رہے تھے جب ڈائری لکھنے کا خیال دل میں آیا تھا۔ خود ہی اپنے ہاتھوں پھانسی کا تختہ تیار کیا تھا۔ آہ...... اب کیا ہوگا......؟ لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ زندگی کو ایک اور روگ لگا بیٹھے تھے لیکن کمان سے نکلے تیر واپس نہیں آتے۔ تین چار منٹ گزر گئے۔ گزرے وقت کے ساتھ اضطراب کسی حد تک کم ہونے لگا تھا لیکن ایک شام نتیجہ نکل ہی آیا۔

چوڑے چکلے بدن کا ایک خوش پوش نوجوان سگریٹ پیتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ شاہ صاحب برآمدے میں نکل آئے اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔

"میں جمال شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔" نوجوان نے کہا۔ شکل سے ہی وہ خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"کیوں ملنا چاہئے ہو......؟" شاہ صاحب نے پوچھا۔

"ایک ذاتی کام ہے۔"

"میرا ہی نام جمال شاہ ہے۔ کام بتاؤ......!"

"واہ......! شاہ صاحب......! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بہت چرچے سنے ہیں آپ کے۔ کیا آپ مجھے اندر آنے کے لئے نہیں کہیں گے......؟"

"نہیں......!" شاہ صاحب بولے۔

"آپ کی مرضی......! ویسے میں ایک ضروری کام سے آیا تھا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا تم لوگ اس طرح منہ اٹھائے کیوں چلے آتے ہو......؟ کیا کام ہے مجھ سے......؟" شاہ صاحب جھنجلا کر بولے۔

"آپ کی ایک امانت تھی میرے پاس۔" نوجوان نے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر شاہ صاحب کی ڈائری نکال لی۔ شاہ صاحب اچھل پڑے۔

"خوب......! تو تم ہو وہ چور جس نے میری گھر میں چوری کی تھی۔ لاؤ ادھر لاؤ یہ ڈائری...... میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"چوری......؟" نوجوان ہنس پڑا۔

"نہیں شاہ صاحب......! میں چوری جیسے گھٹیا کام نہیں کرتا۔ پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ عزت سے حق حلال کی کھاتا ہوں۔ چوری تو وہ کرتے ہیں جو دُنیا میں اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اگر یہ بات ہے تو تم نے ضرور اس چور کو پکڑ لیا ہوگا جس نے

میرے گھر سے یہ ڈائری اور دوسری بہت سی چیزیں چرائی ہیں۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں، تم نے میرے اوپر بڑا احسان کیا ہے۔ لاؤ براہِ کرم یہ ڈائری مجھے دے دو۔"

"بے صبری اچھی چیز نہیں ہوتی شاہ صاحب......! آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ میں آپ تک کس طرح پہنچ گیا......؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"ہاں......! یہ بھی درست ہے۔ خیر اب بتا دو......!" شاہ صاحب بولے۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ پڑھا لکھا آدمی ہوں، یہ ڈائری پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ آپ کی ہے۔"

"اوہ...... اچھا اچھا...... ہاں...... ایں......؟" اچانک شاہ صاحب کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ان کے حلق میں جیسے کوئی شے اٹک گئی۔

"ڈائری پڑھ کر......؟" ان کے منہ سے بمشکل تمام نکلا۔

"جی......!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ لیکن اب شاہ صاحب کی زبان بند ہوگئی تھی۔ اس نوجوان نے ڈائری پڑھ لی ہے۔ وہ ان کے جرم سے واقف ہوگیا ہے۔ وہ ان کی، یعنی جمال شاہ کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہے۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"بہت دلچسپ اور اچھی تحریر ہے شاہ صاحب آپ کی۔" اس نے کہا۔

اور جمال شاہ کے کان میں جیسے نادرہ بیگم کی آواز ابھری۔

"جمالے......!" اور وہ سہم گئے۔

"مگر تم کون ہو......؟"

"میرا تعلق پولیس سے ہے۔ سادہ لباس میں آیا ہوں آپ کے پاس۔"

"پولیس......؟" شاہ صاحب کا بدن کانپنے لگا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے پھانسی کا پھندا ان کی گردن کے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہو۔

"نہیں شاہ صاحب......! پولیس سے میرا تعلق نہیں ہے، یہ تو میں نے یونہی تفنن طبع کے لئے کہا تھا۔" وہ شاہ صاحب سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتے رہے۔

"میں درست کہہ رہا ہوں شاہ صاحب......! پولیس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ میں وہ چور ہوں جس نے آپ کے ہاں چوری کی ہے۔ میں تو ایک شریف آدمی ہوں۔ چلمن روڈ، مکان نمبر بارہ میں رہتا ہوں۔ طویل عرصے سے بیکار ہوں۔ کوئی روزگار ہی نہیں تھا۔ بھلا ہوا اس چور کا جس نے آپ کے ہاں چوری کر کے یہ ڈائری بیکار سمجھ کر پھینک دی اور میں نے دیکھا کہ ایک صاف ستھری چیز پڑی ہے، تو اسے اٹھا لیا۔ لیکن جوں ہی میں نے اسے پڑھا میری لاٹری نکل آئی۔"

"کیا نکل آیا......؟" شاہ صاحب نے بے اختیار سوال کیا۔

"لاٹری......! وظیفہ مقرر ہو گیا سرکار کی طرف سے۔ صرف پندرہ ہزار روپے ماہوار، یہی میرا خرچہ ہے۔ بال بچے تو ہیں نہیں کہ زیادہ لالچ ہو۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے لیکن خیر گزارہ کر لوں گا۔ جی سرکار، تو میری پہلی قسط......"

"تم بلیک میلر ہو......؟" شاہ صاحب نے نہایت حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

"دیر میں سمجھے شاہ صاحب......! جی ہاں...... یہی بات ہے لیکن خون خراب نہیں ہے۔ میں حق حلال کی کھاتا ہوں۔ دیکھئے ناں......! میں آپ سے پچاس ہزار یا ایک لاکھ روپے کا مطالبہ بھی کر سکتا تھا اور آپ جیسے آدمی کے لئے یہ مشکل بھی نہ تھا کیونکہ چودھری نواز کی دولت اتنی معمولی بھی نہیں تھی کہ دو آدمی اسے ختم کر سکتے اور اب تو آپ تنہا ہی رہ گئے ہیں لیکن میں کسی کو دکھ نہیں دے سکتا۔ آنسو نکل آتے ہیں میرے کسی کو تکلیف میں دیکھ کر۔" اس نے جیب سے رومال نکالا اور آنکھیں صاف کرنے لگا۔

"مذاق اڑا رہے ہو میرا......؟" شاہ صاحب مضمحل لہجے میں بولے۔

"کیا کروں......؟ دل کمزور ہے۔ ہاں تو سرکار......! پہلی قسط ابھی مل جانی چاہئے۔"

"تم یقین کرو میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔ بس ساکھ قائم رکھے ہوئے ہوں اس لئے نوکروں کو بھی نکال دیا ہے۔ گھر کے سارے کام خود ہی کرتا ہوں۔ کسی سے ملتا بھی اسی لئے نہیں ہوں۔ میں ہر ماہ اتنی رقم کہاں سے دوں گا......؟"

"شاہ صاحب......! ایسی باتیں نہ کریں۔ بہت غمزدہ ہوں میں اس وقت، ویسے میری طرف سے مبارک باد قبول کریں کہ یہ ڈائری کسی پولیس والے کے ہاتھ نہیں لگی ورنہ کیا ہوتا......؟ ذرا سوچیں تو سہی، رسوائی، ذلت اور پھر موت...... خوفناک موت...... اور شاہ صاحب......! پندرہ ہزار روپے تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ آپ لاکھوں روپے خرچ کر کے بھی اپنی جان نہیں بچا سکتے تھے۔"

''مگر...... میں...... میں یہ رقم کہاں سے دوں گا......؟'' شاہ صاحب رو دینے والے انداز میں بولے۔

''آپ کی مرضی شاہ صاحب......! میں نے تو آپ کے ساتھ بڑی رعایت برتی ہے اب آپ نہیں مانتے تو ٹھیک ہے۔ میں یہ ڈائری پولیس ہیڈ کوارٹر میں دے دیتا ہوں۔'' -

''ارے نہیں نہیں......!'' شاہ صاحب کی آواز کانپنے لگی۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے شاہ صاحب......! آپ فیصلہ کریں، میں چلتا ہوں۔''

اب اس کا لہجہ کسی قدر سرد تھا۔ شاہ صاحب سوچ میں ڈوب گئے۔ رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

''ٹھیک ہے......! کسی سے ادھار لے لوں گا۔ گھر کا پتا دے دو، پہنچا دوں گا۔''

''بصد شوق......! مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ خوشی سے آئیں بلکہ اپنے ساتھ کسی اور کو بھی لانا چاہیں تو لے آئیں لیکن اگر آپ نے میرے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تو میں ایسے انتظامات ہر طرح سے کرلوں گا کہ ڈائری تھانے پہنچ جائے۔''

''نہیں نہیں......! میں کیا گڑبڑ کروں گا......تم بے فکر رہو۔ میں پیسے پہنچا دوں گا۔''

''ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو۔ اگر رقم ملنے میں دیر ہوئی تو......'' وہ خوفناک انداز میں مسکرایا اور شاہ صاحب گردن ہلانے لگے۔

''میرا پتا لکھ لیں۔'' اس نے پتا لکھوایا اور شاہ صاحب نے گردن ہلا

دی۔

''کب آرہے ہیں......؟''

''کل بارہ بجے......!''

''میں انتظار کروں گا۔'' وہ جانے کے لئے مڑا اور چند ساعت کے بعد نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

اس سے پہلے کبھی اتنا برا وقت نہیں پڑا تھا۔ جوانی ہوتی تو نمٹ لیتے کم بخت سے لیکن اب ان کمزور ہڈیوں سے کسی کا کیا بگاڑ لیتے۔ کیا ضرورت تھی ڈائری لکھنے کی؟ مصیبت تو خود انہوں نے بلائی تھی۔ وہ خود کو کوسنے لگے لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ آہ...... پندرہ ہزار روپے ماہوار......؟ نادرہ بیگم کے بعد تو خرچ ہی نہیں رہا تھا۔ مگر اب......؟ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور وہیں بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی۔ کوئی راہ نہ تھی، کوئی سبیل نہ تھی۔

''دینے ہی پڑیں گے۔ زندگی اور عزت بچانے کے لئے پندرہ ہزار روپے مہینے کا غم سہنا ہی پڑے گا۔''

حویلی کے ایک تاریک کمرے میں پہنچ کر ایک تہہ خانے میں گڑی ہوئی تجوری سے انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور دھندلائی ہوئی آنکھوں اور کانپتی انگلیوں سے پندرہ ہزار روپے کے نوٹ گنے اور جیب میں ٹھونس لئے۔ تجوری گڈیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کروڑوں روپے کی مالیت کے زیورات علیحدہ تھے۔ انہوں نے انہیں ٹٹولا اور دل کو کچھ تقویت پہنچی تب وہ تجوری بند کر کے واپس پلٹ آئے لیکن غم سے نڈھال تھے۔ اب جب تک زندہ ہیں پندرہ ہزار روپے ماہوار دینا ہوں گے۔

''ہائے......! یہ کیا ہوگیا......؟''

دوسرے دن گیارہ بجے حویلی سے نکل آئے۔ ایسے راستے اختیار کئے جہاں شناسا نظر نہ آئیں اور چلمن روڈ پر پہنچ گئے۔ پیدل سفر کیا تھا۔ اس لئے پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے۔ مکان نمبر بارہ کے دروازے پر دستک دی اور وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

''ارے شاہ صاحب......! بھئی وقت کی پابندی میں تو انگریزوں کو بھی مات کر دیا آپ نے...... لے آئے......؟''

''ہاں......! بڑی مشکل سے قرض ملے ہیں۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

''یہ مشکل تو اب آپ کو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو پیش آئے گی شاہ صاحب......! ورنہ دوسری صورت میں آپ ''جمالا'' کہلائیں گے۔ بلکہ تھوڑے دن کے بعد ''مرحوم جمالا'' کہلائیں گے۔ لائیے رقم کہاں ہے......؟''

جمال شاہ نے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اس نے نوٹ گنے اور جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا۔

''کیا کروں شاہ صاحب......! بتا چکا ہوں کہ گھر میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے چائے وغیرہ نہیں پلا سکتا۔''

شاہ صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا اور واپس چل پڑے۔

اس وقت وہ بہت اداس تھے لیکن کیا کرتے؟ یہ اداسی تو مقدر بن چکی تھی اور مقدر کی اس خرابی کو وہ کسی طرح دور نہیں کر سکتے تھے۔ ہر ماہ پندرہ ہزار روپے اس کے حوالے کر آتے تھے۔ کئی مہینے گزر گئے۔ اس غم سے شاہ صاحب کی صحت کچھ اور خراب ہو گئی تھی۔

ایک دن وہ بازار سے خریداری کر رہے تھے کہ شمس الدین نظر آئے۔ شاہ صاحب کو دیکھ کر انہوں نے منہ پھیر لیا لیکن شاہ صاحب کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ چہرہ روشن ہو گیا۔ برسوں کے بعد کھوئی ہوئی مسکراہٹ لوٹ آئی اور وہ شمس الدین کے پاس چلے گئے۔

''ارے شمس الدین صاحب......! آپ ہمیں پہچانتے نہیں......؟''

''نہ پہچاننے کی کیا بات ہے......؟ آپ کے سلوک کو بھول سکتا ہوں کبھی......؟'' شمس الدین نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کیا بتاؤں...... شمس الدین صاحب......! میں ان دنوں بیمار تھا۔ طبیعت چڑچڑی ہو رہی تھی۔ مگر جب آپ چلے گئے تو مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔'' شاہ صاحب بولے۔

''مگر اب کیا ہو سکتا ہے شاہ صاحب......! میری بیٹی کی شادی ہو گئی ہے۔''

''لاحول ولا قوۃ......! شمس الدین صاحب......! ہمیں آپ کی بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے اس کی شادی کر دی۔''

''چوکیدار کی ضرورت ہوگی......؟''

''ہرگز نہیں......!'' وہ بولے۔

''تو پھر باورچی کا کام دو گے......؟ آخر بات کیا ہے......؟'' شمس الدین التفات کا راز جاننے کے لئے بے چین تھے۔

''دیکھو شمس الدین......! کیا آپ نے ہمارا پڑوس چھوڑ دیا......؟''

''نہیں......! کوئی مکان ہی نہیں ملا، مجبوری تھی۔''

''اور یہ اچھا ہی ہوا...... ورنہ ہم آپ کو کہاں تلاش کرتے......؟''

"لیکن خادم کی ضرورت کیوں پیش آئی شاہ صاحب......!" شمس الدین نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

"بس کچھ کام ہے، لیکن آپ کو ہمارے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔" شاہ صاحب نے کہا اور تھوڑی سی پس و پیش کے بعد شمس الدین راضی ہو گئے۔ شاہ صاحب انہیں اپنے ساتھ حویلی لے آئے۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر شمس الدین صاحب کو پلائی اور پھر مطلب کی بات پر آ گئے۔

"بات یہ ہے شمس الدین صاحب......! کہ اس علاقے میں آپ کے علاوہ ہمارا کوئی شناسا، کوئی دوست نہیں ہے۔"

"اجی...... ہم تو دوستی کرنے آئے تھے۔ آپ نے خود کی بھگا دیا۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن یہ تو دیکھئے کہ جب کوئی مشکل پیش آئی تو ہماری نگاہ آپ کی طرف ہی اٹھی۔"

"اوہ...... کیا بات ہے......؟ کیا مشکل پیش آئی ہے تمہیں......؟" شمس الدین یک دم "آپ" سے "تم" پر اتر آئے۔

"کیا کہیں شمس الدین صاحب......! ایک نامعقول آدمی نے پریشان کر رکھا ہے۔ دھمکیاں دیتا رہتا ہے اور رقم مانگتا ہے، ہم تو زندگی سے عاجز ہیں۔ نہ جی سکتے ہیں نہ مر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری مدد کریں، دو چار ہزار روپے خرچ ہو جائیں مگر ہمیں کسی طرح اس نامعقول سے نجات دلا دیں۔"

"بس اتنی سی بات ہے...... کون ہے وہ بدبخت...... پندرہ قتل کر چکے ہیں جوانی میں...... مگر اب تو...... توبہ کر لی ہے لیکن اپنا پرویز کس دن کام آئے گا، دیکھا ہے کبھی اسے......؟"

"نہیں...... اتفاق نہیں ہوا کبھی۔" شاہ صاحب نے انکار میں سر لایا۔

"چھ فٹ کا جوان ہے۔ بارہ انچ کا چاقو رکھتا ہے۔ مجال ہے کسی کی ؤ آنکھ ملا سکے اس سے۔ رعب ہے پوری بستی پر، بس ذرا لالچی ہے۔ ممکن ہے پانچ چھ ہزار میں مان جائے۔ گردن اتار دے گا اس سالے کی۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" شاہ صاحب دانت پیس کر بولے۔

"تو نکالو ہزار کا نوٹ...... کل بات کرا دیں گے اس سے تمہاری۔" مس الدین بولے۔

"ہزار روپے......؟" شاہ صاحب حیرت سے بولے لیکن پھر پندرہ زار روپے کا خیال آ گیا اور انہوں نے جلدی سے ہزار کا نوٹ نکال کر انہیں ے دیا۔

"بس...... سمجھو کام ہو گیا تمہارا اور کوئی مشکل ہو تو بتاؤ......!" شمس دین نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے بولے۔

"نہیں...... بس یہ کام کرا دو۔ بڑا احسان ہوگا شمس الدین......!"

"اماں کہہ تو دیا کہ کام ہو گیا تمہارا...... اب خوش ہو جاؤ۔" شمس دین نے شاہ صاحب کو دلاسے دیئے اور چلے گئے لیکن انہوں نے رقم حلال ردی۔ پرویز کو دیکھ کر پہلے تو شاہ صاحب کی اپنی روح فنا ہو گئی۔ واقعی چھ ٹ کا جوان تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں، گہری سوخ آنکھیں، نسواری رنگ کا رتہ اور شلوار پہنے، گلے میں بڑا سا تعویذ پڑا ہوا۔ وہ ان کے سامنے آ کھڑا وا۔

"پرویز ہے اپنا نام...... بلایا تھا تم نے......؟" اس نے کہا اور شاہ

صاحب کی جان میں جان آ گئی بلکہ خوشی سے کھل اٹھے۔ یہ جوان واقعی کچھ کر دکھائے گا۔ انہیں یقین سا آ گیا۔

''اچھا......تو تم پرویز ہو۔ شمس الدین نے بھیجا ہے......؟''

''ہاں......! کام بتاؤ......!''

''بیٹھو میاں......! بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ تم ہی مجھے اس مشکل سے نکال سکتے ہو۔''

''بات بتاؤ شاہ صاحب......! جس کی گردن کہو اتار کر رکھ دیں تمہارے قدموں میں......تم پرویز کو نہیں جانتے۔''

''ہاں......! بس ملاقات نہیں ہوئی کبھی۔ دراصل ایک مردود آدمی نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے۔ ہر ماہ ہم سے کچھ نہ کچھ مانگنے آ جاتا ہے اور نہیں دیتے تو دھمکیاں دیتا ہے۔ کمبخت نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے۔''

''تو پرویز کس کام آئے گا شاہ جی......! پتا بتاؤ سالے کا۔'' پرویز نے شلوار کے نیفے سے چاقو نکال لیا۔

''خون خرابا تو ہم بھی نہیں چاہتے لیکن اگر وہ نہ مانے تو جس طرح چاہو اس سے نمٹ لینا۔ وہ ہماری ایک ڈائری لے گیا ہے۔ اس میں ہمارے کچھ راز ہیں جس کی وجہ سے ہم پریشان ہیں۔ ڈائری کے بارے میں پولیس کو بھی اطلاع نہیں دے سکتے کیونکہ ہمارے راز کھل جائیں گے۔ تم ہی اس سے نمٹ سکتے ہو پرویز میاں......!''

''نمٹ لیں گے......نمٹ لیں گے......مال کتنا دو گے......؟''

پرویز نے چاقو لہراتے ہوئے سوال کیا۔

''تم ہی بتاؤ......! ہم پانچ دس ہزار خرچ کرنے کے لئے تیار

ہیں۔''

''پانچ دس ہزار......؟ خواہ مخواہ اتنا خرچ کر رہے ہو شاہ جی......! خواہ مخواہ بھوکے مرو گے......تم نے مذاق کے لئے بلایا تھا پرویز کو......؟''

پرویز نے شاہ جی کو آنکھیں دکھائیں۔

''نہیں نہیں پرویز میاں......! ایسی بات نہیں ہے۔ تم ہمیں بتاؤ کتنا خرچ آئے گا......؟'' شاہ جی نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھا۔

''دیکھو شاہ جی......! ہم اس سے تمہاری چیز مانگیں گے اور اس سے کہیں گے کہ آئندہ تمہارے پاس نہ آئے۔ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا تو ٹیڑھی کر لیں گے۔ تمہاری جان ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے گی مگر رقم پچاس ہزار ہو گی۔''

ایک بار پھر شاہ جی کو چکر آ گیا۔ پچاس ہزار یکمشت، دیر تک ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا رہا۔ پھر انہوں نے خود کو سنبھال کر پوچھا۔

''کچھ رعایت نہیں کرو گے میاں......!''

''دمڑی کی نہیں، سمجھ لو......!'' پرویز نے کاروباری انداز میں کہا۔

چند لمحوں تک شاہ جی نے نفع نقصان کا حساب لگایا اور پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

''لیکن ادائیگی کام ہونے کے بعد۔''

''ٹھیک ہے......ہمیں بھروسہ ہے۔''

''تو پھر کب......؟''

''کل ہی لو......پتا بتاؤ سالے کا۔'' پرویز نے کہا اور شاہ جی نے چلمن روڈ، مکان نمبر بارہ کا پتا اسے بتا دیا۔ پتا سن کر پرویز خاموشی سے

واپس چلا گیا اور شاہ جی اپنے اس منصوبے پر بیٹھے مسکراتے رہے۔

''کاش......! ہم ضعیف نہ ہوتے تو خود ہی بہت کچھ کر لیتے لیکن عقل بڑی چیز ہے، پرویز اسے ضرور قتل کر دے گا......اور پھر......''

انہوں نے سکون کی سانس لی۔ گویا خرچ ہوئے ہزار روپے۔

''مگر شمس الدین...... ہم وہ بھی تم سے وصول کر لیں گے۔ تم بھی اس رقم کو ہضم نہیں کر سکو گے دوست......!'' شاہ جی نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ بنایا تھا، وہ ہلدی پھٹکری کے بغیر ہی چوکھا رنگ لانے والا تھا۔



پرویز نے دروازے پر دستک دی اور شاہ جی کو بلیک میل کرنے والے نوجوان نے دروازہ کھول دیا۔

''کیا بات ہے......؟'' اس نے اجنبی چہرہ دیکھ کر سوال کیا۔

''تم رہتے ہو یہاں......؟''

''ہاں......!''

''اور کوئی بھی رہتا ہے تمہارے ساتھ......؟''

''کوئی نہیں...... مگر تم......'' نوجوان نے اتنا ہی کہا تھا کہ پرویز اسے دھکا دے کر اندر گھس آیا اور پھر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ جب وہ پلٹا تو اس کے ہاتھ میں چاقو لہرا رہا تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟'' پرویز نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''نام کو چھوڑو...... کام بتاؤ دوست......!'' نوجوان ذرا بھی نہیں گھبرایا تھا۔

''اندر چلو......! کام میں بتاؤں گا۔'' پرویز نے کہا اور نوجوان

اطمینان سے اندر کی جانب مڑ گیا۔ دونوں ایک کشادہ کمرے میں داخل ہو گئے۔

''اپنا نام پرویز ہے، سنا ہے کبھی......؟''

''کیوں نہیں......! ہم ایک ہی راستے پر چلتے ہیں۔ پھر نام بھی نہیں جانیں گے، بیٹھو اور بتاؤ کیا پیئو گے، چائے یا شربت......؟''

''خون......!'' پرویز نے کہا۔

''میرا خون خراب ہے، ہضم نہیں ہوگا۔'' نوجوان خوفناک انداز میں مسکرایا اور پرویز اسے گھورنے لگا۔ وہ بھاری تن و توش کا آدمی تھا اور بے خوف بھی تھا۔ چنانچہ پرویز کو ہوشیار ہونا پڑا۔

''میرا معدہ بہت اچھا ہے، سب کچھ ہضم کر لیتا ہوں۔'' پرویز نے کہا۔

''مگر میرے خون کی پیاس کیوں لگ گئی تمہیں......؟''

''شاہ جی کی ڈائری کہاں ہے......؟ وہ میرے حوالے کر دو اور آئندہ ان کے گھر کی طرف رخ مت کرنا، سمجھے......!'' پرویز نے غرا کر کہا اور نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''خوب......! تو یوں کہو...... شاہ جی کے بھیجے ہوئے ہو۔ کوئی خاص رشتہ ہے ان سے یا مال کی بات ہوئی ہے......؟'' نوجوان نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم اس کی پرواہ مت کرو، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

''دیکھو پرویز......! بات اگر صرف مال کی ہے تو جھگڑا مت کرو۔ جس آدمی کے لئے تم یہاں آئے ہو، وہ نہایت کنجوس اور گندی ذہنیت کا

مالک ہے۔ وہ کیا ہے تم نہیں جانتے، یقین نہ آئے تو آزمالو......!''

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' پرویز نے اسے غور سے دیکھا۔

''اگر مال کی بات ہے تو مجھے بتاؤ......! کتنے میں سودا ہوا ہے تمہارا......؟''

''پچاس ہزار میں۔''

''بس......اتنی سی رقم میں تم نے معاملہ طے کرلیا......؟ بہت سیدھے آدمی ہو۔ یہ بتاؤ اگر تمہاری مستقل آمدنی ہو جائے......کم از کم پندرہ ہزار روپے مہینے کی اور دس بیس سال تک کے لئے بلکہ اس وقت تک جب تک شاہ جی زندہ ہیں تو کیا ٹھیک نہ ہوگا......؟'' نوجوان کا لہجہ اب سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''وہ کیسے......؟'' پرویز نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''میں ان سے پندرہ ہزار روپے ماہوار لیتا ہوں۔ آج سے تمہارے بھی پندرہ ہزار روپے ہوگئے۔ بات میں کرلوں گا۔ ویسے بھی وہ چالاک آدمی ہے مگر ٹھہرو......کیا وہ تمہیں ادائیگی کر چکا ہے......؟''

''نہیں......! کہہ رہا ہے کہ کام ہونے کے بعد دے گا۔''

''تو دوست......! اس کی نیکی اور شرافت کا تجربہ بھی کرلو۔ ایسا کرو......میری ایک قمیص لے جاؤ۔ میں اسے مرغی کے خون سے رنگے دیتا ہوں۔ تم اسے بتانا کہ تم نے مجھے قتل کر دیا ہے اور پھر رقم مانگ کر دیکھ لینا، ممکن ہے دے دے۔ وہ رقم منافع میں رہے گی۔ کیا خیال ہے......؟''

نوجوان مسکرایا اور پرویز کچھ سوچنے لگا، پھر ہنس پڑا۔

''واہ......! اس طرح مجھے بے وقوف بنا کر نکل جانا چاہتے

ہو......؟''

''نہیں پرویز......! غور کرو۔ اگر میں نکل بھی گیا تو آئندہ شاہ جی کے پاس تو نہیں جاؤں گا۔ اس طرح بھی تمہارا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ شاہ جی تمہیں رقم تو دے ہی دیں گے۔ اگر تھوڑا سا کام کر کے مستقل آمدنی کا انتظار کرلو تو کیا حرج ہے......؟'' نوجوان نے کہا اور پرویز ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تجویز اچھی ہے، لیکن......اگر کوئی دھوکا کیا تو......یاد رکھنا۔''

''ہاں ہاں......! یاد رکھوں گا لیکن پرویز......! میں تمہارے لئے جو کچھ کر رہا ہوں، ایک دوستانہ جذبے کے تحت کر رہا ہوں ورنہ میرے یار......! اس لائن میں آنے کے بعد خالی ہاتھ تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔'' اس نے جیب سے پستول نکال کر اچھالتے ہوئے کہا۔

اور پہلی بار پرویز کو احساس ہوا کہ اس کی تقدیر اچھی ہے۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اس نے گردن ہلائی اور بولا۔

''اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ میں بھی اس دوستی کی قدر کروں گا۔ اب تم اپنا کام کرو اور مجھے خون آلود قمیص دے دو اور ہاں......! نام نہیں بتاؤ گے اپنا......؟''

''نام تو میرا کچھ اور ہے لیکن تم مجھے شہزاد کہہ کر پکار سکتے ہو۔'' نوجوان نے کہا اور پھر پرویز کے ساتھ مکان کے دوسرے حصے کی طرف چل دیا۔ جہاں ایک ڈربے میں مرغیاں کُڑکُڑا رہی تھیں۔



پرویز نے بنڈل کھول کر شاہ صاحب کے سامنے ڈال دیا اور جمال

شاہ خوف سے اچھل پڑے۔

''یہ...... یہ کیا ہے......؟''

''وہ جس کام کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔'' پرویز نے گردن اکڑا کر کہا۔

''تو......تو تم نے اسے قتل کر ڈالا......؟'' شاہ صاحب خوف سے کانپتے ہوئے بولے۔

''ہاں...... اس نے تمہاری چیز دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے جھگڑا ہی ختم کر دیا۔''

''مم......مگر وہ ڈائری......؟''

''جب وہ ہی ختم ہوگیا تو ڈائری کس کے کام کی رہے گی......؟''

''ارے......مگر تم نے اس کے گھر کی تلاشی تو لی ہوتی......؟''

''لی تھی مگر نہیں ملی۔''

''آہ...... اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے اسے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو ڈائری پولیس تک پہنچ جائے گی۔ اس کی موت سے مجھے کیا فائدہ ہوا پرویز......! مجھے تو ڈائری چاہیئے۔''

''کیا تم اپنی بات سے پھرنا چاہتے ہو شاہ جی......! تم نے پہلے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی۔'' پرویز نے کڑکتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ......! ایک تو خون کر آئے ہو اور پھر میرا کام بھی نہیں کیا، میں تمہیں معاوضہ کس بات کا دوں......؟ میں...... میں...... میں تو بس ڈائری چاہتا ہوں۔''

''شاہ جی......! میں ایک قتل اور بھی کر سکتا ہوں۔'' پرویز نے

پھنکارتے ہوئے اپنا چاقو نکال لیا اور جمال شاہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

''تم مجھے قتل نہیں کر سکتے۔ میں پولیس کو اطلاع دے دوں گا۔'' وہ ہکلائے۔

''میری رقم نکالو شاہ جی......! ورنہ......'' پرویز غرایا۔

''یقین کرو پرویز میاں......! پورے مکان کی تلاشی لے لو۔ میں قلاش آدمی ہوں۔ پھوٹی کوڑی نہیں ہے میرے پاس۔ بس یہ جیب میں کچھ روپے پڑے ہیں، میں پچاس ہزار روپے کہاں سے دوں گا۔ مجھے مت مارو۔''

''وعدہ کیوں کیا تھا......؟'' پرویز مسکرایا۔

''بس ڈائری حاصل کرنا چاہتا تھا۔''

''ہوں...... نکالو...... کیا ہے تمہارے پاس......؟'' پرویز بولا اور شاہ جی نے جیبیں خالی کر دیں۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''درست ہے شاہ جی......! تم سے وہی نمٹے گا، ٹھیک ہی کہتا تھا سالا......! اچھا ہی ہوا جو میں نے اس کی بات مان لی ورنہ تمہارے گندے خون سے بھی ہاتھ رنگنا پڑتے۔''

''کون سی بات مان لی......؟'' شاہ جی نے چونک کر پوچھا۔

''یہ بات وہ خود ہی تمہیں بتائے گا۔ میں تمہارا خون ضرور کر دیتا مگر اس سے مجھے نقصان ہو جائے گا۔'' پرویز نے کہا اور مسکراتے ہوئے واپس پلٹ گیا لیکن اس کے آخری الفاظ نے شاہ جی کو بے چین کر دیا تھا۔

پچاس ہزار روپے ان کی کمر سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کا خیال

تھا کہ اگر پرویز نہ مانا تو پھر اسے یہ رقم دے ہی دیں گے لیکن بلا ٹل گئی تھی۔ جہاں انہیں پچاس ہزار بچ جانے کی خوشی تھی، وہیں پرویز کے الفاظ انہیں بے چین کر رہے تھے۔ خون آلود قمیص اب بھی ان کے سامنے پڑی تھی اور وہ اس قمیص کو پہچانتے تھے اور انہوں نے ایک بار اسے پہنے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن پرویز کی اس بات کا کیا مطلب تھا کہ وہ خود ہی بتائے گا؟ جب وہ مر گیا تو......تو......''

اس بات کا مطلب دوسرے دن ہی سمجھ آ گیا۔ جب وہ شاہ صاحب کی نشست گاہ میں داخل ہوا۔ شاہ صاحب اسے دیکھ کر دہشت سے اچھل پڑے۔

''بھ......بھو......بھوت......بھوت......!'' وہ دہشت سے چیخے اور وہ ہنسنے لگا۔

''نہیں شاہ جی......! میں بھوت نہیں ہوں، زندہ ہوں اور آپ کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے ہمیشہ زندہ رہوں گا۔''

''مم......مگر......مگر......''

''پرویز نے تو مجھے قتل کر دیا تھا۔ یہ کہنا چاہتے ہیں ناں......؟'' وہ پھر ہنس پڑا۔

''نن......نہیں کیا......؟'' شاہ صاحب گھٹی ہوئی آواز میں بولے۔

''نہیں شاہ جی......! وہ آپ کی طرح بے وقوف نہیں تھا۔ آپ نے وعدہ خلافی کی ہے شاہ جی......! اس لئے آج میں مجبور ہوں کہ یہ ڈائری پولیس کے حوالے کر دوں۔ آپ کے پاس سے میں سیدھا پولیس اسٹیشن......''

''نہیں نہیں...... خدا کے لئے نہیں......! میں شرمندہ ہوں۔ معافی

چاہتا ہوں مگر اس کمبخت نے تو تمہاری قمیص...... ہائے......! اس کا مطلب ہے کہ اس نے دھوکا دیا ہے۔ معاف کر دو۔ بس ایک بار معاف کر دو۔''

''سوچ لیں شاہ جی......! ویسے اب آپ کو اس کی زبان بھی بند کرنا پڑے گی۔ آپ نے جو غلطی کی ہے اس کی وجہ سے آپ کو اس ماہ سے تیس ہزار روپے دینے پڑیں گے۔ پندرہ ہزار اس کے اور پندرہ ہزار میرے...... ورنہ آپ سمجھتے ہیں...... خدا حافظ......!''

شاہ جی اسے آوازیں دیتے رہ گئے لیکن وہ باہر نکل گیا۔ تیس ہزار ہر ماہ......تیس ہزار...... وہ اپنا سر پیٹنے لگے۔ وہ بس سوچتے رہے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

پہلی تاریخ آئی تو انہیں جھک مار کر تیس ہزار روپے کی خطیر رقم اس نوجوان کے ہاں پہنچانا پڑی لیکن جب وہ یہ بھاری رقم دے کر واپس آ رہے تھے تو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یوں کام نہیں چلے گا۔ کچھ کرنا ہی ہوگا ورنہ اس طرح تو ساری دولت رفتہ رفتہ اس کی جیب میں پہنچ جائے گی اور وہ ایک دن بالکل قلاش ہو جائیں گے۔

''تو پھر...... کیا میں اسے قتل کر دوں؟ کیا ایک بار پھر میں ''جمالا'' بن جاؤں؟'' انہوں نے اپنی کلائیاں دیکھیں لیکن اب ان پر جھریوں اور ابھری ہوئی نسوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی کلائیوں میں اب اتنی جان نہیں تھی کہ کسی کا گلا دبا سکیں۔ اگر وہ کامیاب نہ ہوئے تو......؟

تو پھر ضرورت ہے ایک ایسے انسان کی جو ان کے دست راست کی حیثیت سے کام کرے۔ خواہ کچھ بھی خرچ ہو جائے۔ اس خوف سے تو نجات ملے لیکن ایسا انسان، ایسا مخلص انسان کہاں سے ملے گا جو معاوضہ لے کر

اسے حلال بھی کرے؟

آج جمال شاہ کے سوچنے کا انداز بہت مختلف تھا۔ آج وہ پوری ذہانت سے آخری فیصلے کر رہے تھے اور ان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس دن کے بعد شاہ جی کی زندگی کے معمولات میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اب وہ لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے بھی لگے اور بہت سے لوگوں سے ان کی شناسائی بھی ہوگئی۔ دراصل وہ کام کے آدمی کی تلاش میں تھے۔ پھر وہ چند دنوں کے لئے شہر سے باہر چلے گئے اور جب وہاں سے واپس آئے تو ایک تیز طرار سا نوجوان ان کے ساتھ تھا۔



شاہ جی نے لوگوں کو بتایا کہ رحمان ان کا بھانجا ہے اور پوری دنیا میں اس بھانجے کے سوا ان کا کوئی نہیں ہے؟ اب اس آخری وقت میں وہ انہی کے ساتھ رہے گا۔

''اور آپ کے بعد آپ کا وارث بھی ہوگا......؟'' کسی نے سوال کیا۔

''ارے...... اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ سوائے اس ٹوٹی پھوٹی حویلی کے۔ سو ظاہر ہے کہ یہ اس کے علاوہ اور کس کی ہوگی......؟'' شاہ جی نے جواب دیا۔ لیکن یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ان کا دل کانپ گیا۔ یہ منحوس الفاظ انہیں نہیں ادا کرنے چاہئے تھے۔

رحمان سے ان کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ بس وہ اچانک ہی مل گیا تھا انہیں۔ شاہ جی کو اس میں ذہانت کی چمک نظر آئی تھی اور نہ جانے کیوں ان کے دل میں یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ یہ نوجوان ان کی مدد کر سکتا ہے۔

معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ ابھی تین سال قید کاٹ کر جیل سے رہا ہوا ہے اور شاہ جی کے خیال میں یہ اس کی خصوصی صلاحیت تھی۔

چنانچہ انہوں نے اسے اپنے لئے کام کرنے کی پیش کش کی۔ ضروری گفتگو کے بعد انہوں نے بھانپ لیا کہ شخصیت کیسی ہے اور اس سے کیا حاصل کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ فوراً ہی دونوں کے درمیان معاملات طے ہوگئے۔ رحمان نے ایک لاکھ روپے میں انہیں بلیک میلر سے نجات دلانے کا ٹھیکہ لے لیا تھا اور پھر وہ شاہ جی کے ساتھ ان کی حویلی میں آ گیا۔

شاہ جی دل ہی دل میں مطمئن تھے کہ جب پرویز جیسا خونی انسان ان سے پچاس ہزار نہ لے سکا تو رحمان ایک لاکھ بھلا کیسے وصول کر پائے گا؟ لیکن رحمان دوسری قسم کا آدمی ثابت ہوا۔ اسے حویلی میں ان کے بھانجے کی حیثیت سے رہنا تھا۔ اس لئے تھوڑی سی ٹپ ٹاپ ضروری تھی۔ اس کے لئے اس نے دس ہزار روپے طلب کئے۔

''کک...... کیا مطلب......؟ دس ہزار کس لئے چاہئیں......؟'' شاہ جی نے گھبرا کر پوچھا۔

''شاہ جی......! کیا آپ کا بھانجا چیتھڑے لگائے پھرے گا......؟ لوگ کیا کہیں گے؟ آپ خود سوچئے کام کرنا ہے تو سلیقے سے کیا جائے۔ بس آپ مجھ سے سوال نہ کریں۔ جو کچھ میں کہوں وہ خاموشی سے کرتے جائیں اور پھر یہ رقم تو حساب میں لکھی جائے گی؟''

''کون سا حساب......؟'' شاہ جی نے پوچھا۔

''ایک لاکھ کا ٹھیکہ ہے ناں......؟''

''ایں...... ہاں...... ایک لاکھ کا ہے۔'' شاہ جی جیسے کڑوی گولی نگل

کر بولے۔

''نوے ہزار رہ گئے۔ نکالئے دس ہزار......!'' اور پھر شاہ جی کو دس ہزار روپے دینے ہی پڑے۔

رحمان کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے کے قابل تھے۔ شاہ جی اسے اپنی بپتا سنا چکے تھے اور رحمان نے چٹکی بجا کر کہا تھا کہ وہ ان لوگوں سے ڈائری یوں حاصل کرلے گا اور شاہ جی کو ہمیشہ کے لئے اس عذاب سے نجات دلا دے گا۔

رحمان کو آئے ہوئے پندرہ دن ہو چکے تھے لیکن اس نے سوائے کھانے اور اڑانے کے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ شاہ جی کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ وہ خود تو روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرلیا کرتے تھے لیکن رحمان نے کہہ دیا تھا کہ وہ کھانے پینے کا شوقین ہے۔ چنانچہ اس کے لئے کھانا ہمیشہ اچھا پکنا چاہئے۔

شاہ جی نے پہلے تو بڑی ردوقدح کی لیکن پھر یہ طے ہوا کہ کھانے کے اخراجات بھی ٹھیکے کی رقم سے منہا ہو جائیں گے اور یہ بات شاہ جی کے لئے قدرے سکون کی تھی۔ اس لئے وہ طوعاً اور کرہاً اس پر راضی ہوگئے۔

''آخر تم کیا کر رہے ہو رحمان......! پہلی تاریخ قریب آرہی ہے اور ابھی تک......'' ایک دن شاہ صاحب نے کہا۔

''شاہ جی......! پہلی تاریخ ہی کا تو انتظار کر رہا ہوں۔ اس بار رقم لے کر میں جاؤں گا اور ان لوگوں سے بات کروں گا۔''

''کیا مطلب......؟ کیا رقم اس بار بھی دینی پڑے گی......؟''

''نہ دیں...... میرا کیا جاتا ہے......؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم...... پھر تمہیں یہاں لانے سے

فائدہ......؟'' شاہ جی نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''کسی بھی کام کے فائدے فوری حاصل نہیں ہوتے شاہ جی......! آپ کو اس ماہ کی رقم تو ادا کرنی ہی ہوگی۔'' رحمان نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''لیکن وہ تمہارے حساب میں لگے گی ورنہ پھر تمہیں یہاں لانے کا فائدہ......؟'' شاہ جی نے کہا۔

''چلئے درست ہے......! آپ بڑے کنجوس آدمی ہیں۔ بہرحال...... میں آپ کی مدد کا فیصلہ تو کر ہی چکا ہوں۔'' رحمان نے کہا اور شاہ جی خاموش ہوگئے۔

مہینے کے بقیہ دن بھی رحمان نے بڑی خاموشی اور اطمینان سے کھاتے پیتے اور اینڈتے ہوئے گزار دیئے۔ البتہ اب اس نے شاہ جی سے رقم مانگنا چھوڑ دیا تھا اور شاہ جی بڑے خوش تھے۔ پہلی تاریخ کو انہوں نے تیس ہزار روپے نکال کر رحمان کو دے دیئے اور شہزاد کا پتا بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔ رحمان مسکراتا ہوا اپنی مہم پر روانہ ہوگیا۔



شہزاد اور پرویز میں خوب گھٹ رہی تھی۔ دونوں بہترین دوست بن گئے تھے۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایک مخصوص وقت پر پرویز، شہزاد کے گھر پہنچ جاتا۔ شاہ صاحب آتے، تیس ہزار روپے دیتے اور دونوں پندرہ پندرہ ہزار بانٹ لیتے۔ کنجوس بوڑھا خوب جال میں پھنسا تھا۔ اس وقت بھی وہ شاہ جی کا انتظار کر رہے تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔ شہزاد نے دروازہ کھولا تو شاہ جی کے بجائے ایک اجنبی صورت نظر آئی۔

''جی فرمایئے...... کیا بات ہے......؟'' شہزاد نے پوچھا۔

"مجھے شاہ صاحب نے بھیجا ہے۔"

"اوہ...... رقم لائے ہو......؟"

"ہاں......! لیکن اس کے ساتھ ہی تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔" رحمان نے کہا اور شہزاد نے پرویز کی طرف دیکھا۔ پرویز نے گردن ہلا دی اور رحمان اندر آ گیا۔

"میرا نام رحمان ہے۔" اس نے دونوں سے اپنا تعارف کرایا۔

"تم شاہ جی کے بھانجے ہو شاید...... میں نے تمہارا ذکر بستی میں سنا ہے۔"

"ضرور سنا ہوگا...... یہ سنبھالو تیں ہزار اور اب یہ جواب دو کہ بات چیت دوستانہ ماحول میں ہوگی...... یا......؟"

"خوب...... خوب...... گویا تیسرے امیدوار تم بھی بننا چاہتے ہو......؟" شہزاد ہنس دیا۔

"نہیں دوستو......! بلکہ تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ آئندہ ماہ سے تمہیں ایک پائی بھی نہیں مل سکے گی۔" رحمان نے کہا۔

"تم شاہ صاحب کی مدد کرو گے......؟" پرویز نے خوفناک لہجے میں پوچھا۔

"نہیں......! میں اس بڈھے کی مدد کرنے نہیں بلکہ اسے قبر میں پہنچانے آیا ہوں۔" رحمان نے کہا اور وہ دونوں چونک پڑے۔

"کیا مطلب......؟" شہزادہ تعجب سے بولا۔

"مطلب اس طرح نہیں بتایا جا سکتا۔ پہلے یہ جواب دو کہ تم لوگ میرے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہو یا نہیں......؟"

"تعاون کس طرح کا ہوگا......؟" شہزاد نے پوچھا۔

"وہ ڈائری نکال کر لاؤ جس کی بنیاد پر تم اس خبیث کو بلیک میل کرتے ہو۔" رحمان نے کہا اور شہزاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ چالاک بن رہے ہو......؟ لیکن کیا تم وہ ڈائری یہاں سے لے کر زندہ سلامت جا سکتے ہو......؟" اس نے کہا۔

"آیا ہی اس لئے ہوں اور چونکہ اس بستی میں رہنا ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ کسی سے دشمنی نہ رہے۔ تم لوگ اگر چاہو تو ڈائری نہ دو لیکن بعد میں شکایت مت کرنا۔"

"کیسی شکایت......؟" پرویز نے پوچھا اور رحمان مسکرانے لگا۔

چند لمحوں تک وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"دوستو......! دراصل ہم تینوں کا شکار ایک ہی آدمی ہے۔ اس لئے ہمیں آپس میں تعاون کرنا چاہئے۔ میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتاتا لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم دونوں نے کچھ عرصے کے لئے میری ذمے داری سنبھال لی تھی اور اس ذلیل، کمینے، نمک حرام کو پریشان کرتے رہے جس نے اپنے مالک سے نمک حرامی کی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ تمہیں اس کی کہانی کہاں تک معلوم ہے اس لئے میں شروع سے تمہیں تفصیل بتاتا ہوں۔

یہ شخص ایک بہت بڑے زمیندار چودھری نواز کا ڈرائیور تھا۔ لیکن چودھری کی بیگم اسے پسند کرنے لگی اور پھر ایک دن اس نے چودھری نواز کو قتل کر دیا اور کچھ عرصے کے بعد دونوں ان کی دولت سمیٹ کر وہاں سے چلے آئے اور یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ چودھری نواز کا ایک بیٹا تھا جسے نادرہ بیگم نے

اپنے عشق کی خاطر چھوڑ دیا تھا اور اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ آئی تھی۔

مگر دونوں کے اس طرح غائب ہو جانے سے چودھری نواز کے بھائی چودھری فراز کو کچھ شبہ ہوا۔ اپنی بھابی کے چال چلن سے وہ پہلے ہی شک میں تھے چنانچہ چودھری نواز کی لاش کو قبر سے نکال کر اس کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا اور قتل ثابت ہوگیا۔ اس کے بعد پولیس ان دونوں کی تلاش میں مصروف ہوگئی۔ لیکن وہ دونوں کمبخت ایک ایسی جگہ آ کر آباد ہو گئے تھے کہ پولیس کو ان کا نشان بھی نہ ملا۔ طویل عرصہ تک پولیس ان کو تلاش کرتی رہی اور پھر اس قتل کی فائل بند ہوگئی۔

لیکن چودھری نواز کا بیٹا اپنے باپ کے قاتل کو نہ بھول سکا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا، انہیں تلاش کرے اور ان سے انتقام لے۔ جوں جوں وہ جوان ہوتا گیا، اس کی کوششیں تیز ہوتی گئیں۔

اور پھر کچھ عرصہ قبل اسے ڈرائیور جمال شاہ کی ایک بہن کے بارے میں معلوم ہوا اور وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ جمال شاہ کی بہن سے اسے معلوم ہوا کہ کئی برس پہلے ایک بار جمال شاہ اس سے ملنے کے لئے آیا تھا اور اب بھی کبھی کبھی اس کے خط آجاتے ہیں۔ لہٰذا اس نے وہ تمام خطوط قبضے میں کئے اور انہی کے ذریعے اسے جمال شاہ کے بارے میں معلوم ہوگیا۔ تب وہ اس کے بھانجے کی حیثیت سے اس کے پاس آگیا اور ثبوت کے طور پر جمال شاہ نے اپنی بہن کو جو خط لکھے تھے، وہ پیش کر دیئے۔ جمال شاہ اپنے بھانجے کو نہیں پہچانتا تھا اس لئے صرف ان خطوط کی بنیاد پر اس نے اسے اپنا بھانجا تسلیم کرلیا۔''

رحمان باتیں کرتے ہوئے دم لینے کو رُکا۔ شہزاد اور پرویز کے

چہروں پر عجیب سے تاثرات تھے۔ تب پرویز بے اختیار بول پڑا۔

''وہ بھانجا...... میرا مطلب ہے، چودھری نواز کے بیٹے تم ہو......؟''

''ہاں دوستو......! وہ میں ہی ہوں۔ میں نے جمال شاہ کے بارے میں چھان بین شروع کر دی اور اسی دوران جمال شاہ نے بتایا کہ وہ ایک بلیک میلر کی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس نے مجھے ڈائری کی کہانی بھی سنا دی اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔

جمال شاہ کی فائل تو پولیس ریکارڈ میں موجود ہی ہے لیکن یہ تحریری ثبوت اس کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نے اسے دلاسہ دیا کہ میں بلیک میلر سے ڈائری حاصل کرلوں گا لیکن میرے ذہن میں دوسرا ہی منصوبہ تھا اور اب اسی منصوبے کے تحت میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔

چودھری نواز کے بھائی چودھری فراز کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہے اس لئے انہوں نے مجھے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ میں لاکھوں میں کھیلتا ہوں اور ان کے بعد ان کا وارث بھی میں ہی ہوں۔

جمال شاہ کو اس کے جرم کی سزا دلانے کے لئے جتنی بھی دولت خرچ ہوگی، کی جائے گی۔ جمال شاہ کے پاس جو کچھ بھی موجود ہے، وہ بھی میری ملکیت ہے اور...... میں ...... آج شام کو اسے پولیس کے حوالے کر رہا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں ساری کارروائی مکمل کر لی ہے۔ تو کیا میں نے غلط کہا تھا کہ آئندہ ماہ سے تم اس سے کچھ وصول نہیں کرسکو گے......؟'' یہ کہہ کر رحمان مسکرانے لگا۔

شہزاد اور پرویز دونوں ہی کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔

''میں اگر چاہوں تو تم دونوں کو جمال کے ساتھیوں میں شامل کر سکتا ہوں۔ لیکن میری تم سے کیا دشمنی ہے؟ تم نے تو میری غیر موجودگی میں اسے ستانے کا نیک کام کیا ہے اور میں تمہیں اس کا صلہ دینا چاہتا ہوں۔''

''صلہ......؟'' دونوں بیک آواز بولے۔

''ہاں......! ڈائری میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ وہ جمال شاہ کے خلاف بہترین ثبوت ہوگی، میں اس ثبوت کی قیمت تمہیں پچیس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ تم جانتے ہو ڈائری کے بغیر بھی جمال شاہ کی گردن پھنسی ہوئی ہے۔ پوری بستی اس بات کی گواہی دے گی کہ نادرہ بیگم اور جمال شاہ یہاں آ کر آباد ہوئے تھے اور پھر اس کے خلاف دوسرے بے شمار ثبوت بھی موجود ہیں لیکن اگر چاہو تو خود اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اعترافات بھی میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ بولو...... اب تمہارا کیا جواب ہے......؟''

''ہم تیار ہیں۔'' دونوں نے بیک وقت کہا۔

'تو جاؤ...... ڈائری لے آؤ......! ادائیگی بھی اسی وقت ہو جائے گی۔'' رحمان نے کہا اور شہزاد جلدی سے اٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ڈائری لا کر رحمان کے سامنے رکھ دی اور رحمان نے اسے دیکھنے کے بعد جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور اس کے سامنے ڈال دی۔

''گن لو......! پورے پچیس ہزار ہیں۔''

دس منٹ بعد رحمان بڑے دوستانہ انداز میں شہزاد اور پرویز سے رخصت ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جمال شاہ کی حویلی میں داخل ہوا تو جمال صاحب نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

''ملاقات ہوئی......؟''

''ہاں......! میرے داؤ خالی نہیں جاتے۔ تم نے انہیں آخری بار یہ رقم دی ہے شاہ صاحب......! آئندہ وہ کبھی تم سے کچھ نہیں مانگیں گے۔'' رحمان نے کہا اور شاہ جی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم......؟''

''جو کہہ رہا ہوں شاہ جی......! وہ حرف بہ حرف درست ہے۔''

''لیکن ڈائری...... ڈائری کا کیا ہوگا......؟''

''کل تمہیں واپس مل جائے گی۔''

''اوہ...... اوہ...... لیکن یہ سب کچھ کس طرح ہوا......؟''

''اپنا اپنا کھیل ہے شاہ صاحب......! کل ساری تفصیل تمہیں معلوم ہو جائے گی۔'' رحمان نے جواب دیا اور شاہ جی خوشی سے ہاتھ ملنے لگے۔ انہیں دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ساری رات وہ فرطِ مسرت سے جاگتے رہے۔ پھر دوسرے دن ناشتے کے بعد انہوں نے رحمان سے پوچھا۔

''ڈائری کب مجھے واپس ملے گی رحمان......!''

''جب تم کہو جمال شاہ صاحب......! میرا کام ختم ہو گیا ہے اور آج میں جا رہا ہوں۔''

''اوہ...... لیکن ڈائری......؟'' شاہ جی بولے اور رحمان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ڈائری نکالی اور ان کے سامنے رکھ دی۔ شاہ صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔ انہوں نے اس منحوس ڈائری کو اٹھا لیا جس نے انہیں کنگال کر دیا تھا، جس نے انہیں سولی پر لٹکا دیا تھا۔ خوشی سے ان کے پیٹ میں سانس نہیں سما رہا تھا۔ آج تو زمانے بھر کی خوشیاں ان کے حصے میں آ گئی تھیں۔ رحمان نے بہت سے نوٹ نکال کر ان

کے سامنے ڈال دیئے۔

''یہ...... یہ کیا......؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کی وہ رقم جو آپ نے ان بلیک میلروں کو دی تھی۔ کتنی رقم دی تھی آپ نے آج تک انہیں......؟''

''تت...... تقریباً ایک یا ڈیڑھ لاکھ......!'' شاہ جی بولے۔

''پورے ڈیڑھ لاکھ ہیں گن لیں اور ہاں...... میرا حساب بھی کر دیں۔''

''اوہ...... تم تو...... جادوگر ہو رحمان......! تم نے وہ کر دکھایا ہے جو کوئی نہ کر سکا تھا مگر...... مگر یہ سب ہوا کیسے......؟ یہ سب......؟'' شاہ صاحب نوٹ سمیٹتے ہوئے بولے۔

''بس اپنا کھیل ہے شاہ صاحب......! اب آپ میرا حساب کر دیں۔''

''ہاں......! ضرور کرو...... دس ہزار روپے کے تم نے کپڑے بنوائے، بولو ہاں......!''

''ہاں......!'' رحمان نے گردن ہلائی۔

''دس ہزار کھانے پینے میں خرچ ہوئے۔ بولو ہاں......!''

اور رحمان نے اعتراف کیا۔

''بیس ہزار روپے تم کل لے گئے تھے ان کے لئے...... وہ رقم اس تیس ہزار سے علاوہ تھی۔''

''درست ہے......!'' رحمان سکون سے بولا۔

''کل ہوئے ستر ہزار روپے اور تمہارے رہ گئے تیس ہزار روپے۔''

''درست ہے......! آپ مجھے تیس ہزار روپے دے دیں۔'' رحمان نے جواب دیا۔

''یہ لو اپنی رقم رحمان......! تمہاری بڑی مہربانی ہوگی، میں بڈھا آدمی ہوں، ہاتھ پیر تو ہلا نہیں سکتا۔ جو کچھ رہ گیا ہے اسی میں گزارہ کرنا ہے۔'' شاہ جی لجاجت سے بولے۔

''ٹھیک ہے شاہ صاحب......! تیس ہزار ہی دے دیں۔'' رحمان راضی ہو گیا اور شاہ جی نے نہایت دکھی دل سے ڈیڑھ لاکھ کی رقم سے تیس ہزار نکال کر رحمان کے حوالے کر دیئے۔ رحمان نے نوٹ جیب میں رکھے اور اٹھ گیا۔

''تو اب مجھے اجازت دیں شاہ صاحب......! میرا کام ختم ہو گیا۔'' اس نے کہا اور شاہ جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ رحمان کے ساتھ وہ اس کمرے میں آئے اور رحمان نے اپنا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ شاہ جی بڑے پُرتپاک انداز میں اسے حویلی کے دروازے تک چھوڑنے آئے۔

رحمان کے جانے کے بعد انہوں نے جیب میں رکھی ہوئی ڈائری اور نوٹوں کو تھپتھپایا اور ان کے بدن میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگیں۔

''کمبخت تیس ہزار اور لے گیا۔ خیر...... کوئی بات نہیں۔ انسان سے کبھی کبھی ایسی غلطی ہو جاتی ہے کہ اسے بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔'' وہ یہی سوچتے سوچتے حویلی کے اس کمرے کی طرف بڑھے جہاں ان کی تجوری زمین میں دفن تھی۔ زیادہ رقم جیب میں رکھنا خطرناک ہوتا ہے۔ انہوں نے سوچا اور تجوری کھولی۔ لیکن...... لیکن تجوری اتنی تاریک کیوں ہے؟ اس میں تو سفیدی جگمگاتی تھی۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پھر جھک کر تجوری میں ہاتھ ڈال دیا۔

ایک لمحے کے لئے ان کے دل کی حرکت رُک سی گئی۔ ان کا ہاتھ

تجوری کے خالی پیندے سے ٹکرایا۔ انہوں نے تیزی سے ہاتھ ادھر ادھر مارا لیکن پھر پوری تجوری میں سے صرف ایک چیز ملی اور وہ تھا ایک لفافہ...... ہاتھ لفافہ اٹھا کر باہر آ گیا لیکن حالت اس قابل نہ تھی کہ لفافہ کھول سکتے۔ دیر تک وہ لفافہ لئے بیٹھے رہے۔ کلیجا منہ کو آتا تھا۔ نہ جانے کتنے لمحوں کے بعد انہوں نے لفافہ کھولا۔ اپنی جگہ سے کھسکے اور زمین پر گھسٹتے ہوئے روشنی میں آ گئے۔ پاؤں اس قابل نہیں تھے کہ کھڑے ہو سکتے۔ اندر سے نکلنے والے پرچے کی تحریر مشکل ہی سے پڑھی گئی۔

''شاہ جی......!

میں آپ کا سچا ہمدرد ہوں۔ آپ کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ اس بے پناہ دولت نے آپ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ ہر کوئی اس کی وجہ سے آپ کو ستاتا تھا۔ یہ آپ کی سب سے بڑی دشمن تھی اس لئے ان دونوں بلیک میلروں کے ساتھ ساتھ میں آپ کو آپ کے اس دُشمن سے بھی نجات دلا رہا ہوں۔

ڈائری آپ کے پاس آ گئی ہے اسے فوراً تلف کر دیں تاکہ اس کے بعد اطمینان سے جی سکیں۔ دیکھ لیجئے......! آپ کو اس تیسرے دُشمن سے نجات دلانے کا میں نے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ جو رقم آپ کے پاس ہے اس سے آپ زندگی کے بقیہ دن سکون سے گزار سکتے ہیں اور اب آپ کی زندگی ہی بھلا کتنی رہ گئی ہے۔

اُمید ہے آپ جب تک زندہ رہیں گے...... میرے احسان مند رہیں گے۔

آپ کا...... رحمان......!''



شگاف

سوہنی کے دیس کی تھی، سرزمین حسن وعشق گجرات کے پاس چناب کی ایک شاخ کے کنارے آباد گاؤں گجنارے کی جہاں سب سے بڑی آبادی مچھیروں ہی کی تھی۔ اس کا تعلق بھی مچھیروں کی برادری سے ہی تھا۔ وہ گجنارے میں چناب کی شاخ کے کنارے آباد مچھیروں کی بستی کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی جہاں سوہنی کے حسن و جمال کی داستانیں اور اس کے باپ تلا کی کہانیاں بکھری ہوئی تھیں اور صبح ہی صبح جب سورج بھی مکمل طور پر نہیں نکلا ہوتا تھا۔ خوب صورت، سہانی، خوش گوار ہوائیں، چڑیوں کی آوازوں کے چھنکارتے گھنگرو، جگہ جگہ کھلے ہوئے خودرو گلابوں کے جھنڈ جن سے کچھ فاصلے پر املتاس کے گچھوں کا زرد آبشار اور مچھیرنوں کی بھرپور سرگرمیاں، دور دور تک چاندی جیسے پیٹ والی بکھری ہوئی مچھلیاں جنہیں بڑے چاؤ سے مچھیرنیں ٹوکریوں میں سجاتی تھیں۔

اور ان کے مرد سروں پر یہ ٹوکریاں لادے گجرات کی مچھلی منڈی میں جا کر بیچتے اور واپسی پر اپنی اپنی چاہتوں کے لئے ضرورت کی چیزیں

خرید کر لاتے۔ مچھیرنوں کے سوہنی کی شان میں گائے ہوئے سارے گیت اسے ازبر تھے۔

میں سوہنی دی تعریف کی آکھاں
(میں سوہنی کی تعریف کیا بتاؤں)
تھیں مہندیاں تے کن وِچ بالیاں نے
(ہاتھوں میں مہندی اور کانوں میں بالیاں)
مکھ کھڑیا اے سہرے گلاب وانگوں
(چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا)
اکھیں کجلا تے لب تے لالیاں نے
(آنکھوں میں کاجل ہونٹوں پر سرخی)
ایڈے لمبے تے کالے بال اوہدے
(اتنے لمبے اور کالے بال اس کے)
جیویں چڑھیاں ہاٹھاں کالیاں نے
(جیسے کالی گھٹائیں چڑھی ہوئی ہوں)
دل والیو! اوس نوں بچ جانا
(دل والو! ان سے بچ جانا)
اوہدیاں چالاں بڑیاں نرالیاں نے
(ان کی چالیں بڑی نرالی ہیں)

ناجی جب بھی یہ گیت سنتی اس کی آنکھوں میں سوہنی کا چہرہ ناچ اٹھتا جسے نہ صرف گجرات بلکہ اس کے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے گاؤں والے بھی اچھی طرح جانتے تھے اور اس کی داستانیں ہر سمت بکھری ہوا کرتی تھیں

لیکن خود ناجی، جس کا اصل نام ناجیہ تھا اور بگڑ کر ناجی ہوگیا تھا، کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ محبتوں کے اس دیس میں وہ محبتوں سے اس قدر محروم کیوں ہے؟ بہت بعد میں اسے اپنی شکل صورت کے بارے میں احساس ہوا لیکن وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ شکل صورت تو محبتوں کے راستوں میں حائل نہیں ہوتی۔ اسے کہیں سے بھی محبت نہیں ملی تھی۔ اماں بھی تھی، اور باپ بھی تھا۔ ایک بہت ہی غریب گھرانے میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔

مچھیروں کی یہ پوری بستی ہی غریب لوگوں کی بستی تھی۔ اولاد غریب کے ہاں ہو تو غربت اس کی محبت پر تو اثر انداز نہیں ہوتی لیکن اس غریب گھر میں اس کا اکلوتا وجود بھی بے معنی تھا۔ باپ دوسرے مچھیروں کے ساتھ مچھلیاں پکڑ کر شہر جاتا تھا اور رات کو ٹھرے کے نشے میں ڈوبا گھر آتا تھا۔ کھانا کھاتا تھا اور ماں کو پیٹتا تھا۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر کسی کونے میں جا پڑتا تھا جیسے اس گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی بھی نہ ہو۔

یہی کیفیت ماں کی بھی تھی۔ صبح باپ گھر سے نکلتا تو اس کے تھوڑی دیر بعد وہ بھی منہ ہاتھ دھوتی، بالوں میں کنگھی کرتی، ہونٹوں پر دنداسے کی دھڑی جماتی، گھر سے باہر نکل جاتی اور دروازہ باہر سے بند کر جاتی۔ ایسے وقت میں ناجی یا ناجیہ گھر میں اکیلی بیٹھی دیواروں کو تکتی رہتی تھی۔ کبھی کھیلنے کو جی چاہتا تو صحن میں لگے نیم کے درخت سے جھڑنے والے پتے چننے لگتی۔ نمکولیوں کے موسم میں نیم کے درخت پر نمکولیاں آتیں تو اسے قدرتی کھلونے مل جاتے۔ کچی پکی نمکولیوں کی اسے خوب تمیز ہوگئی تھی۔ پکی نمکولیاں اس کا پسندیدہ پھل تھیں اور کچی نمکولیاں، کھلونے جن سے وہ عجیب وغریب چیزیں بنایا کرتی تھی۔ بلکہ ایک عمر تک تو اس نے پھلوں میں صرف

نمکولیاں ہی کھائی تھیں۔

ماں کو یہ پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ وہ بند گھر میں بھوکی ہوگی۔ وہ خود بھی اس کی عادی ہوگئی تھی۔ بھوک پیاس کا اب اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ماں واپس آتی تو پہلے اپنا حلیہ خراب کرتی۔ بال بکھرا لیتی، پرانے کپڑے پہن لیتی۔ پھر دال چن کر چولہے پر رکھ دیتی۔ گھر میں صبح ناشتے سے کچھ بچا ہوتا تو اسے کھانے کے لئے دے دیتی۔ یہ بھی شاید اس کی مہربانی تھی۔ اسے خود کھانا مانگنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک آدھ بار وہ بھوک سے روئی تو کھانے میں اسے جوتیاں اور گالیاں ملی تھیں اور پھر اس نے سمجھ لیا کہ بھوک ایک ایسا گناہ ہے جس کے اظہار پر سزا ملتی ہے۔ ماں کا پیار باپ کی شفقت کیا ہوتی ہے، اسے بالکل معلوم نہیں تھا۔ ایسی بے تکی باتوں میں لوگ صرف وقت ہی ضائع کرتے ہیں۔ اس کا سارا بچپن یونہی گزر گیا تھا۔

پھر ایک دن یوں ہوا کہ زہریلی شراب پی کر اس کا باپ مر گیا اور اس کے پاس صرف ماں رہ گئی۔ گویا ٹھراپی کر گھر آنے والے اور شور مچانے والے کی کمی ہوگئی تھی۔ بس اور کوئی فرق نہیں پڑا تھا گھر کے ماحول پر۔ ماں بدستور صبح گھر سے نکل جاتی تھی۔ کھانے پینے کے معاملات بھی محدود تھے۔ باپ کے جانے سے ماں کو تکلیف ہوتی ہو تو ہوتی ہو مگر ناجی کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک فائدہ ہوتا تھا اور وہ یہ کہ اسے سونے کے لئے ایک چارپائی مل گئی تھی جس کا اب مصرف نہیں تھا۔

لیکن پھر ایک دن نہ جانے کیا ہوا کہ مچھیروں کی غیرت جاگ اٹھی۔ انہوں نے گھر کے دروازے پر آکر خوب ہنگامہ کیا اور دونوں ماں بیٹیوں کو گھر سے نکال دیا۔ ماں اسے ساتھ لے کر چل پڑی۔ کچھ فاصلے پر

ایک میڈیکل کیمپ لگا ہوا تھا۔ آس پاس کے گاؤں دیہاتوں کے لوگ وہاں اپنی بیماریوں کی دوا لینے کے لئے لائن لگائے ہوئے تھے۔ وہیں پر ناجیہ کی ماں کو ڈاکٹر سلطانہ ملیں۔

یہ بہت ہی مہربان اور نیک عورت تھیں جو ان دونوں ماں بیٹیوں کو بے سہارا دیکھ کر انہیں اپنے ساتھ لے گئیں۔ یہ نئی جگہ ناجیہ کے لئے بڑی حسین تھی۔ یہاں چھوٹا سا باغ بھی تھا۔ دوسرے نوکر چاکر بھی تھے۔ خاص طور سے گھر کا باورچی جمن بہت مہربان انسان تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس نے ناجیہ کی ماں سے گہری دوستی کر لی اور اسے بہت سی چیزیں دی تھیں۔ سامنے والے لان پر نیم کا درخت تھا جس سے ناجیہ کی بڑی شناسائی تھی۔

بہرحال...... ہنگامے نہ ہوں تو زندگی سرد ہوتی ہے۔ ایک دن ہنگامہ ہوا۔ نہ جانے کیوں ڈاکٹر سلطانہ کے باورچی نے اس کی ماں کو چاقو کے پے در پے وار کر کے ہلاک کر دیا۔ باورچی کو پولیس لے گئی۔ بس اس سے زیادہ ناجیہ کو کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ ہاں کچھ پولیس والوں نے اس سے باورچی اور اس کی ماں کے بارے میں باتیں پوچھی تھیں اور اسے جو کچھ معلوم تھا اس نے بتا دیا تھا۔ ڈاکٹر سلطانہ صاحبہ بہت شریف النفس خاتون تھیں۔ انہوں نے اس سب کے باوجود ناجیہ کو کوٹھی سے نہیں نکالا۔ ان کے خیال میں یہ بے سہارا بچی بے قصور تھی۔

چنانچہ انہوں نے اسے کوارٹر کے بجائے اندر سونے کی جگہ دے دی اور اس کے سپرد چھوٹی موٹی صفائی کا کام کر دیا جسے انجام دیتے ہوئے وہ جوان ہوگئی۔

ڈاکٹر سلطانہ کی بیٹی رافعہ کو بچوں کو پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ گھر کے دوسرے بچے تو اس کے قابو میں نہیں آتے تھے لیکن ناجیہ کو خود بھی دوسرے بچوں کو دیکھ کر پڑھنے کا شوق ہوگیا تھا۔ چنانچہ رافعہ بی بی جو کچھ اسکول سے پڑھ کر آتی تھیں۔ اسے اسکول کی ٹیچرز ہی کے انداز میں ناجیہ کو بھی پڑھاتی تھیں اور جو کچھ وہ ناجیہ کو بتاتی تھیں وہ اس کے ذہن میں پوری طرح بیٹھ جاتا تھا۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے اسکول میں بھی داخل کرا دیا گیا۔

ایک دن ڈاکٹر سلطانہ کا بیٹا ناصر صوفے پر بیٹھا انگریزی کی کتاب کے الفاظ رٹ رہا تھا اور ڈاکٹر سلطانہ گھٹنوں پر شالی ڈالے کچھ پڑھ رہی تھیں تو ناصر نے ایک غلط لفظ کی گردان شروع کر دی۔ ناجیہ نے اس لفظ کی تصحیح کر دی اور جب ناصر اس سے بحث کرنے لگا تو وہ ناصر کو سمجھانے لگی۔ بالآخر بات ناصر کی سمجھ میں آ گئی۔ ڈاکٹر سلطانہ غور سے ناجیہ کو دیکھ رہی تھیں۔ پھر ان کی آواز ابھری۔

''ناجیہ......! ادھر آؤ......! یہ انگریزی تم نے کہاں سے سیکھی......؟''

''رافعہ بی بی سے......!''

''اُردو بھی سیکھی ہے......؟''

''جی ......اور حساب بھی۔'' وہ معصومیت سے بولی تو ڈاکٹر سلطانہ سوچ میں ڈوب گئی پھر بولیں۔

''امتحان لوں تمہارا......؟''

''لے لیجیے......!'' اس نے جواب دیا۔

تب ڈاکٹر سلطانہ اس سے کچھ پڑھوانے لگیں اور اس نے اسے

ٹھیک ٹھیک پڑھ دیا۔ ڈاکٹر سلطانہ نے گردن ہلائی اور بولیں۔

''جاؤ...... اپنا کام کرو۔'' پھر کچھ دن کے بعد ڈاکٹر صاحبہ نے اس سے پوچھا۔

''ناجیہ......! تم نرس بنو گی......؟'' انہوں نے نرسنگ کے بارے میں اسے تفصیل سمجھائی اور کہنے لگیں۔

''اس طرح تمہاری زندگی خودمختار ہو جائے گی کہیں بھی تم ملازمت کرسکتی ہو۔ تم نہیں جانتیں ناجیہ......! اس معاشرے میں لڑکیوں کے لئے بڑی الجھنیں ہیں۔ شکل صورت نہ ہو، اعلیٰ تعلیم اور دولت نہ ہو تو وہ خود اپنی ذات پر بوجھ بن جاتی ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ وہ اپنا پیٹ بھر سکیں۔ میری رائے ہے کہ تم نرسنگ کا کورس کرلو۔ میں اس میں تمہاری مدد کروں گی۔''

''جی......! میں تیار ہوں۔'' ناجیہ نے جواب دیا اور ڈاکٹر سلطانہ نے اس کی بھرپور مدد کی۔

اس نے نہایت جانفشانی سے کورس کرلیا اور ڈاکٹر سلطانہ نے اسے اسپتال میں نوکری بھی دلوا دی۔ اسپتال ہی کے کمپاؤنڈ میں اسے رہائش گاہ بھی مل گئی تھی۔ وہ ڈاکٹر سلطانہ کی بہت احسان مند تھی۔ رافعہ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی، اور اکثر اسے ساتھ لے کر بیٹھ جاتی تھی۔ ناجیہ کی آواز بہت خوب صورت تھی۔ اسے اپنا گاؤں گجنارے، اچھی طرح یاد تھا۔ اس نے کئی بار رافعہ باجی کو اپنے گاؤں کی کہانیاں سنائی تھیں۔

سوہنی کی سرزمین کے قصے جو حسن وعشق کی داستان سے بھرے پڑے تھے اور ڈاکٹر سلطانہ کی بیٹی رافعہ اس سے گجنارے کی کہانیاں بڑی شوق سے سنا کرتی تھی۔ رافعہ کو بھی سوہنی کے دیس کی کہانیاں بہت پسند تھیں اور

ناجیہ اسے اپنی حسین آواز میں سناتی۔

اس عشق دے بحر طوفان اندر
(اس عشق کے سمندری طوفان میں)

جیہڑا پسیا اس دی جان لٹ گئی
(جو پیا اس کی جان ختم ہوگئی)

ہیر تڑفدی مری پنجاب اندر
(ہیری تڑپتی مرگئی پنجاب میں)

جان سسی دی وچ مکران لٹ گئی
(سسی کی جان گئی مکران میں)

صاحباں شوق دے نال تیار ہو کے
(صاحباں شوق سے تیار ہوکر)

ہوئی مرزے دے نال روان لٹ گئی
(مرزا کے ساتھ چل پڑی)

جی اے راویاں مہینوال نوں آکھدا
اے
(راوی مہینوال سے کہتا ہے)

کی ہویا جے تیری دُکان لٹ گئی
(کیا ہوا جو تیری دُکان لٹ گئی)

اور اس کی حسین آواز میں یہ بول سن کر رافعہ بے خود ہو جاتی تھی۔
زندگی کی حقیقی مسائل ختم ہوئے تو گرانی کا احساس ہوا۔ سوہنی کے حسین دیس کا حسن ناجیہ کو نہیں ملا تھا۔ اس کا چہرہ بدصورت تھا، ہاں...... اگر شکل صورت

نظر انداز کر دی جاتی تو جوانی کی عنایات بھرپور تھیں لیکن اصل چیز تو چہرہ ہوتا ہے جو راستوں کا تعین کرتا ہے، وہ جن کے دلوں میں شیطنیت ہوتی ہے، محبت اپنانے کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔

تنہائیوں میں اکثر اس کی آنکھوں میں بھی جوانی کے خواب جاگ اٹھتے۔ اسے کسی ایسے دل والے کی تلاش تھی جو اس کے وجود کو اندر سے کھنگالے۔ اس پیار کی شکل دیکھ لے جو اس کے سینے میں چھپا ہوا ہے۔ پیار سے محروم رہنے کے باوجود اس کے دل میں پیار کے انمول دفینے چھپے ہوئے تھے جن کے لئے اسے کسی قدردان کی تلاش تھی اور اس سے جوانی کے خواب چھیننے والا اسے زندگی کی ایک اور تلخ حقیقت سے آشنا کرنے والا پہلا مرد، فیروز تھا۔

درمیانی شکل وصورت کا، بھرپور جوان جس کے بھائی کا آپریشن ہوا تھا اور مریض کی تیمارداری ناجیہ کا فرض تھا۔ وہ دوسری نرسوں کی بہ نسبت زیادہ دیانت داری سے اپنا فرض پورا کرتی تھی اور شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے کسی کی محبت کی تلاش تھی۔ اچھی شکل صورت کی نرسیں اپنے پسندیدہ مریضوں کے پاس زیادہ وقت گزار دیتی تھیں۔ ان سے فرصت ملتی تو ڈاکٹروں، اسپتال کے دوسرے عہدے داروں سے ہنسی مذاق، ڈیوٹی روم میں آپس کی چہلوں میں بھی خاصا وقت لگ جاتا تھا۔ اس لئے عام مریض ان کی توجہ سے محروم رہتے تھے جبکہ ناجیہ ان سب کے منہ نہیں لگی تھی۔

اسے پسند ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹروں کا رویہ خشک ہوتا، ڈیوٹی انچارج صرف کام ہی کی باتیں اس سے کرتے۔ ہاں...... اگر کسی تختۂ مشق کی ضرورت ہوتی تو اسے منتخب کرلیا جاتا۔ اس کا ریکارڈ بہت مستحکم ہوتا جا رہا

تھا اور سنجیدہ اور معمر ڈاکٹروں کی نگاہوں میں وہ قابل اعتبار نرس سمجھی جاتی تھی۔ اب تو ڈاکٹر خوشی سے آپریشن میں اس کی سروس طلب کرتے تھے۔

فیروز کے بھائی کا آپریشن بھی کافی پیچیدہ تھا مگر کامیاب ہوا تھا۔ اسپتال کی انتظار گاہ میں جب فیروز نے اس سے آپریشن کے بارے میں پوچھا تو اس نے اس سے بڑی ہمدردی سے گفتگو کی۔

''آپ بالکل مطمئن رہیں۔ آپریشن پوری طرح کامیاب ہوا ہے۔''

''اوہ..... نرس.....! میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں۔ کیا میں اپنے بھائی کو دیکھ سکتا ہوں .....؟''

''تھوڑی دیر انتظار کرلیں۔ انہیں بہت جلد وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا۔'' اس ساری گفتگو میں کوئی خاص احساس نہیں تھا۔ اس نے اپنی فطرت کے مطابق یہ تمام بات چیت کی تھی۔ پھر یہ بھی اتفاق تھا کہ جس وارڈ میں فیروز کے بھائی کو رکھا گیا تھا، وہیں ناجیہ کی ڈیوٹی بھی رہی۔

اس نے دوسرے مریضوں کی طرح فیروز کے بھائی کی بھی خدمت کی لیکن فیروز اس سے بہت متاثر ہوگیا اور تھوڑے ہی دنوں میں ناجیہ نے اس کی آنکھوں میں ممنونیت کے علاوہ اور بھی کچھ محسوس کرلیا۔ لیکن اس خیال پر توجہ دینا اس کے پیشے کے منافی تھا۔ فیروز کا بھائی صحت یاب ہوکر رخصت ہونے لگا تو فیروز نے ناجیہ کو تنہائی میں بلایا اور بولا۔

''مس ناجیہ.....! میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں۔ آپ نے میرے بھائی پر جو توجہ دی ہے، اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔''

''یہ میرا فرض تھا۔''

''یہ حقیر سا نذرانہ قبول فرمایئے.....!'' فیروز نے ایک لفافہ جس

میں پانچ پانچ سو روپے کے پانچ نوٹ موجود تھے، اس کی طرف بڑھایا تو ناجیہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''نہیں جناب.....! مجھے اپنے اس فرض کی تنخواہ ملتی ہے۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں تو ہم چھوٹے لوگوں کے دلوں میں لالچ اور بے ایمانی کی پرورش نہ کریں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔''

یہ الفاظ سرجن حیدر نے اپنے دفتر سے نکلتے ہوئے سن لئے تھے۔

''سمجھے آپ.....!'' انہوں نے فیروز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پھر بولے۔

''بس..... اب آپ جایئے اور ہمیں ناجیہ پر فخر کرنے دیجئے۔ آؤ..... ناجی.....! ذرا او پی ڈی چلتے ہیں۔'' فیروز ہاتھ میں لفافہ پکڑے کھڑا رہ گیا تھا۔ راستہ طے کرتے ہوئے سرجن نے کہا۔

''میں نے پوری گفتگو سن لی تھی ناجیہ.....! میں اس واقعے کو نظر انداز نہیں کروں گا۔''

''آپ کا اعتماد میرے لئے سب سے قیمتی ہے جناب.....!'' ناجیہ نے پروقار لہجے میں کہا تھا۔ ہفتے میں ایک بار چھٹی ہوتی تھی۔ اس کے لئے کسی دن کا تعین نہیں تھا۔ دوسری لڑکیوں کے الگ مشاغل تھے اور ناجیہ ان کی ساتھی نہیں تھی۔ وہ چھٹی کا دن اپنی چھوٹی سی رہائش گاہ کی صفائی میں گزار دیتی تھی اور ایسے ہی ایک دن فیروز نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی ناجیہ نے اسے پہچان لیا۔

''آپ کے ذہن میں تو شاید میری شکل بھی نہ ہو لیکن میں آج تک آپ کو فراموش نہیں کرسکا مس ناجیہ.....!''

"نہیں......! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے، کیا آپ وہی لفافہ لے کر آئے ہیں......؟"

"اگر آپ پسند کریں تو......" وہ بولا۔

"میں نے اس دن بھی کسی دباؤ کے بغیر انکار کیا تھا جناب......! اور آج بھی آپ سے التجا کرتی ہوں کہ میرے گھر آکر مجھے ذلیل نہ کریں۔"

"آپ یقین کریں کہ میں اس ارادے سے نہیں آیا بلکہ آپ کی عقیدت مجھے یہاں لے آئی ہے۔"

"شکریہ......! چائے پئیں گے آپ......؟"

"ہاں......!" فیروز نے فوراً ہاں کر دی۔

بہر حال......اس نے فیروز کو چائے پلائی اور گھبرائے گھبرائے انداز میں اس سے بات کرتی رہی۔ چلتے وقت فیروز نے کہا۔

"کیا میں آئندہ بھی آپ سے مل سکتا ہوں......؟"

"چھٹی والے دن......!" نہ جانے کیوں ناجیہ کے منہ سے نکل گیا۔

"میں فون کر کے آپ کی چھٹی کے بارے میں پوچھ لوں گا۔" وہ چلا گیا اور ناجیہ کے ذہن میں لاتعداد سوچیں چھوڑ گیا اور پھر ہر چھٹی کے دن اس سے ملاقات ہونے لگی۔ وہ اس کے فون کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ اس دوران وہ تکلف کی حد سے گزر چکے تھے۔ ایک دو بار ناجیہ فیروز کے ساتھ فلم دیکھنے بھی چلی گئی تھی۔ کوئی ان دونوں کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ ناجیہ کی زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس سے قبل اس کی جانب جو بھی نگاہ اٹھتی، اس میں طنز اور مضحکہ ہوتا لیکن فیروز کی نگاہوں میں فرق تھا۔ وہ ان نگاہوں کو محبت کی نگاہ ہی سمجھتی تھی اور رات کی تنہائیوں میں جب اسے وہ آنکھیں یاد آتیں تو اس

کے دل میں ہلچل مچ جاتی۔ وہ تصور میں فیروز سے باتیں کرنے لگتی تھی۔

"فیروز......! مجھ سے وہ سب کچھ کہو گے جس کے لئے میرے کان ترس گئے......؟ میں منتظر ہوں، جب یہ ہوگا تو میں تمہارے ہر لفظ کو قبول کر لوں گی۔ میں ان تنہائیوں میں تمہارا قرب حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایسا قرب جسے کوئی شک کی نگاہ سے نہ دیکھے۔ میں تمہیں اپنے مالک کا درجہ دینا چاہتی ہوں فیروز......! تاکہ مجھے محروم سمجھنے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل جائیں۔ میں تمہارے آنگن کا درخت بننا چاہتی ہوں۔" فیروز نے اسے اپنے ساتھ گھومنے پھرنے کی آفر پیش کی تو وہ تیار ہوگئی۔

فیروز اسے لئے لئے نہ جانے کہاں کہاں گھومتا پھرا اور اس نے ناجیہ کی اس تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو ناجیہ نے اسے روک دیا۔

"نہیں فیروز......! پہلے مجھے ان حدود سے گزرنے کا حق دے دو۔"

"میں سمجھا نہیں ناجیہ......!"

"مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا لو...... فیروز......!"

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو ناجیہ......!"

"میں تمہاری ہوں فیروز......! ساری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میری نس نس، پور پور تمہاری ہے لیکن مجھے میرا مقام دے دو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں......؟" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

"پیار ہی تو کرنے لگی ہوں تم سے......"

"کیا میں آپ کو دوسروں کی نسبت زیادہ بے وقوف نظر آتا ہوں۔ معاف کیجئے گا مس ناجیہ......! میں آپ کی زندگی کا پہلا مرد تو نہیں ہوں۔"

اس سے پہلے آپ نے دوسروں سے بھی یہی کہا ہوگا......؟" فیروز کا ایک ایک لفظ طنز وحقارت میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ گنگ رہ گئی۔

اب سننے کے لئے کیا رہ گیا تھا؟ اسے فیروز پر غصہ نہیں آرہا تھا بلکہ اپنے آپ سے نفرت ہورہی تھی۔ واقعی اس نے آئینے کی سچائی کو جھٹلا دیا تھا۔ اس نے اپنی تقدیر کی سیاہی پر سفیدی پھیرنے کی کوشش ہی کیوں کی تھی۔

فیروز چلا گیا۔ وہ اسے ایک سبق دے گیا تھا اور اس نے یہ سبق اچھی طرح یاد کرلیا تھا۔ اس نے تنہائی کی کسمساہٹوں کو گھونٹنا سیکھ لیا تھا اور اب اس کی آنکھیں مرد کے دل میں بڑی دور تک دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے کردار میں بڑی پختگی آگئی تھی۔

اس نے مریضوں کی تیمارداری اور بھی تندہی سے کرنا شروع کردی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہی اس کی زندگی ہے۔ اس نے آئینے کی سچائی قبول کرلی تھی۔ اب اسپتال میں بیمار ہوکر آنے والے مریض اس کی توجہ کا مرکز ہوتے۔ اس نے محسوس کیا کہ ہر مرد حسن پرست ہوتا ہے، ظاہری چمک کا دلدادہ...... اور یہ چمک ہی زندگی کی حقیقت ہے ورنہ سب ہی تو برے نہیں ہوتے۔

اس کے دل میں مردوں سے انتقام کا کوئی جذبہ نہیں ابھرا۔ اور پھر قصور ان کا تو نہیں۔ کمی تو میرے ہی اندر ہے۔ البتہ ان ہنسنے والوں اور مذاق اڑانے والوں کے رویے پر اسے دکھ ہوتا تھا جنہیں وہ کوئی تکلیف نہیں دیتی تھی۔ ہاں...... تنہائیوں میں اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ ہر دکھ کی ایک انتہا ہوتی ہے، ہر زخم کے لئے وقت مرہم بن جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی اس مذاق کی عادی ہوتی گئی۔ یہ مذاق اس نے اپنا مقدر سمجھ لیا تھا۔ اس نے اپنی

چاہتوں کو گہرائیوں میں دفن کردیا۔

روئے زمین پر لاکھوں چیزیں ہوتی ہیں۔ بھوری مٹی کی نمی سے خوش رنگ پھول بھی کھلتے ہیں اور بدنما جھاڑیاں بھی اُگتی ہیں۔ سب کا اپنا ایک مقام ہے۔ کوئی خود کو بدل نہیں سکتا تو پھر خود میں گم کیوں نہ ہوجایا جائے۔

خدمت کا جذبہ بڑھتا ہی گیا۔ کسی کی آنکھوں میں ممنونیت کے آثار ہی اس کے بہت سے جذبوں کو تسکین کردیتے تھے۔

وہ نوجوان موٹر سائیکل کے حادثے کا شکار ہوکر آیا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ پرائیویٹ روم میں اس کی خصوصی طور پر ڈیوٹی لگادی گئی۔ ابتدائی چند روز تو نوشاد تکلیف کا شکار رہا اور اس کے بعد اس کی حالت بہتر ہوگئی۔ خوش مزاج نوجوان تھا۔ جوانی کی تمام شوخیاں اس کے وجود میں سمٹی ہوئی تھیں۔ ایک سرمئی شام میں وہ اس پر جھکی ہوئی اس کو انجکشن لگارہی تھی کہ اس نے نوشاد کی چوری پکڑ لی۔ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرادی اور انجکشن لگا کر سیدھی ہوگئی۔

"نرس......!" نوجوان نے اسے پکارا۔

"ہوں......!"

"آپ شادی شدہ ہیں......؟"

"نہیں......!" وہ لرز گئی۔

"شادی کیوں نہیں کی آپ نے......؟"

"بس...... ایسے ہی......!"

"کوئی وجہ تو ہوگی......؟" نوجوان نے اصرار کیا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں......!" اس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز

بمشکل نکل رہی تھی۔

''آپ کی عمر بھی زیادہ نہیں ہے......؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن تم یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو نوشاد......!'' اب نوجوان کے پریشان ہونے کی باری تھی۔ وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

''آپ تنہا رہتی ہیں......؟''

''ہاں......!''

''دوسرا کوئی نہیں ہے آپ کا......؟''

''سب میرے ہی تو ہیں۔ تم بھی تو میرے عزیز ہو، وہ سارے مریض میرے ہوتے ہیں جن کی میں تیمارداری کرتی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ نے...... میرا مطلب ہے...... آپ نے کسی سے محبت کی ہے......؟'' نوشاد نے پوچھا۔

''ہاں......کی ہے......!''

''تو پھر آپ نے اس سے شادی کیوں نہیں کی......؟'' نوجوا نے پوچھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''جس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس سے شادی ضرور ہوتی ہے کیا......؟'' اس نے کہا۔ نوشاد خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ ناجیہ کی تجربے کار آنکھیں اس کی کیفیات سے بخوبی واقف تھیں۔ اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''محبت کے بے شمار روپ ہوتے ہیں نوشاد......! میری صورت اس

قابل نہیں کہ کوئی مجھے اس روپ میں اپنائے لیکن میرا دل محبت سے خالی نہیں ہے۔ میری چاہت کا رخ بدل چکا ہے۔''

''نرس......! آپ میری ایک خواہش پوری کر دیں گی......؟'' نوشاد کے ہونٹ بری طرح خشک ہو رہے تھے۔

''ہاں ہاں...... بولو......!''

''میں آپ کا ہاتھ چومنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نوشاد کے چہرے کے جذبات پڑھتی رہی۔ ان تاثرات کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتی رہی جو اس پر طاری تھے۔ تب اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں تمہیں اس کی اجازت دے دوں گی نوشاد......! لیکن ایک شرط پر۔''

''کیا شرط ہوگی......؟'' نوشاد نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔

''مجھے آئندہ نرس نہیں کہو گے بلکہ سسٹر کہو گے۔ کیا سمجھے......؟ بولو......! کیا کہتے ہو......؟'' نوشاد نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے بعد اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔

''تم نے جواب نہیں دیا نوشاد......؟''

''سوری...... سسٹر......! میں شرمندہ ہوں۔'' وہ آہستہ سے بولا اور وہ نوشاد پر جھک گئی۔ اس نے اس کے رخسار اور پیشانی کو چوم لیا پھر اس کے بال تھپتھپا کر بولی۔

''آرام کرو نوشاد......! سو جاؤ......!'' وہ کمرے سے نکل آئی لیکن اس کے اپنے جذبات میں پھر ہلچل مچ گئی تھی۔ دل اندر سے بھر آیا تھا۔ جی

چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ نہ جانے احساسات کیا ہو گئے تھے۔

پھر ایک خاتون ڈاکٹر نے اسے آواز دی اور وہ خود کو سنبھال کر ڈاکٹر شہلا کے پاس پہنچ گئی۔ ڈاکٹر شہلا ایک بے حد خوب صورت اور نوجوان لڑکی تھی۔ اسے اس اسپتال میں آئے ہوئے تین ماہ گزرے تھے لیکن وہ کافی ہر دلعزیز ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر شہلا اسپتال کی نرسوں میں سب سے زیادہ ناجیہ کو پسند کرتی تھی اور اکثر فرصت کے اوقات میں اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے ناجیہ......!'' شہلا نے بے تکلفی سے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں ڈاکٹر......! روم نمبر سولہ میں میری ڈیوٹی ہے۔''

''چائے پینے کا موڈ ہو رہا ہے۔ آؤ چائے پئیں......!''

''بہتر ہے......!'' وہ سرخم کر کے بولی اور دونوں ڈیوٹی روم میں آ بیٹھیں۔ شہلا شاید چائے کے لئے پہلے ہی کہہ چکی تھی۔

''تم اس اسپتال میں ایک مثالی حیثیت رکھتی ہو ناجیہ......! اس کا کیا راز ہے......؟''

''میں سمجھی نہیں ڈاکٹر......!''

''جب تمہارا ذکر نکلتا ہے تو لوگ تمہاری تعریفیں کرتے ہیں۔''

''یہ ان کے احساس کی خوبی ہے، میرا کمال نہیں۔''

ڈاکٹر شہلا کچھ سوچنے لگی پھر اس نے پوچھا۔

''تمہارے دوسرے عزیز و اقارب اس شہر میں نہیں رہتے......؟''

''نہیں......!'' وہ مسکرائی۔

''پھر کہاں ہیں وہ لوگ......؟''

''کہیں نہیں......! میں تنہا ہوں۔ اس وسیع کائنات میں رشتوں کی جو ترتیب ہے اس میں میرا کوئی نہیں ہے، ہاں...... سانسوں کا ساتھ بہت سوں سے ہے۔'' وہ بولی اور ڈاکٹر شہلا کے چہرے پر تاسف کے آثار ابھر آئے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

''تم شادی کر لو ناجیہ......! تنہا زندگی ایک مخصوص عمر تک تو برداشت ہو سکتی ہے لیکن اس کے بعد سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر ایک عورت کے لئے۔ مرد تو کسی فٹ پاتھ پر بھی گزارہ کر لیتے ہیں مگر عورت...... انسانی بھیڑیے اس روئے زمین پر چپے چپے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ مرد اگر دیوانگی میں برہنہ ہو کر بھی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہے تو اسے کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن اگر عورت دیوانی ہو کر بھی برہنہ ہو جائے تو پرہوس نگاہیں اسے نہیں چھوڑتیں۔ یہ معاشرہ تنہا عورت کے لئے سازگار نہیں ہے اور تم تو ابھی مکمل جوان ہو۔''

''جوان ہوں...... ڈاکٹر......! لیکن مکمل نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب......؟''

''آپ کی نگاہوں کے حسن نے میری بدصورتی نظرانداز کر دی ہے، شاید...... میں کسی مرد کے لئے قابل توجہ نہیں ہوں۔ مجھ سے فلرٹ تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس حد تک کہ ان کی پہنچ میرے بدن تک رہے۔ مریض مجھے مسیحا کہتے ہیں اور اس کے بعد قہقہے لگاتے ہیں۔ میں نے مرد کے اندر خوب جھانک کر دیکھا ہے ڈاکٹر شہلا......! ان کی سوچ آپ کی سوچ سے مختلف

ہے، وہ عورت کے اندر جھانکنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور نہ ہی وہ عورت کے معاملے میں قدرت کے اصولوں کے قائل ہیں۔ وہ شفاف چہروں اور خوب صورت خدوخال سے محبت کرتے ہیں۔''

چائے آ گئی۔ ڈاکٹر شہلا بہت سنجیدہ ہوگئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''میرا تجربہ تم سے زیادہ نہیں ہے ناجیہ......! لیکن ایک بات کہتی ہوں۔ روئے زمین کی ان دونوں اصناف میں ہر ایک کا تاثر یکساں نہیں، ہر ایک کا انداز فکر الگ الگ ہے۔ کوئی تو ایسا مرد ضرور موجود ہے جو تمہیں پہچان لے گا اور ناجیہ......! وعدہ کرو کہ پھر تم اس کے سامنے اپنے اصولوں میں ٹھوس نہیں رہو گی۔ اپنی سوچ میں ایک شگاف رکھو اور اس شگاف میں اگر کوئی سما جائے تو اسے دوسروں کی کسوٹی پر مت پرکھنا۔ اسے میری نصیحت سمجھو یا التجا۔ بولو......! میری بات مانو گی......؟'' شہلا نے عجیب سے لہجے میں کہا اور وہ ہنس کر رہ گئی۔

''جواب نہیں دو گی مجھے......؟''

''کیا جواب دوں ڈاکٹر......؟''

''اپنے تجربے سے سوچ رہی ہوں ناں......؟''

''ہاں......! میں نے بڑی مشکل سے خود کو نئی زندگی دی ہے۔ اب میری ذات دوسروں کے لئے صرف ایک قہقہہ ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''کاش تم نے ان مفسروں، فلاسفروں، کیمیا دانوں، سائنس دانوں کی حسرت کا مطالعہ کیا ہوتا۔ جنہوں نے اپنی مختصر زندگی پر کف افسوس ملتے ہوئے کہا کہ کاش انہیں طویل عمر ملتی اور وہ اپنے تجربات مکمل کر سکتے۔ جسے

تجربہ کہتے ہیں ناں ناجیہ......! وہ ایک نامکمل چیز ہے۔ کوئی اسے مکمل نہیں کر سکا۔ تم ان لمحاتی تجربات کو مکمل کہہ رہی ہو۔ یہ نامکمل ہیں۔ قطعی نامکمل۔''

ڈاکٹر شہلا نے اس کے جذبات میں پھر ہلچل پیدا کر دی۔ اس رات وہ اچھی طرح سو نہ سکی۔

صبح وہ پھر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آئینہ سچا تھا اور وہ سچ کو فریب نہیں کہہ سکتی تھی لیکن تجربے کچے ثابت ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر شہلا نے جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا۔ وہ اسے دل سے تسلیم کرتی تھی۔ اس نے دل کی دھڑکنوں میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ شاید اس کے احساسات میں وہ شگاف پڑ چکا تھا جس کی بنیاد ڈاکٹر شہلا نے ڈالی تھی۔

چنانچہ اب اس نے لباس پر بھی توجہ دی۔ بالوں پر بھی اور اس کے ہونٹوں پر سرخی کی تہہ نظر آنے لگی اور وہ انتظار کرنے لگی اس چہرے کا جس پر جڑی ہوئی آنکھیں اس کے وجود کی گہرائیوں میں دیکھ سکیں۔ اس تبدیلی کا کوئی نتیجہ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو لیکن ایک بات ضرور ہوگئی۔ وہ یہ کہ اب وہ زندگی سے اتنی دور نظر نہیں آتی تھی۔

اس رات وہ سکون سے سوئی۔ رات کے تقریباً تین بجے ہوں گے کہ بیل بجنے لگی اور وہ بیدار ہوگئی۔ اسپتال کے احاطے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی ساتھی نرس ایک وارڈ بوائے کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سوری ناجیہ......! ڈاکٹر ہاشم نے تمہیں طلب کیا ہے......؟''

''اوہو...... اندر آؤ...... کوئی خاص بات ہے......؟'' اس نے نیند کے خمار کو ذہن سے جھٹک کر کہا۔ ڈاکٹر ہاشم اسپتال کے سب سے قابل اور

معمر سرجن سمجھے جاتے تھے۔ وہ بھی اس پر مہربان تھے۔ نرس نے کہا۔

’’ہاں...... کوئی ایمرجنسی کیس آیا ہے۔ ڈاکٹر ہاشم آپریشن کریں گے۔‘‘

’’بس ایک منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔‘‘ اس نے کہا اور تیزی سے غسل خانے کی جانب بڑھ گئی۔ پھر واقعی اس نے بڑی پھرتی دکھائی اور تیار ہو کر ان کے ساتھ چل پڑی۔

مریض کو آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا تھا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر پولیس کے چند آفیسر موجود تھے۔ ایک پولیس افسر ڈاکٹرز روم میں بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ معمول کی باتیں تھیں۔ وہ انہیں نظر انداز کر کے آپریشن تھیٹر میں داخل ہو گئی۔ اندر ڈاکٹر ہاشم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر شہلا بھی موجود تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی اور پھر دوسری نرسوں کے ساتھ ضروری تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ ڈاکٹر شہلا نے اسے ضروری ہدایات دی تھیں۔

اس کے بعد وہ سب ایپرن وغیرہ پہن کر تیار ہو گئے۔ وارڈ بوائے مریض کو آپریشن ٹیبل پر لے آئے۔ روشنیاں جل اٹھیں اور آپریشن شروع ہو گیا۔ یہ ایک خوب صورت سا آدمی تھا جس کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان ہو گی۔ خاصی تندرست جسامت کا مالک تھا۔ اس کے پیٹ میں دو گولیاں لگی تھیں اور اندر ہی رہ گئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کافی خون بہہ گیا ہے مگر اس کے باوجود مریض کے چہرے پر مردنی نہیں تھی۔ آپریشن تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہا اور ڈاکٹر تھکے بغیر محبت کرتے رہے اور پھر آخری ٹانکے لگا دیئے گئے اور ضروری کارروائیوں کے بعد کام ختم ہو گیا۔

’’مریض کو اوپری منزل کے روم نمبر اٹھارہ میں لے جاؤ۔‘‘ ڈاکٹر

ہاشم نے حکم دیا اور دو وارڈ بوائے اس کی تعمیل میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر ہاشم باہر نکل آئے۔

’’ہماری بھی عجیب ڈیوٹی ہے۔ تم تو سو چکی ہو گی ناجیہ......؟‘‘ ڈاکٹر شہلا نے پوچھا۔

’’جی ڈاکٹر......! سو چکی تھی۔‘‘

’’جاگنا ناگوار تو نہیں گزرا......؟‘‘

’’نہیں ڈاکٹر......! آپ کی توجہ میرے لئے اعزاز ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر ہاشم نے بھی تمہارا ہی نام لیا تھا۔ اصل میں عمدہ کارکردگی ی بعض اوقات مصیبت بن جاتی ہے۔‘‘

’’ہماری یہ چھوٹی سی پریشانی لوگوں کو زندگی بخشتی ہے۔ کسی انسان ے کام آنا تو بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’تمہارا یہی جذبہ تمہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔‘‘ ڈاکٹر شہلا ے کہا۔ سامنے ہی ڈاکٹر ہاشم پولیس افسر سے کچھ بات چیت کر رہے تھے۔ ان آوازوں کی جانب متوجہ ہو گئی۔

’’آپ اگر تعاون کریں تو یہ انتظام کر سکتے ہیں ڈاکٹر......!‘‘ پولیس ر کہہ رہا تھا۔

’’انتظام کرنا مشکل نہیں ہے۔ آفیسر......! آپ میری بات سمجھنے کی ش کریں۔ کافی بڑا آپریشن ہوا ہے۔ کئی شریانوں کو جوڑا گیا ہے۔ اگر ا حرکت دی تو وہ دوبارہ ٹوٹ جائیں گی پھر اسے اسپتال منتقل کرنے کے ئے قبرستان بھیجنا پڑے گا۔‘‘

’’بڑی مشکل پیش آ گئی ہے، یہ آپ نہیں جانتے کہ یہ شخص نہ صرف

ڈاکو بلکہ قاتل بھی ہے، اس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا ہے۔ گشتی پولیس کے دو افراد نے ان دونوں کو پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے ان پر گولی چلا کر ان میں سے ایک کو ہلاک کر دیا۔ آپ یقیناً سمجھتے ہوں گے کسی ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل کو قتل کرنا معمولی جرم نہیں ہوتا۔ ایسے شخص سے اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔''

مانتا ہوں آفیسر......! لیکن کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ اسے اسپتال لانے کے بجائے وہیں گولی مار کر ہلاک کر دیتے......؟'' ڈاکٹر ہاشم نے کہا۔

''اوہو......نہیں یہ کیسے ممکن تھا......؟'' انسپکٹر جلدی سے بولا۔

''کیوں......؟'' ڈاکٹر نے مسکرا کر سوال کیا۔

''صرف قانون ہی اسے سزا دینے کا حقدار ہے۔''

''تو آپ اسے یہ سزا کیوں دے رہے ہیں......؟ بات ایک ہی ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے اسے اس وقت یہاں سے لے جانے کی کوشش کی تو یہ مر جائے گا۔ آپ چاہیں تو یہ الفاظ میں تحریر کر کے آپ کو دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد آپ کا اپنا رسک ہوگا لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے جس نے اسے زندگی کی طرف لوٹانے کے لئے ڈھائی گھنٹے کمر جھکائی ہے، میں اسے لے جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔'' پولیس آفیسر گردن جھکا کر کسی سوچ میں گم ہوگیا۔ چہرے سے وہ سخت دل انسان معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس نے گردن اٹھا کر کہا۔

''یہ اس قابل کب تک ہو جائے گا ڈاکٹر......! کہ میں اسے یہاں سے لے جاؤں......؟''

''پندرہ دن سے پہلے ناممکن ہے۔''

''اوہ...... مائی گاڈ......! پندرہ دن......؟ ٹھیک ہے......! مجبوری ہے لیکن میں اس کمرے کا معائنہ ضرور کروں گا جہاں اسے رکھا جائے گا۔''

''یقیناً آفیسر......! میں آپ کے فرائض کی بجا آوری میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ تشریف لائیے......! میں آپ کو اس کا کمرہ دکھا دوں۔'' ڈاکٹر ہاشم نے کہا اور پھر وہ سب اوپری منزل کے زینے کی طرف بڑھ گئے۔

ڈاکٹر شہلا نے اوپر جاتے ہوئے ناجیہ کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ مریض ایک مخصوص کمرے میں موجود تھا۔ وارڈ بوائے سارے ضروری انتظامات کر چکے تھے۔ انسپکٹر نے کمرے کا چاروں طرف سے جائزہ لیا۔ عقبی سمت ایک کھڑکی تھی جس میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اس کھڑکی کی دوسری طرف سپاٹ دیوار تھی۔ کھڑکی سے زمین تقریباً پچاس فٹ نیچے تھی۔ اس کھڑکی سے زخمی کا نیچے کودنا اس کے لئے بڑا خطرناک ہو سکتا تھا۔ باقی دیوار میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو مجرم کو فرار میں مدد دے سکے، سوائے سامنے کے راستے کے۔ انسپکٹر نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

''مناسب جگہ ہے لیکن یہ کھڑکی کافی بڑی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس میں سلاخیں لگوا دی جائیں۔ میں اس کا انتظام خود کر دوں گا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر......! یہاں چوبیس گھنٹے پولیس کی نگرانی رہے گی اور میں چاہتا ہوں کہ یہاں نرسوں کی ڈیوٹی نہ بدلی جائے بلکہ کسی ایک ہی سمجھدار اور قابل اعتماد نرس کو متعین کیا جائے۔''

''دونوں باتوں پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن کھڑکی زمین سے بہت اونچی ہے اور اس جیسے کسی شخص کا نیچے کودنا کسی طور ممکن نہیں ہے۔ اس لئے سلاخیں لگانا بیکار ہیں۔''

''آپ سمجھے نہیں ڈاکٹر......! میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس کا دوسرا ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ ممکن ہے وہ اس کی مدد کرنے کی کوشش کرے۔ اگر آپ پسند کریں تو میں اس سلسلے میں عدالتی حکم نامہ پیش کرسکتا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... لیکن اس سلسلے میں بلڈنگ انچارج ہی اجازت دے سکتا ہے۔''

''پولیس کو آپ لوگوں کا بہترین تعاون درکار ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری کسی بات پر ناگواری محسوس نہیں کریں گے۔'' انسپکٹر نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''ٹھیک ہے...... انسپکٹر......! یہ ہمارا بھی فرض ہے۔'' ڈاکٹر ہاشم نے جواب دیا۔

''مجھے اجازت دیجئے فی الحال میں ان دو کانسٹیبلز کو یہاں چھوڑے جارہا ہوں، ان لوگوں کی ڈیوٹی بدلتی رہے گی لیکن ڈیوٹی پر حاضر ہونے والے تمام کانسٹیبل اسپتال کے ڈیوٹی انچارج کو اپنا شناختی کارڈ دکھا کر ہی اپنی ڈیوٹی سنبھال سکتے ہیں۔ آپ ہدایات دے دیں۔''

''ٹھیک ہے......!'' ڈاکٹر ہاشم نے جواب دیا۔

''اس کے علاوہ کل دن میں میں کسی وقت اس شخص کا بیان لینے آؤں گا۔ ہمیں اس کے دوسرے ساتھی گرفتار کرنے کے لئے بھی کافی جدوجہد کرنی ہے۔ خدا حافظ......!'' انسپکٹر ڈاکٹر ہاشم سے ہاتھ ملا کر چلا گیا اور ڈاکٹر ہاشم سوچ میں ڈوبے ہوئے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر انہوں نے گردن ہلا دی۔

''آپ اس کا چارٹ تیار کرا دیں ڈاکٹر شہلا......! اور ہاں...... آپ کی ڈیوٹی کہاں ہے سسٹر ناجیہ......!''

''وارڈ نمبر دس میں سر......!''

''براہ کرم آپ کسی اور نرس کو وہاں کا چارج دے دیں اور آپ یہاں کی ڈیوٹی سنبھال لیں۔ میں آپ کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔'' ڈاکٹر ہاشم نے کہا اور ناجیہ نے گردن ہلا دی۔

چنانچہ روم نمبر اٹھارہ کے مریض کا چارج اس نے سنبھال لیا۔



ڈیوٹی کانسٹیبلز کے لئے کمرے سے باہر کرسیاں فراہم کر دی گئیں اور انہوں نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ ناجیہ روم نمبر اٹھارہ میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے کھڑکی بند کی۔ اس کے کانوں میں انسپکٹر کے جملے گونج رہے تھے۔ اس کا ایک ساتھی آزاد ہوگیا ہے۔ ممکن ہے وہ اسے آزاد کرانے کی کوشش کرے۔ مریض بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ ناجیہ نے اسے قریب سے دیکھا۔ اسے ہلکا سا بخار بھی تھا۔ اس نے ٹمپریچر نوٹ کیا اور پھر مریض کا چہرہ دیکھنے لگی۔

قاتل، ڈاکو، کیسے سنگ دل لوگ ہوتے ہیں۔ زندگی لینا آسان تو نہیں ہوتا؟ نہ جانے کون سا دل ہوتا ہے ان لوگوں کے سینوں میں؟ ان کا احساس جانے کہاں سو جاتا ہے؟ اسے دیکھو کوئی بھی اس کی نیند بنا سکتا ہے۔ خبر تک نہ ہوگی کہ کیسے زندگی سے محروم ہوگیا۔ اس وقت تو بالکل ایک نوزائیدہ بچے کی مانند ہے لیکن عالم ہوش میں شاید بھیڑیا ہوگا۔

اسے فیروز یاد آیا اور اس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ بس روپ

الگ الگ ہوتے ہیں لیکن کام سب کا ایک ہی ہے۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ نیند آنکھوں سے بہت دور چلی گئی تھی۔ ایک گھنٹے کے بعد اس نے دوبارہ ٹمپریچر لیا۔ بخار بڑھ گیا تھا لیکن یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر شہلا نے اسے بتا دیا تھا کہ ٹمپریچر ابھی اور بڑھے گا، وہ فکرمند نہ ہو۔ رات گزر گئی اور کھڑکی کے بند شیشوں سے نوخیز صبح جھانکنے لگی۔ مریض بدستور بے ہوش تھا۔

چھ بجے ڈاکٹر شہلا نے اس کا معائنہ کیا اور اس کی حالت کو تسلی بخش قرار دے کر چلی گئی۔ چلتے وقت اس نے ناجیہ سے کہا۔

''میں نے تمہاری معاونت کے لئے دوسری نرس کو ہدایات دے دی ہیں۔'' اس نے گردن ہلا دی۔ دن کے گیارہ بجے مریض کو ہوش آ گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں کھڑکی کے پاس کھڑی نرس پر آ ٹکیں۔ وہ دیر تک اسے دیکھتا رہا تھا پھر ایک اور ڈیوٹی ڈاکٹر نے اس کی نلکیاں وغیرہ اتاریں۔

مریض کو شاید معلوم بھی نہیں ہوا ہوگا کہ پچھلے چند گھنٹوں میں اس کی کیا کیفیت رہی ہے۔ پھر شاید ناجیہ کی چھٹی حس نے ہی اسے احساس دلایا کہ کچھ ہوا ہے۔ مریض نے اسے آواز دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا تو مریض کو ہوش میں پایا اور وہ اس کے پاس آ گئی۔ ایک مہربان لمس مریض کو پیشانی پر محسوس ہوا۔ ناجیہ کے لئے وہ پہلے مریض تھا پھر قاتل یا ڈاکو۔ اسے ان لوگوں کی ذات سے کوئی غرض نہیں تھی جو یہاں آتے تھے۔ اس کے نزدیک وہ تو بے بس مریض ہوتے تھے جن کی خدمت اس کا فرض تھا۔

''کیسی طبیعت ہے......؟'' ناجیہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہوں......!''

''درد تو محسوس نہیں ہو رہا......؟''

''نہیں......!'' ناجیہ الماری کی طرف بڑھ گئی۔ حسب ہدایت ہوش میں آنے کے بعد مریض کو طاقت کا ایک انجکشن دینا تھا۔ اس نے انجکشن تیار کر کے مریض کے بازو میں اتار دیا۔ مریض خاموشی سے ناجی کو دیکھتا رہا تھا۔ ایک بار ناجیہ کی نگاہ اس سے ملی تو وہ کسی قدر بوکھلا سی گئی۔ عجیب سی نگاہیں تھیں اس شخص کی، اداس کیفیت لئے، ایک مایوسی کا احساس لئے، کسی قاتل، ڈاکو کی اور عام آدمی کی نگاہوں میں کوئی بھی تو فرق نہیں ہوتا۔

پھر عام انسان ڈاکو کیسے بن جاتا ہے؟ اس شخص کی آنکھیں تو مظلوم لوگوں کی سی ہیں۔ ان میں تو خون کی چمک نظر نہیں آتی۔ کوئی بھی خاص بات نہیں ہے اس کی آنکھوں میں۔ وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ مریض کی نگاہیں اس کے ساتھ ساتھ گردش کر رہی تھیں۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اب وہ پرسکون تھا۔ ڈھائی بجے کے قریب ڈاکٹر ہاشم آئے۔ انہوں نے چارٹ دیکھا اور پھر مریض کی نبض دیکھنے لگے۔

''بہت تیزی سے ٹھیک ہوتے جا رہے ہو۔ کوئی خاص تکلیف تو نہیں......؟''

''نہیں ڈاکٹر صاحب......! شکریہ......!'' مریض نے آہستہ سے جواب دیا۔ ڈاکٹر ہاشم اپنے معاون کو کچھ ہدایت دے کر بولے۔

''پولیس آفیسر کا فون آ چکا ہے۔ وہ مریض کا بیان لینے کے لئے بے چین ہے۔ آپ انہیں فون کر دیں کہ وہ چار بجے تک آ سکتے ہیں۔'' یہ

الفاظ ڈاکٹر ہاشم نے اپنے معاون ڈاکٹر سے کہے تھے۔ پھر وہ ناجیہ کی طرف رخ کر کے بولے۔

''ناجیہ......! سب ٹھیک ہے ناں......؟''

''جی ڈاکٹر......!'' ڈاکٹر ہاشم چلے گئے۔ تین بجے ایک سب انسپکٹر کے ساتھ کچھ لوگ آئے، وہ معمار قسم کے لوگ تھے۔ اجازت نامہ دکھا کر وہ اندر آئے اور کھڑکی پر سلاخیں لگانے کا کام کرنے لگے۔ باہر کے سپاہی اپنی ڈیوٹی پر مستعد تھے۔ چار بجے کے قریب انسپکٹر نوریز، دو سب انسپکٹروں کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا۔ مریض اس وقت بھی ہوش میں تھا۔ نوریز کی آنکھوں میں اس کے لئے نفرت کے آثار بھر آئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ اس شخص نے ایک فرض شناس سپاہی کا قتل کر دیا تھا اور اب یہ ہر طرح سے قابل نفرت تھا لیکن فرائض کی ادائیگی میں جذبات کو پرے رکھنا ہوتا ہے۔ وہ کرسی گھسیٹ کر مریض کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہاں...... کیا حال ہے تمہارا......؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......!''

''نام کیا ہے تمہارا......؟''

''احتشام......!''

''ہوں...... بتاؤ تمہارے ساتھ وہ کون تھا......؟''

''اختر شاہ......!''

''کہاں رہتے ہو......؟''

''کہیں بھی نہیں...... آوارہ گرد ہوں۔'' وہ بولا۔

''کوئی ٹھکانہ تو ہوگا......؟''

''کوئی بھی نہیں...... کبھی کسی ہوٹل میں رہتے ہیں کبھی کسی سرائے میں......'' اس نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ڈاکٹر کی نگاہ اس کے چہرے پر تھی۔

''جس پستول سے تم نے قتل کیا ہے، اس کا لائسنس ہے تمہارے پاس......؟''

''نہیں......!'' اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

''تمہارا ساتھی کہاں ملے گا......؟''

''نہیں معلوم......! کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اس کا۔''

''لوٹی ہوئی رقم اس کے ہی پاس ہے یا کوئی تیسرا بھی تمہارے ساتھ تھا......؟'' انسپکٹر کا لہجہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے جواب دینے کے لئے ہونٹ کھولے لیکن آواز نہ نکل سکی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی بے بسی آگئی تھی۔ ڈاکٹر ہاشم نے انسپکٹر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کی طرف مڑ گیا۔

''میرا خیال ہے بس...... باقی سوالات دوسری ملاقات کے لئے رہنے دیں۔''

''کیوں ڈاکٹر صاحب......!''

''وہ تقریباً بے ہوش ہوگیا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے دماغ پر زور ڈالنا مناسب نہیں ہوگا۔''

''کہاں کی باتیں کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب......! یہ سارے ڈھونگی ہوتے ہیں۔ اس طرح آنکھیں کر لیتے ہیں۔ ان کی خبر تو بس ہم پولیس

والوں کے پاس ہوتی ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''یقیناً ہوتی ہوگی لیکن یہ جگہ تھانہ نہیں بلکہ اسپتال ہے۔ چند دن کے بعد یہ یہاں سے نکل کر آپ کی تحویل میں جائے گا۔ اس وقت آپ اس کے تمام کل پرزے ٹٹول لینا۔''

''آپ بہت رحم دلی برت رہے ہیں ڈاکٹر صاحب......! عادت بگڑ جائے گی اس کی۔'' انسپکٹر نوریز نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہم لوگ ڈاکٹر ہیں مریض کے بارے میں جاننے کے بجائے، اس کے مرض سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جب یہ تھانے میں ہوگا تو یہ ہمارا وعدہ ہے کہ آپ کے کام میں مداخلت کرنے نہیں آئیں گے۔ اس وقت آپ بھی ہمارے ساتھ پورا تعاون کریں۔'' ڈاکٹر ہاشم نے مسکرا کر کہا۔

''ٹھیک ہے...... ڈاکٹر صاحب......! لیکن براہ کرم آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ بہت بڑی رقم لوٹی ہے ان لوگوں نے، اسے برآمد کرنا ہے۔''

''کیوں نہیں...... کیوں نہیں...... میں انتہائی کوشش کروں گا کہ جلد از جلد وہ اس قابل ہو جائے۔'' انسپکٹر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل گیا۔ کمرے میں اب صرف مریض کے پاس ناجیہ ہی رہ گئی تھی۔ مریض کی آنکھیں بند تھیں اور ناجیہ اس کے تھکے تھکے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ شخص اتنا برا نہیں ہے۔ جتنی برائیاں اس سے منسوب کی جا رہی ہیں۔ ڈاکہ زنی اور قتل جیسے جرم کا ارتکاب کرنے والے چہرے تو الگ ہوتے ہیں۔ ان کا جرم ان کے چہروں سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس شخص میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

بہرحال...... جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں تو پولیس ہی زیادہ بہتر طور پر جانتی ہے۔ باہر پہرا دینے والے سپاہی موجود تھے۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی ڈیوٹی روم کی طرف چلی گئی۔ مریض کے لئے چند دوائیں تجویز کی گئی تھیں۔ وہ اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ دوپہر کو مریض کے لئے فروٹ جوس تجویز کیا گیا تھا۔ وہ برتن میں جوس لے کر پہنچ گئی۔ اس وقت مریض آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ ناجیہ کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک سکون اور خوشی کی سی کیفیت نمودار ہوگئی۔ فروٹ جوس کا برتن رکھ کر ناجیہ نے مریض کے سرہانے کو اونچا کیا اور دو تکیے ملا کر رکھ دیئے۔

''بھوک محسوس ہو رہی ہے......؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں......!''

''پھر بھی یہ تھوڑا سا جوس لے لو۔'' وہ اس کے قریب بیٹھ کر اسے چمچے سے جوس پلانے لگی۔ اس نے بچوں کی طرح منہ کھول دیا۔ ناجیہ کو اس کے سفید دانتوں کی قطار بڑی بھلی لگی۔ وہ خاموشی سے اسے چمچہ چمچہ جوس پلاتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس کام سے فارغ ہوگئی۔

''کوئی خاص مصروفیت ہے نرس......!'' اس نے پوچھا۔ اس بار ناجیہ نے اس کی آواز پر غور کیا۔ آواز بھی بہت اچھی تھی، وہ بولی۔

''نہیں...... کیوں......؟''

''بس یونہی جی چاہتا ہے کہ تم سے باتیں کروں۔''

''ٹھہرو......! میں یہ برتن رکھ دوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ برتن وغیرہ رکھ کر وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے نزدیک آ بیٹھی۔

''ہاں...... بولو......! کیا بات ہے......؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے نرس......! بس خاموشی سے اکتاہٹ ہو رہی ہے، تم سے تمہارے ہی بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ جواب دینا پسند کرو گی......؟''

''پوچھو......!''

''نرس......! انسان کے مختلف پیشے ہوتے ہیں، وہ بہت سے کام کرتا ہے، جس میں خدمت گزاری بھی ہوتی ہے لیکن پیشہ ورانہ انداز کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں نرس......! کہ تمہارے انداز میں کوئی پیشہ ورانہ کیفیت نہیں ہے۔ بے ہوشی کے عالم کی بات نہیں کرتا لیکن عالم ہوش میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ مجھے بہت عجیب سا لگا ہے۔''

''یہ میرا فرض ہے۔''

''کیا تمام نرسیں تمہاری ہی طرح ہوتی ہیں......؟''

''ہاں......! جو اپنے پیشے سے مخلص ہوں۔''

''لیکن بعض لوگوں کے لئے ان کا یہ انداز اذیت کا باعث بھی بن جاتا ہوگا۔'' اس نے کرب سے کہا۔

''کیا ہے اس کا مطلب...... میں سمجھی نہیں......؟'' ناجیہ حیرت سے بولی۔

''کم از کم ان لوگوں کے لئے جو ساری زندگی محبت کے، پیار کے، مامتا کے لمس سے محروم رہے ہوں۔ یہ محبت نا آشنا لوگ، تمہارے اس روّیے سے بھٹک نہیں جاتے ہوں گے نرس......! کیا ان کے سینے میں پیار کی تڑپ کی وہ آگ دوبارہ نہ بھڑک اٹھتی ہوگی جسے وہ بجھا چکے ہوتے ہیں۔ یہاں

تمہارے پاس سے واپس جانے کے بعد تو ان کی زندگی اور ویران ہو جاتی ہوگی۔ بہت تڑپتے ہوں گے وہ۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں اس کے چہرے پر ایک انوکھا کرب چھایا ہوا تھا۔ ناجیہ تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے الفاظ پر غور کرنے لگی اور ایک دم اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل گئی۔ یہ مرد کی زبان تھی جو بہکانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کا چہرہ ایک دم سخت ہوگیا۔

''ہوں......! اور کچھ کہنا تمہیں......؟'' اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ مریض نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

''نہیں......! بس اور کچھ نہیں...... سوری......!'' وہ بولا۔ اس کے چہرے پر سہما سہما سا تاثر پھیل گیا۔ اس کے اس انداز نے ناجیہ کو بھی پریشان کر دیا۔ اسے اپنے کھردرے لہجے کا احساس ہوگیا تھا چنانچہ اس نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

''انسان کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے کوئی اثر نہیں لینا چاہئے۔ حقیقی زندگی مختلف ہوتی ہے۔ ہمیں جو مل جائے وہ ہمارا ہے، جو نہ ملے...... اس کی آرزو حماقت کہلاتی ہے۔'' مریض نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں جب وہ دیر تک کچھ نہ بولا تو ناجیہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

لیکن احتشام کے الفاظ نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ یہ الفاظ نئے تھے۔ اس سے پہلے کسی مرد نے یہ الفاظ کہہ کر اسے بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بہت دیر تک پریشان رہی۔ مریض نے اس کے بعد اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

دوسرے دن مریض کی حالت کافی بہتر تھی۔ ٹمپریچر بھی کم ہوگیا تھا۔

رات بھر کی سوچ نے ناجیہ کے اندر بھی کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ اب کسی طور پر کسی جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہیں تھی لیکن کسی کو تکلیف دینا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ تھرما میٹر سے اس نے درجہ حرارت لیتے ہوئے کہا۔

''کل میرا لہجہ کچھ سخت ہوگیا تھا۔ اس کے لئے معافی چاہتی ہوں۔'' احتشام نے بے چین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس دوران ناجیہ نے تھرما میٹر اس کے منہ سے نکال لیا تھا۔

''تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو نرس......! بعد میں میں نے خود کو برا بھلا کہا تھا۔ مجھے یہ بات کہنا ہی نہیں چاہئے تھی۔''

''چھوڑو...... ان باتوں کو......تمہارا نام احتشام ہے ناں......!''

''میرا نام......؟'' اس نے گہری سانس لی۔ کچھ لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔

''نہیں......! میرا نام سہیل ہے۔ میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

''اوہو......لیکن پولیس کو تو......؟''

''پولیس میں اور تم میں فرق ہے نرس......! میں پولیس کا مجرم ہوں اور تمہارا مریض......!'' اس نے ناجیہ کو دیکھا جسے ان آنکھوں میں ایک انوکھی چمک محسوس ہوئی۔ اگر وہ اس چمک کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکتی ہے تو اسے محبت کی چمک کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بات اس کے لئے الجھن کا باعث تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اس کیفیت کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ بڑے تلخ تجربات سے وہ گزر چکی تھی، وہ اپنی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی۔ اس کی ذات سے ہر

کیفیت منسلک کر کے صرف ایک قہقہہ لگایا جا سکتا تھا اور بس۔ اس نے اس شخص کے چہرے سے نگاہیں ہٹا لیں اور بولی۔

''تم قاتل ہو......؟''

''نہیں نرس......!''

''لیکن پولیس......''

''پولیس اور حالات یہی کہتے ہیں لیکن تمہاری بات اور ہے۔''

''تو پھر پولیس مین کو کس نے قتل کیا......؟''

''میرے ساتھی نے اس پولیس مین پر گولی چلا کر ہلاک کر دیا تھا۔''

''ڈاکہ زنی الزام ہے......؟''

''نہیں......! وہ حقیقت ہے۔ تقدیر کی مسلسل ضربوں سے جھنجلا کر میں نے یہ فیصلہ کر ڈالا تھا اور اختر شاہ کے ساتھ ڈاکہ زنی کے پروگرام میں شمولیت پر آمادگی ظاہر کر دی تھی لیکن تقدیر سے جنگ آسان نہیں ہوتی۔''

''تم نے پولیس کو اپنے ساتھی کا نام بھی غلط بتایا تھا......؟'' ناجیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی تو ناجیہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔ ڈاکٹر گشت پر آیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو چارٹ پیش کر دیا اور ضروری کارروائیوں کے بعد ڈاکٹر چلا گیا۔ پھر وہ دوبارہ اس کے پاس آ گئی۔

''مجھے اپنے بارے میں تم نے سچ کیوں بتا دیا......؟''

''تم ناراض ہو جاؤ گی نرس......!'' وہ بچوں کی طرح بولا۔

''نہیں ہوں گی...... وعدہ......!''

''تمہارا رویّہ......تم مجھے بتا چکی ہو کہ تمہارا رویہ ہر مریض کے ساتھ

ایک جیسا ہوتا ہے لیکن نہ جانے کیوں...... نہ جانے کیوں......شاید اس لئے کہ میں......کئی بار بیمار ہوا اس دوران...... اور پانی کو بھی ترستا رہا اور پھر خود ہی ٹھیک بھی ہوگیا۔ مجھے کبھی کسی سے سہارا نہیں دیا۔ یہ لمس یہ لمس...... نرس......! میرے بچپن کی طلب ہے۔ میں چھوٹا سا تھا، ننھا سا، تب ہی مجھ سے یہ لمس چھن گیا تھا۔ میں نے ماں نہیں دیکھی۔

ہوش آیا تو یتیم خانے میں تھا جہاں میرے جیسے بہت سے محروم بچے تھے۔ محبتوں کے پیاسے، لیکن یہ پیاس یتیم خانے کے منتظم کے بیدوں سے ٹھنڈی پڑ جاتی تھی۔ پھر میں وہاں سے بھاگ آیا۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ نوکریاں کیں، جوان ہوگیا۔ میرے وجود میں خواہشوں کے پودے اگنے لگے۔ بس ایک پیاس تھی، ایک گھر بنانا چاہتا تھا۔ اس میں کسی ایسے وجود کو لانا چاہتا تھا جو مجھے چاہے، مجھے اپنی آغوش میں جگہ دے، لیکن میرے وسائل راستے کے پتھر تھے۔ ساری کوششیں ناکام رہیں تو میرے ذہن میں جھنجلاہٹوں نے گھر کر لیا اور پھر میں نے...... میں نے آخر کار بینک لوٹنے کا پروگرام بنا لیا۔

افسوس یہ لمس یہ عارضی لمس مجھے ملا بھی تو کہاں......نرس......! یقین کرو، مجھے پھانسی ہو جائے یا ساری عمر کی جیل ہو جائے لیکن یہ لمس میری زندگی کا پہلا لمس ہے اور شاید آخری بھی۔ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی میں اس قیمتی وقت کو نہ بھلا سکوں گا جس میں میری پیاس بجھی ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کے گوشوں میں نمی آ گئی اور ناجیہ کے وجود میں طوفان اٹھنے لگا۔

ایک بار پھر اس کا دل مچلنے لگا۔ ایک بار پھر اس دنیا پر اعتماد کرنے کو

دل چاہنے لگا۔ وہ اُمڈتے ہوئے طوفانوں کو سمیٹے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس میں وہاں رکنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ جذبوں کو بے اختیار ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔ مرد کی ذات سے اس کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ کون جانے ابھی ایک زوردار قہقہہ لگا کر وہ کہے کہ

''صورت بھی دیکھی ہے، آئینے میں کبھی۔'' لیکن اس کا دل بے چین ہوگیا تھا۔

''وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ کیا کہے گا وہ؟ کیا یہ وہی شخص تھا جس کا وہ انتظار کر رہی تھی۔ کیا...... وہ بھی آئینے کی طرح سچا ہے؟ کیسے یقین کر لوں؟ کیسے یقین کر لوں؟''

دوسرے دن انسپکٹر پھر آ گیا اور مریض سے ملاقات کی۔

''جی جناب...... سہیل صاحب......! اب کیا حال ہے آپ کا......؟'' ناجیہ نے چونک کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ اس نے احتشام کے بجائے اسے سہیل کہہ کر پکارا تھا۔ وہ پھر بولا۔

''تمہارا خیال تھا کہ پولیس بے وقف ہے، وہ تمہارے اصل نام کا پتہ نہیں چلا سکے گی۔ احمق ہو تم...... اور تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم اپنے ساتھی کا بھی پتا بتا دو۔ تم غیر معروف سہی لیکن تمہارا ساتھی ڈاکہ زنی کے اور بھی کئی کیسوں میں مطلوب ہے۔ تمہارا خیال تھا کہ تم نے غلط نام بتا کر بہت بڑا تیر مارا ہے۔''

''نہیں آفیسر......! تمہارا خیال غلط ہے۔ میں نے دونوں نام صحیح لئے تھے۔''

''سارے مجرم ایسی ہی بے وقوفیوں کا سہارا لیتے ہیں لیکن پولیس

بے وقوف نہیں ہوتی۔ تم لوگ جرم کرتے ہو اور ہم تمہاری حرکتوں کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ آج تم اسپتال میں ہو لیکن کب تک...... کب تک اسپتال میں رہو گے......؟ آخر کار تمہیں ہماری تحویل میں آنا ہوگا اور اس کے بعد ہمارے پاس ایسے ایسے علاج موجود ہیں کہ مردے بھی بولنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور تم تو ابھی زندہ ہو۔ ہاں...... اگر پولیس کی مدد کرو گے تو تمہارے ساتھ رعایت ہو سکتی ہے۔ اس دوران جب تک تم اسپتال میں ہو تمہارا ساتھی بھی گرفتار ہو جانا چاہئے اور اگر ایسا نہ ہوا تو تمہیں سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ دوسری شکل میں سزائے موت عمر قید میں بدل سکتی ہے کیونکہ تمہیں قانون سے تعاون کرنے کی رعایت مل جائے گی۔ بتاؤ محمود خان کہاں چھپا ہوا ہے......؟''

''کون محمود خان......؟ میں نہیں جانتا۔''

''وہی اختر شاہ جس کا ٹھکانہ کچھ عرصے قبل ایک اور بدمعاش کے ہوٹل میں تھا جس کا نام غازی شاہ تھا۔ ہم نے پوری تحقیقات کر لی ہے، تم دونوں کی دوستی تین ماہ قبل ہوئی تھی اور اس کے بعد سے تم دونوں ایک ساتھ دیکھے جاتے رہے ہو۔ غالباً ڈاکہ زنی کا منصوبہ اسی کا تھا۔''

''کہتے رہو انسپکٹر......! تمہیں کون روک سکتا ہے......؟''

''میری رائے ہے سہیل......! کہ تم محمود خان کا پتا بتا دو۔ میں تمہاری مدد کا وعدہ کرتا ہوں۔ ممکن ہے تمہیں دس بارہ سال سے زیادہ کی سزا نہ ہونے دوں اور سرکاری گواہ کی حیثیت سے تم بچ جاؤ۔ دوسری صورت میں موت کی سزا یقینی ہے۔ موت اور دس بارہ سال کی سزا میں فرق محسوس کرتے ہو......؟ مجھے یقین ہے کہ تم عقل سے کام لو گے......!'' انسپکٹر نے کہا اور وہ

مسکرانے لگا۔

''کاش میرے پاس عقل ہوتی۔'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ انسپکٹر کے چہرے پر جھنجلاہٹ نظر آنے لگی۔

''تمہاری مرضی......! محمود خان تو خیر جلد یا دیر میں گرفتار ہو ہی جائے گا لیکن پھر تمہاری موت نہیں ٹل سکے گی۔'' وہ واپسی کے لئے باہر کی طرف چل پڑا۔ واپسی پر اس نے ناجیہ کو باہر آنے کا اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

''تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں نرس......!'' انسپکٹر اسے ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

''جی......!''

''ڈاکٹر ہاشم خان نے کہا ہے کہ اسپتال کے تمام ہی ذمے دار لوگوں کا خیال ہے کہ تم ایک قابل اعتماد اور ذہین خاتون ہو۔ تمہیں پولیس کی مدد کرنی چاہئے۔''

''میں حاضر ہوں جناب......!'' ناجیہ نے کہا لیکن اس کا ذہن اب بھی بھٹک رہا تھا۔ سہیل نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے انسپکٹر کو اب بھی حقیقت نہیں بتائی تھی اور اب کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ بلاشبہ انسپکٹر کی تحقیقات بھی بالکل ٹھیک تھیں۔ اس کا نام سہیل تھا اور یقیناً اس کے ساتھ کا نام محمود خان ہی ہوگا۔ کچھ عرصے قبل ہی وہ اس کے ساتھ شریک ہوا تھا، اپنی تقدیر بنانے کے لئے۔ اس نے ڈاکہ زنی کا اعتراف بھی کر لیا تھا، کیوں آخر؟ اس نے مجھ پر اتنا اعتماد کیوں کر لیا ہے؟ اس اعتماد کے پس پشت جذبے کیا درحقیقت سچے ہیں؟ اس کی آنکھوں میں خواب در آئے۔

انسپکٹر چلا گیا لیکن اس کے ذہن میں انوکھے وسوسے چھوڑ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے کندھوں پر ایک بہت بڑا بوجھ آ گیا ہو۔ ایک بہت بڑی ذمے داری اسے سونپ دی گئی ہو۔ سہیل کو موت کے شکنجے سے بچانے کی ذمہ داری۔ وہ مجرم ہونے کے باوجود معصوم ہے یا پھر بہت چالاک، بہت گہرا انسان ہے لیکن اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، اس کا سچ، اس کی طلب، اس کی آواز، ناجیہ خود کو بھنور میں پھنسا محسوس کرنے لگی اور اس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ بڑی بے بسی محسوس کر رہی تھی، مگر اب اسے صحیح فیصلہ کرنا تھا۔

رات کو وہ اسے پھر کھانا کھلا رہی تھی اور وہ خاموشی سے تکیے کے سہارے بیٹھا بڑے اعتماد سے کھانا کھا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے گھر میں کسی اپنے کے پاس موجود ہو۔ ناجیہ کی آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں اور اس کے بعد اس نے کھانا بند کر دیا۔

''اور لو......'' وہ بولی۔

''نہیں بس...... اب مزید طلب نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

وہ بیڈ پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''زندگی بے شمار لوگوں کے لئے بلکہ زیادہ تر لوگوں کے لئے کس قدر پرکشش ہوتی ہے نرس......!''

''تمہارا اپنی زندگی کے بارے میں کیا خیال ہے......؟''

''میں......'' وہ مسکرایا۔

''مرنا تو میں بھی نہیں چاہتا لیکن مر گیا تو زیادہ افسوس نہیں ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میری موت کا کسی کو دکھ نہیں ہوگا۔ بعض اوقات انسان

اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے پریشان ہوتا ہے۔ مجھے یہ سہولت حاصل ہے۔'' ناجیہ کو اس بات پر دکھ ہوا۔ وہ خود بھی تو اسی تنہائی کا شکار تھی۔ اکیلے پن کے درد کو سمجھتی تھی۔ اس نے کہا۔

''تم محمود خان کا پتا کیوں نہیں بتا دیتے......؟''

''فائدہ......؟''

''تمہاری زندگی بچ جائے گی۔''

''نہیں نرس......! ہم دونوں نے برابر محنت کی تھی۔ میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا نہ سہی، وہ تو عیش کر لے گا۔ کم از کم اپنی پرسکون زندگی میں وہ مجھے یاد تو کرے گا۔ جس نے اسے کسی عذاب میں گرفتار نہیں ہونے دیا۔ کسی کے لئے کچھ کر کے مر جانے کا مزہ بھی برا نہیں ہوگا۔ نرس......! میں اسے کبھی نہیں پھنساؤں گا۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔''

اس کی اس بات سے ناجیہ نے سوچا کہ وہ برا آدمی سہی لیکن ٹھوس کردار کا مالک ہے۔

''ایک اور خواہش بھی دل میں چٹکیاں لینے لگی ہے نرس......!'' چند لمحوں کے بعد اس نے کہا۔

''وہ کیا......؟''

''مجھے خوف ہے کہ تم ناراض ہو جاؤ گی......؟''

''نہیں...... بتاؤ......! نہیں ہوتی ناراض......!''

''محبت بھرے اس لمس کی کچھ قیمت چکانا چاہتا ہوں جو مجھے تمہارے اس وجود سے حاصل ہوا ہے۔ تمہارے نظریے کے مطابق اس لمس کے پیچھے پیشہ ورانہ جذبہ ہی کیوں نہ ہو لیکن میرے لئے یہ بہت بڑی چیز

تھی۔ ایک ایسا سرور ملا ہے مجھے اس سے جس نے میری زندگی بھر کی تشنگی مٹا دی ہے۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں نرس......! تمہاری ذات اس وقت میرے لئے ساری دنیا سے قیمتی ہے۔

اگر تم ناراض نہ ہو تو میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے حصے کی وہ رقم تم لے لو جو بہت بڑی ہے، تمہاری زندگی پُرسکون گزر جائے گی۔ میں جانتا ہوں وہ رقم جائز نہیں ہے لیکن یہ ایک برے آدمی کی خواہش ہے۔ بولو......! پوری کرو گی......؟'' ایک بار پھر ناجیہ کے پورے وجود میں تھرتھری دوڑ گئی۔

اب اس جذبے کو وہ کیا سمجھے......؟ اس نے اظہارِ محبت کر دیا ہے، اس کے جواب میں اس نے کچھ نہیں مانگا بلکہ کچھ دینا ہی چاہتا ہے۔ یہ جذبہ کتنی ہی بڑی رقم ہو، اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ کہیں زیادہ قیمتی ہے یہ جذبہ، بشرطیکہ سچا ہو۔

انسپکٹر کی ہدایت جلتے ہوئے انگاروں کی مانند اس کے کانوں میں اتر رہی تھی۔ وہ دیر تک جھنجلاتی رہی۔ اندر کی کشمکش سے وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔ کچھ دیر تک اس کے وجود میں طوفان ابھرتے رہے اور اس نے ایک بار پھر دھوکا کھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک عجیب ہی فیصلہ کر لیا جو اس سے قبل کبھی نہیں کیا تھا۔

''تم یا تو خود فریب کھا رہے ہو سہیل......! یہ مجھے فریب دے رہے ہو۔ میں اپنی قیمت اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے آئینہ دیکھا ہے اور آئینہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی مجھے چاہے۔ مجھے اپنی بدصورتی کا احساس ہے۔'' اس نے کہا۔

''بات تمہارے احساس کی نہیں ہے نرس......! میں اپنے احساس کی

ترجمانی کر رہا ہوں۔ میں تمہیں بے وقوف بنانے کے لئے یہ نہیں کہوں گا کہ تمہیں کوئی میری نگاہوں سے دیکھے۔ تم لاکھوں میں ایک ہو۔ میں تو اس پیار کی بات کر رہا ہوں جو تم نے مجھے دیا ہے۔ معاف کرنا نرس......! صورتیں تو قیمتاً بھی مل جاتی ہیں، جہاں سے چاہو اپنی مرضی کی حسین سے حسین شکل کو چھانٹ لو لیکن جذبوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

مجھے تمہارے اندر چھپے ہوئے حسن سے پیار ہے۔ صرف فرض کی ادائیگی سے تم ایک شخص کو پاگل کر سکتی ہو تو اگر کسی کو تمہاری پوری زندگی مل جائے تو وہ دنیا کا سب سے دولت مند انسان ہوگا۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

شدتِ جذبات سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے جذبات میں بھی شدید ہیجان تھا اور جب وہ اس ہیجان کو نہ دبا سکی تو اٹھ کر باہر نکل گئی لیکن انوکھی سرگوشیاں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ان سرگوشیوں سے وہ اپنا پیچھا نہ چھڑا سکی اور ساری رات بے کل رہی۔ ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی لیکن دوسری صبح وہ پُرسکون تھی۔ رات بھر کے کرب نے کچھ انوکھے فیصلے کر لئے تھے۔ اس نے پیار بھرے لمس سے سہیل کو جگایا اور وہ آنکھیں کھول کر مسکرا دیا۔

''کیسی طبیعت ہے......؟'' وہ بولی۔

''بالکل ٹھیک......! میں خواب میں تمہیں دیکھ رہا تھا پھر خواب ہی میں میں نے سوچا کہ تمہاری یہ قربت بھی خواب ہے لیکن پھر خواب ہی میں میں نے یہ بھی سوچا کہ جاگوں گا تب بھی تم ہی نظر آؤ گی۔ بتاؤ......! میرے اس اعتماد کو کوئی چیلنج کر سکتا ہے......؟''

’’ٹھیک ہے جناب......! اب اٹھ جایئے۔ تھوڑا سا چہرہ صاف کر دوں۔ سوپ لائی ہوں آپ کے لئے اور ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر دے رہی ہوں۔‘‘

’’کیوں......؟‘‘

’’اس لئے کہ میں جلد از جلد تمہیں تندرست دیکھنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’اکتا گئیں ناں مجھ سے......؟ ٹھیک ہو جاؤں گا تو پولیس مجھے اپنی تحویل میں لے لے گی، کیوں...... یہی خیال ہے ناں آپ کا......؟‘‘

’’نہیں......! میں تمہیں پولیس کی تحویل میں نہیں جانے دوں گی۔‘‘

اس نے پتھریلے لہجے میں کہا اور وہ تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔ تب وہ بے اختیار ہوگئی۔

’’میں نہ تو تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ سکتی ہوں، نہ پھانسی کے تختے پر۔ میں بھی انسان ہوں سہیل......! میں بھی تنہا ہوں۔ مجھے ٹھکرانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لوگوں نے میری بدصورتی کا مذاق ہمیشہ اڑایا ہے۔ ممکن ہے تم بھی مجھ سے مذاق کر رہے ہو لیکن ایک بار پھر میں اسی مذاق کا نشانہ بننا چاہتی ہوں۔ آخری بار...... بالکل آخری بار...... ڈاکٹر شہلا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں انتظار کروں۔ ممکن ہے کسی کی گہری نگاہیں میرے اندر جھانک لیں۔ تم نے ایک بار پھر میرے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے سہیل......! میں اپنے کان بند نہیں کر سکتی۔‘‘ اس نے سہیل کا ہاتھ اپنی مٹھی میں لے لیا۔

’’میرے لئے کیا کرو گی نرس......؟‘‘

’’نرس نہیں...... ناجی کہو مجھے...... ناجیہ ہے میرا نام...... ناجیہ کہتے

ہیں لوگ مجھے۔‘‘

’’ناجی......!‘‘ وہ پیار سے بولا۔

’’میں تمہیں پولیس کی گرفت سے نکال لوں گی۔‘‘

’’مگر کیسے...... یہ کیسے ممکن ہے......؟‘‘

’’میں اس ناممکن کو ممکن بناؤں گی...... اپنی جان پر کھیل کر۔‘‘

’’نہیں ناجیہ......! میں تمہیں کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کروانا چاہتا۔‘‘

’’ہمارے راستے ایک ہو چکے ہیں سہیل......! اب تم تنہا نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں...... بولو......! میرا ساتھ قبول کرو گے......؟ بولو......! میری بدصورتی کو نظرانداز کر کے مجھے اپنا لو گے......؟‘‘ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔

’’تمہارا قرب میرے لئے جنت ہوگا ناجی......! آہ......! میں اس جنت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کاش تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ سچ ہو۔‘‘

’’ہاں...... سہیل......! بالکل سچ ہے۔‘‘

’’کیا میں یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا......؟‘‘

’’یقیناً ایسا ہی ہوگا۔‘‘

’’تب ہم یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے۔ میں محمود خان سے اپنا حصہ وصول کروں گا۔ بہت بڑی رقم ہے یہ...... بہت بڑی رقم۔ جس سے ہم اپنے سنہرے مستقبل کا آغاز کر سکتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر، کار اور کوئی چھوٹا موٹا کاروبار۔ میں تم سے شادی کر لوں گا۔ پھر ہمارے بچے ہوں گے اور...... اور...... اور......‘‘

''سب کچھ ہو جائے گا سہیل......! سب کچھ ہوگا، خاموش ہو جاؤ......!'' اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

''اوہ......! سوپ تو بالکل ٹھنڈا ہو چکا۔'' وہ جلدی سے اس کے پاس سے اٹھ گئی۔ اس رات وہ کافی دیر تک سہیل کے ساتھ رہی۔ باہر بیٹھے کانسٹیبل اونگھ رہے تھے۔ اس نے ان دونوں کو عمدہ کافی پیش کی تھی جسے انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ غالباً اس طرح اس نے اپنے پروگرام کی ابتدا کر دی تھی۔

اسی رات اس نے سہیل کو دو کیپسول بھی کھلائے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی خوراک میں بھی نمایاں تبدیلی کر دی تھی اور سارا دن اسے اسپتال کی غذاؤں کے بجائے بہترین مقوی غذائیں ملی تھیں جو ناجیہ نے اپنی رہائش گاہ پر اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھیں۔

''میں چاہتی ہوں کہ دوسروں کے علم میں آئے بغیر تم جلد از جلد قوت حاصل کر لو۔ یہ کیپسول انتہائی طاقتور ہیں، ساتھ ہی زود ہضم بھی اور سنو......! تم تھوڑی دیر کے بعد میرا ہاتھ پکڑ کر چلنے کی مشق بھی کرو گے۔''

''ضرور...... لیکن اول تو کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی میں طویل عرصے تک یہاں سے کودنے کے قابل تو نہیں ہوسکتا۔''

''اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں نے کچھ اور سوچ لیا ہے۔''

''کیا...... مجھے نہیں بتاؤ گی......؟''

''کیوں نہیں......! تم چند روز میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گی

اور ہم اس دروازے سے ہی باہر چلیں گے۔''

''اور یہ محافظ......؟'' سہیل نے کہا۔

''ان کے لئے میں نے آج ہی سے بندوبست شروع کر دیا ہے۔ رات کی ڈیوٹی میں یہ ہی دونوں سپاہی ہوتے ہیں، میں نے انہیں عمدہ کافی پلائی ہے جسے یہ بھول نہیں سکیں گے اور آج کے بعد ہر رات یہ کافی انہیں ملتی رہے گی اور اس رات، جس رات ہم یہاں سے جائیں گے، کافی میں ایک ایسی بے رنگ، بے مزہ دوا ہوگی جو انہیں محسوس نہیں ہو سکے گی اور وہ چار پانچ گھنٹوں کے لئے دنیا سے بے خبر ہو جائیں گے۔'' سہیل کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے مسرور لہجے میں کہا۔

''اور تم میرے لئے اتنے خطرات لے لوگی ناجی......! میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ شاید میری تقدیر کی گردشیں ختم ہوگئی ہیں۔ تم نے ایک بار پھر میری روح زندہ کر دی ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور ناجیہ نے یہ آنسو خشک کر لئے۔

''بس...... اب جذباتی نہ بنو...... ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔ تمہارا قیام طویل بنانے کے لئے میں آج سے تمہارے چارٹ میں تبدیلیاں بھی کروں گی۔ یہ طاقتور کیپسول تمہیں ہلکا سا بخار کر دیں گے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بخار تمہارے لئے ضروری ہے تاکہ ڈاکٹر ہاشم جو تمہارے معالج ہیں، انسپکٹر سے کہہ دیں کہ تم ابھی بہت کمزور ہو۔ آؤ...... اٹھنے کی کوشش کرو۔ محافظ بھی نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔'' وہ ناجیہ کے سہارے نیچے اتر آیا اور بستر سے کئی قدم دور تک اس کے ساتھ پیدل چلا۔ ناجیہ اس کی کیفیات نوٹ کر رہی تھی۔

''کوئی خاص بات تو محسوس نہیں کی......؟''

''نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''جب بھی موقع ملے، یعنی محافظ ہماری طرف متوجہ نہ ہوں تو اپنے ہاتھ پیروں کو جنبش دیتے رہو۔ اس سے دورانِ خون بحال ہوگا۔ اس میں چلتی ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی۔'' وہ باہر نکل گئی اور سہیل پُرخیال نگاہوں سے دیر تک دروازے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک گہری پُرجوش محبت مل جانے کے خیال سے یا شاید اپنی خوش آئند زندگی کے تصور سے، جب وہ ایک انتہائی دولت مند آدمی ہوگا۔ ایک شاندار زندگی کا مالک۔ ناجیہ کی کوششیں جاری رہیں۔

دوسری صبح اس کے بخار کو دیکھ کر ڈاکٹر ہاشم نے تشویش کا اظہار کیا اور اس نے چند دوائیں تجویز کیں اور ڈاکٹر شہلا سے کہا۔

''میرے خیال میں اس کے ذہن پر برا اثر پڑا ہے۔ مجھے انسپکٹر کو ہدایت کرنا پڑے گی کہ جب تک یہ زیر علاج ہے اسے پریشان نہ کرے۔''

کچھ اور نئی دوائیں ناجیہ کے حوالے کر دیں گئیں لیکن ان کے بجائے ناجیہ اسے طاقت کے انجکشن دیتی رہی۔ غذاؤں کی تبدیلی بھی بحال رہی لیکن یہ بات ان دونوں کے درمیان ہی تھی۔

یہ معاملات جاری رہے۔ سہیل کا اس پر خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔ اس کی صحت بحال ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں مشورے کرتے رہتے۔ سہیل کی فرمائش پر ناجیہ نے نچلی منزل تک کے سارے راستے اور ان پر موجود لوگوں کی فہرست اور اسپتال کے دوسرے معمولات سے آگاہ کر دیا تھا۔ ساتویں دن ناجیہ نے اس کے زخم پر نئی پٹی کی تو خوشی سے کھل اٹھی اور

مسرت بھرے لہجے میں بولی۔

''انتہائی اطمینان بخش، زخم بھر چکا ہے اور اس پر باریک کھرنڈ آ گیا ہے۔''

''ہمیں چند چیزوں کی ضرورت پڑے گی ناجیہ......!''

''مثلاً......!''

''بعد میں استعمال کرنے والی دوائیں، لباس کا ایک جوڑا وغیرہ۔''

''تم فکر کیوں کرتے ہو......؟ سارے انتظامات میں کرلوں گی۔''

''اچھا...... ایک بات اور بتاؤ......!''

''ہاں...... بولو......!''

''اسپتال سے نکلنے کے بعد ہم سفر کیسے کریں گے......؟''

''بالکل فکرمند نہ ہوں۔ ساری رات باہر ٹیکسیاں مل جاتی ہیں۔ ہم یہاں سے سیدھے ریلوے اسٹیشن چلیں گے اور وہاں سے دوسری ٹیکسی کے ذریعے وہاں جہاں تم جانا چاہو۔''

''ٹھیک ہے......! یہ مناسب بات ہے۔''

''اور بات رہ گئی لباس کی تو میں تمہارا سائز لے کر نیا لباس خرید لوں گی۔''

''بہت شکریہ......!''

''مگر تم نے یہ نہیں بتایا سہیل......! کہ یہاں سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے......؟''

''پہلے اس جگہ جہاں میرا دوست محمود خان موجود ہے۔ اس کے بعد ان خوابوں کی وادیوں کی جانب جو ہمارے تصور میں پوشیدہ ہیں۔'' سہیل

نے جذباتی لہجے میں کہا اور ناجیہ گہری حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کاش سہیل تم سچ بول رہے ہو۔ کاش تم میرے انتظار کی حد ہو۔ کاش تم اسی آئینے کی طرح سچے ہو جو مجھے میری حقیقت بتا دیتا ہے۔''

''کس سوچ میں ڈوب گئیں ناجیہ......!''

''کچھ نہیں......! میں بھی بس انہی خوابوں کی وادیوں کو دیکھ رہی تھی جو تمہارے قدموں میں چھپی ہوئی ہیں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''قدموں میں نہیں...... میرے دل میں دیکھو۔'' سہیل بولا اور اس کے دونوں ہاتھ گرفت میں لے لئے۔



اس رات تقدیر کو کئی فیصلے کرنے تھے۔ ناجیہ نے محافظوں کو کافی دی جسے انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ یہ کئی راتوں کا معمول تھا۔ اس لئے شک و شبہے کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ پھر وہ کافی کی ٹرے لئے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔ سہیل اس کے انتظار میں پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر سہیل نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ناجیہ نے اسے روک دیا۔

''ابھی نہیں......! محافظوں کو دس منٹ دینے پڑیں گے۔'' وہ بولی۔

سہیل خاموشی سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اس دوران ناجیہ نے لباس کا بنڈل نکال لیا اور شلوار کے نیفے میں ازاربند ڈالنے لگی۔ لباس درست کر کے اس نے ایک جگہ رکھا اور چند منٹ کے انتظار کے بعد مسکراتے ہوئے باہر آ گئی۔

دونوں محافظوں کی گردنیں ڈھلکی ہوئی تھیں۔ کافی کی پیالیاں اٹھا کر

وہ جلدی سے اندر داخل ہوگئی۔ پھر اس نے سہیل کو لباس پہننے میں مدد دی۔ سہیل کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ناجیہ نے کنگھے سے اس کے بال درست کئے۔

اس وقت ساڑھے بارہ بجے تھے اور چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ وہ سہیل کو سہارا دے کر باہر نکل آئی۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ اس کے بعد وہ سنسان راہ داری سے گزر کر سیڑھیوں تک آئے۔ ناجیہ نے سہیل کا سارا بوجھ اپنے اوپر لیا ہوا تھا۔ اسے احتیاط سے اتار کر نیچے لائی اور عقبی راستے سے ہوتے ہوئے اس سمت چلنے لگی جہاں اس کی رہائش گاہ تھی۔ پھر کچھ لمحوں کے لئے اس نے سہیل سے اجازت چاہی اور اسے ایک تاریک جگہ پر کھڑا کر کے خود برق رفتاری سے اپنی رہائش گاہ میں چلی گئی۔

ضروری چیزیں اس نے پہلے ہی پیک کر رکھی تھیں جن میں سہیل کے لئے بعد میں استعمال کرنے والی دوائیں اور چند لباس وغیرہ تھے۔ پھر وہ دوبارہ سہیل کے پاس آ گئی۔

''تم ٹھیک ہو ناں......؟''

''ہاں......!'' سہیل نے خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا۔

''آؤ......! اب ہم اس راستے سے باہر چلیں گے۔ یہ راستہ اسپتال کی عام گزرگاہ سے ہٹ کر ہے۔'' اس نے سہیل کا بازو اپنی گردن میں ڈال لیا اور اسے سہارا دیئے اسپتال سے باہر لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ ٹیکسیاں اب کہاں مل سکتی ہیں۔ اکثر ڈرائیور اپنی ٹیکسیوں میں سو رہے تھے۔ ایک ٹیکسی کے قریب پہنچ کر ناجیہ نے سوتے ہوئے ڈرائیور کو آواز دی تو وہ جاگ کر

مستعد ہوگیا۔

''اسٹیشن چلو گے......؟''

''جی......!'' ڈرائیور نے پچھلا دروازہ کھول دیا اور ٹیکسی اسٹیشن جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ دونوں خاموش تھے۔ بولنے کی کوشش بھی کرتے تو آوازوں پر قابو نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اسٹیشن پہنچ گئے۔ ٹیکسی واپس مڑ گئی تھی۔

ناجیہ نے چاروں طرف دیکھا۔ مسافر خانے میں سارے لوگ سو رہے تھے۔ وہ دونوں دبے قدموں آگے بڑھ گئے اور جب یقین ہوگیا کہ کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہے تو واپس ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف مڑ گئے۔

اب ٹیکسی ڈرائیور کو راستہ سہیل نے بتانا تھا۔ راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ نہ جانے دونوں کے ذہنوں میں کیا کیا خیالات تھے۔

بہرحال...... وہ اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں زیادہ تر عیسائیوں کی رہائش تھی اور ان میں فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ ایک عمارت کے سامنے ٹیکسی رکوا کر ناجیہ نے سہیل کی ہدایت کے مطابق ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور پھر وہ اس عمارت کی طرف چل پڑے۔ ایک تنگ سی گلی سے گزر کر وہ دوسری سڑک پر آئے۔

اس کے بالکل کنارے کی بلڈنگ کے بڑے دروازے کی دو سیڑھیاں عبور کر کے وہ ایک احاطے میں پہنچ گئے۔ عمارت تین منزلہ تھی اور اس کے زینے لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔

''پہلی منزل......!'' سہیل نے کہا۔ اس مسلسل بھاگ دوڑ نے سہیل کو تھکا دیا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔

بہرحال...... پہلی منزل کی راہ داری کے تیسرے دروازے پر پہنچ کر سہیل نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ دو تین بار کال بیل بجانے پر اندر روشنی ہوگئی اور پھر بند دروازہ کھل گیا۔

تیز روشنی میں ناجیہ نے ایک طویل القامت مرد کو دیکھا جو سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے پیچھے گہرے سبز گاؤن میں لپٹی ہوئی بکھرے بالوں والی ایک اٹھائیس تیس سالہ عورت تھی جس کے ہونٹوں پر سرخی جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے بے یقینی کے انداز میں سہیل اور ناجیہ کو دیکھا۔ پھر مرد کے حلق سے پھٹی پھٹی سی آواز نکلی۔

''ارے سہیل......! میری جان......! میرے دوست......! آؤ...... اندر آؤ......! تم آگئے...... آخر کار تم آگئے...... میں نے ...... میں نے نائلہ کو...... میرا مطلب ہے بھابی کو یہ بات بتا دی تھی کہ آخر کار تم پولیس کی تحویل سے نکل آؤ گے۔'' مرد کی آواز بہکی بہکی سی تھی۔ وہ جیسے مشینی انداز میں بول رہا تھا۔ کسی خوف کسی ہیجان کے تحت سہیل نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر تیز روشنی میں ناجیہ نے بخوبی دیکھا تھا کہ نائلہ نے واپس مڑتے ہوئے اپنے چہرے سے لپ اسٹک کے دھبے صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

''آؤ ناجی......!'' سہیل نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور ناجیہ اس کے ساتھ اندر داخل ہوگئی۔ طویل القامت نے دروازہ بند کر دیا۔ تب ہی جیسے سبز گاؤن والی عورت کو ہوش آ گیا۔ اس نے ایک ہلکی سی چیخ ماری اور دوڑ کر سہیل سے لپٹ گئی۔

''سہیل......! میری جان......! میری زندگی......! میری روح......! آہ......! تم نے تو مجھے زندہ درگور کر دیا تھا۔ تمہاری جدائی کا ہر لمحہ میرے لئے

موت تھا۔'' اس نے سہیل کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔

''میں زخمی ہوں نائلہ......! میرے اوپر وزن مت ڈالنا۔''

''آؤ...... میری جان......! آؤ......!'' اس نے سہارا دے کر سہیل کے ساتھ اندر قدم بڑھا دیئے۔ طویل القامت شخص نے ناجیہ کے ہاتھ سے سامان لے لیا اور پھر اس نے ناجیہ کو بھی اندر چلنے کی پیشکش کی۔ ناجیہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے دل نے لرزنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے وہی پرانی داستان سنا رہی تھی جو اس کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں وہ عورت سہیل کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ سہیل نے ناجیہ کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ قطعی بدلی ہوئی مسکراہٹ جو ناجیہ کے لئے اجنبی تھی۔ اس مسکراہٹ میں وہ معصومیت نہیں تھی۔

''سوری ناجیہ......! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے جذبات کا احترام نہیں کر سکا۔ تمہاری خواہش پوری نہیں کر سکا۔ نائلہ سے ملو...... یہ میری بیوی ہے اور یہ میرا دوست محمود خان...... یہ...... ناجیہ ہیں۔ میرے فرار میں میری معاون۔ اس اسپتال کی نرس جس میں مجھے داخل کیا گیا تھا۔

اصل میں ان کی شکل صورت دیکھ کر ہی یہ پلان میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ شاید فرار کی کوئی دوسری کوشش کامیاب نہ ہوتی۔ مجھے یقین تھا کہ اس بدصورت نرس کو کوئی منہ نہ لگاتا ہوگا اور یہ محبت کے ان حسین لمحات کی متلاشی ضرور ہوگی جو اس عمر کا خاص تقاضا ہوتا ہے اور مجھے یقین ہوگیا کہ میرے خیال میں یہ بہترین معاون ہوگی اور یہ تو تم لوگوں کو معلوم ہی ہے کہ

کالج کے زمانے میں میں نے بہترین اداکاری کے انعامات حاصل کئے ہیں۔

اصل میں انسان کو ہر دور میں اداکاری کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ محترمہ میرے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگیں اور انہی خوابوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی یہ خاتون یہاں تک آگئیں۔

بہرحال...... میں ان کا شکر گزار ہوں۔ بہت بہت شکریہ مس ناجیہ......! اب آپ جا سکتی ہیں۔''

''جا سکتی ہیں......؟'' محمود خان نے تعجب سے کہا۔

''ہاں......! اب ان کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے تو انہیں مزید تکلیف کیوں دی جائے......؟''

''مگر یہ میری ضرورت تو بن سکتی ہیں ناں......؟'' محمود خان نے مکروہ مسکراہٹ سے کہا۔

''نہیں یار......! دنیا بہت وسیع ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی بے وقوف ان کی زندگی کا ساتھی بننے پر آمادہ ہو ہی جائے۔ کم از کم ان کے قرض کی کوئی ادائیگی تو کرنے ہی دو۔'' سہیل نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں سہیل......! کیسی باتیں کر رہے ہو......؟ ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ کیا یہ یہاں سے واپس جا کر پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع نہیں دے گی......؟'' محمود خان نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو......؟ یہ ایسی حماقت کبھی نہیں کرے گی۔ یہ قاتل کے فرار میں معاون ہوئی ہے۔ پولیس اسے ساری زندگی جیل میں سزا دے گی۔ اس بات کو تو یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوگی۔ نائلہ ڈارلنگ......! مجھے

سگریٹ سلگا دو......!" سہیل نے بیوی سے کہا اور ناجیہ کی طرف رخ کر کے بولا۔

"بہترین طریقہ یہ ہے مس ناجی ......! کہ تم اسپتال واپس جاؤ اور تھوڑی سی کافی خود بھی پی کر بے ہوش ہو جاؤ۔ اس طرح یہ ظاہر ہوگا کہ یہ کام اسپتال سے باہر کے کسی آدمی کا ہے اور یوں تم پولیس کی نگاہوں میں مشکوک ہونے سے بچ جاؤ گی۔ ورنہ تم ان پولیس والوں سے واقف نہیں ہو۔ خاص طور پر ایک پولیس مین کے قاتل کی معاونت کرنے والے کو وہ کبھی معاف نہیں کریں گے۔

بس اب جلدی کرو ورنہ گزرتے ہوئے لمحات تمہارے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوں گے۔ میرا یہ شیطان صفت دوست تمہیں بہت بری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے خیال میں ہر جوان عورت ہر حالت میں عورت ہوتی ہے۔ تمہارے پاس واپسی کا کرایہ تو ضرور ہوگا......؟" ناجیہ تیزی سے واپسی کے لئے مڑ گئی۔

ڈرائنگ روم سے باہر آ کر اس نے باہر جانے والا بند دروازہ کھولا اور نیچے جانے والی سیڑھیاں اترنے لگی۔

اس کے چہرے پر سکون تھا۔ چال میں بھی کوئی لغزش نہیں تھی۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ وہ باتیں جو سہیل کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی یا نہیں کر سکی تھی۔

"یہ انجام میرے لئے اجنبی نہیں ہے سہیل......! میں نے تو بہت بار یہ زخم کھائے ہیں لیکن یہ آخری زخم تھا اور مجھ سے محبت کا ناٹک رچانے والے تم آخری مرد تھے۔ البتہ تم جیسے لوگوں سے انتقام لینے کے لئے بنیاد تم

سے ہی پڑی ہے۔ اس سے پہلے والوں کو میں معاف کرتی رہی ہوں لیکن تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ یہ بات میں نے اسی وقت سوچ لی تھی جب انسپکٹر نوریز نے مجھے اپنی اسکیم بتائی تھی۔

اس نے کہا تھا کہ نرس......! قانون کی مدد کرنا ہر شہری کا فرض ہے۔ تمہارے بارے میں، میں نے جو کچھ سنا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ایک نیک دل اور شریف النفس خاتون ہو اور اسی بنیاد پر میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ قانون کی مدد کرو۔ یہ شخص جو تمہاری زیر نگرانی ہے، قاتل بھی ہے اور ڈاکو بھی۔ اس کا ساتھی رقم لے کر فرار ہو گیا ہے اور ہمیں اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ اگر تم اس شخص کو اعتماد میں لے کر اسے فرار ہونے کا موقع دو اور اس کی معاونت کرو۔ تو ہم اس کے ساتھی تک پہنچ سکتے ہیں اور یہ تمہارا قانون کے ساتھ تعاون ہوگا جس کے لئے قانون تمہارا بے حد شکر گزار ہوگا اور اسی وقت میں نے یہ فیصلہ کیا تھا سہیل ......! کہ اگر تم مجھ سے مخلص ہوئے تو میں تمہارے ساتھ زندگی کی ان شاہراہوں پر چل کر بہت دور نکل جاؤں گی، تمہیں اتنا پیار دوں گی کہ کائنات کے خزانوں میں بھی نہ ہوگا لیکن اگر تم بھی عام مردوں کی طرح دھوکے باز نکلے تو ......تو پھر... پہلی اور آخری بار میں اس مرد سے انتقام لوں گی اور تم نے آخر کار مجھے مجبور کر ہی دیا۔" وہ دونوں گلیاں طے کر کے سڑک پر نکل آئی اور پھر اس کی نظریں بھٹکنے لگیں۔

اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے موبائل فون نکالا اور اس پر وہ نمبر ڈائل کرنے لگی جو اسے انسپکٹر نوریز نے دیا تھا۔

"ہاں......انسپکٹر صاحب......! آپ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے

میں نے اسے فرار کرا دیا ہے اور اس کے ساتھ آ کر اس کی رہائش گاہ دیکھ لی ہے۔ یہاں اس کا ساتھی محمود خان اور بیوی نائلہ موجود ہیں۔''

''اوہو...... سسٹر ناجیہ......! کون سی جگہ ہے......؟'' انسپکٹر کی پُر جوش آواز سنائی دی اور وہ اسے یہاں کا پتا بتانے لگی۔

''آپ یہاں پہنچ جائیں، میں آپ کی رہنمائی کروں گی۔''

''بس...... دس منٹ......! صرف دس منٹ......!'' انسپکٹر نے فون بند کر دیا اور ناجیہ نے بے رحمی سے مسکراتے ہوئے موبائل فون آف کر دیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں فتح و کامرانی کی چمک تھی۔ پھر وہ پولیس کا انتظار کرنے لگی۔ انسپکٹر حسب وعدہ پہنچ گیا۔

''آپ خیریت سے تو ہیں مس ناجیہ......!''

''جی سر......! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس سامنے والی گلی میں کونے کی بلڈنگ کی پہلی منزل کے تیسرے فلیٹ میں......'' اس نے انسپکٹر کو پتا سمجھا دیا اور انسپکٹر برق رفتاری سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ پھر وہ تاریک و تنگ گلی میں آگے بڑھنے لگی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک بڑبڑاہٹ سی نکل رہی تھی۔

دوا جے نئیں سی درد دی
(جب درد کی دوا ہی نہیں)

کیتا سی پیدا درد کیوں
(تو درد پیدا ہی کیوں کیا)

جگ سارا ای جے بے درد سی

(جب ساری دنیا ہی بے درد ہے)

تے درد سی ہمدرد کیوں
(تب درد کے ہمدرد کیوں)

کوئی تے ایسا دل بنا
(کوئی تو ایسا دل بنا)

دکھڑے سنے دلگیر دے
(جو ٹوٹے دل کے دکھڑے سنے)

لوح و قلم دیا مالکا
(لوح وقلم کے مالک)

صدقے تیری تحریر کے
(تیری تحریر کے صدقے)



ادھوری تصویر

کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسا شاہکار جو ہمیشہ کی طرح ہلچل مچا دے۔ ایک بار پھر ثابت ہو جائے کہ معیز اپنے فن میں منفرد ہے۔ فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کی نگاہیں اس پر لگی ہوئیں تھیں۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اس نمائش میں حصہ لے گا۔ اور جب مصوروں کی فہرست شائع ہوئی تو فن شناسوں نے رائے دے دی کہ معیز کا مقابلہ مشکل ہے۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوا تھا۔ ملک بھر کے مصور بار بار اس کے مقابل آ چکے تھے لیکن اس جیسی سوچ، جدت اور اس کا سا خیال نہ لا سکے۔

وہ مصورِ فطرت تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کا عکاس، رنگ اور برش اس کے ہاتھوں میں آ کر گویا باتیں کرتے تھے، رنگ اپنی جگہ کا تعین خود کر دیتے، لکیریں اپنی سمتیں بناتیں اور وہ ان کی مدد سے شاہکار تخلیق کرتا چلا جاتا اور جب یہ شاہکار منظر عام پر آتے تو فن شناس سر دھن لیتے تھے۔ دیکھنے والوں کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ملک سے باہر بھی کئی بار اس کی تصویروں کی کامیاب نمائش ہو چکی تھی۔

مرزا شمشیر بیگ ساری والے ہر چند کہ فن مصوری کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھے لیکن اکلوتے بیٹے کے شوق کو انہوں نے بھی بڑھاوا دیا تھا۔ ہر طرح اس سے تعاون کرتے۔

نورولاز کا ایک علیحدہ حصہ اس کی خواہش کے مطابق تعمیر کرایا گیا تھا۔ جہاں اس کا نگارخانہ تھا جو وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے قرب و جوار کی جگہ کو ایک مصور کی نازک خیالیوں کا نمونہ بنایا گیا تھا۔ عام کیا خاص لوگوں کو بھی اس نگار خانے تک رسائی نہیں تھی۔

نور ولاز خود بھی ایک عالی شان عمارت تھی اور مرزا شمشیر بیگم کے شناسا اکثر اپنے ملکی اور غیر ملکی دوستوں کو یہاں کی سیر ضرور کراتے تھے۔ لیکن خود مرزا صاحب بھی کسی سے اس نگارخانے کو دکھانے کا وعدہ نہیں کر سکتے تھے۔ معیز شاذ و نادر ہی کسی کو نگار خانے میں داخل ہونے کی اجازت دیتا تھا۔

درحقیقت وہ ایک باکمال مصور تھا۔ زندگی کے نشیب و فراز کا باریک بینی سے جائزہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور پھر رنگ اور برش کے ملاپ سے کسی بھی خیال کو زندہ کر لینا اس کے لئے کوئی مشکل امر نہیں تھا۔

اس بار بھی کلر اینڈ آرٹسٹ نامی ایک سوسائٹی نے تصاویر کی نمائش کا انعقاد کیا تھا اور ملک میں بڑے بڑے مصوروں کو مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دی تھی اور دعوت نامے ارسال کئے گئے تھے۔ معیز کے بارے میں کسی کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوگا لیکن اس کی طرف سے اطلاع مل گئی تھی کہ وہ مقابلے میں حصہ لے گا۔ پھر حصہ لینے والے مصوروں کے ناموں کی فہرست شائع ہوئی تو بہت سے چراغ بجھ گئے

اور فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والے نمائش کی تاریخ کا انتظار کرنے لگے۔

معیز نے پھر ایک ذمے داری قبول کر لی تھی اور ان دنوں وہ کسی اچھوتے خیال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس کی خوب صورت کار سڑکوں، بازاروں اور ویرانوں میں بھٹکتی پھرتی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس بار کس خیال کو موضوع بنائے۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تخلیق، کوئی ایسی چیز ہو جو ہلچل مچا دے۔

پھر اسے اس کا خیال مل گیا۔ اس کی لمبی کار ایک سگنل پر رُکی تھی۔

سامنے والی کار کی کھڑکی سے ایک بھکارن نے ہاتھ اندر ڈالا اور جواب ملنے پر مایوسی سے گردن جھکا کر آگے بڑھ گئی۔ اس بار وہ معیز کے پاس آئی تھی۔

بوسیدہ، میلا کچیلا لباس، پیوند لگا ہوا، مٹی سے اٹے ہوئے بال، دبلا پتلا بدن، سوکھا چہرہ لیکن حسین ترین نقوش، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ جن پر اگر خشک پپڑیاں نہ جمی ہوتیں تو ان کا یہ گلابی رنگ نمایاں ہوتا۔ سفید رنگ جسے گرد اور دھوپ نے ماند کر دیا تھا۔

گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی وہ معیز کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

اس کے دبلے پتلے ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں معیز کے سامنے پھیل گئیں۔ معیز نے ان آنکھوں کے سوالات کو پڑھا اور پھر جلدی سے بولا۔

''سگنل کے اس طرف آ جاؤ......! میں تمہیں بہت کچھ دوں گا۔ فکر مت کرو۔ کوئی بدتمیزی نہیں ہوگی تمہارے ساتھ۔''

اس کی آنکھوں میں شبہات ابھر آئے۔ ہاتھ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ معیز نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا اور اس کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''ایسے بہت سے نوٹ مل سکتے ہیں تمہیں...... اس طرف آ جاؤ......!''

سگنل کی روشنی سبز ہوگئی اور اس نے کار آگے بڑھا دی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بائیں طرف کا انڈیکیٹر آن کر دیا تھا۔ کار کو آہستہ آہستہ اس نے بائیں سمت کر کے سڑک کے کنارے روک دیا اور عقب نما آئینے میں بھکارن کو تلاش کرنے لگا۔ وہ آئینے میں نظر نہ آئی تو اس نے کھڑکی سے گردن نکال کر پیچھے دیکھا۔

چوراہے کے دوسری جانب وہ ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اس کار کی سمت لگی ہوئی تھیں۔ معیز نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور انتظار کرنے لگا لیکن وہ جھجک رہی تھی۔

''بے وقوف کہیں کی...... اس سے زیادہ اس کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے......؟'' معیز کو جھنجلاہٹ ہونے لگی۔

ایک بار پھر اس نے جھلائے ہوئے انداز میں ہاتھ ہلایا اور وہ اس طرح آگے بڑھنے لگی جیسے اسے پیچھے سے کوئی دھکیل رہا ہو۔ نہ جانے کون سا خیال اُسے دھکیل رہا تھا۔ جب وہ سڑک عبور کرنے لگی تو معیز کو کسی قدر سکون ہوا اور چند لمحات کے بعد وہ معیز کے پاس آ گئی۔ وہ اب بھی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

''خدا سلامت رکھے بابو جی......! اللہ کے نام پر......''

''نخرے کیوں دکھا رہی تھی تو......؟'' معیز بولا۔

''خدا خوش رکھے بابو جی......! اللہ کے نام پر...... جمعرات ہے۔''

اس نے پھر کہا۔ معیز کی بات کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

''اچھا...... جمعرات ہے آج...... اس اطلاع کا شکریہ......! نام کیا ہے تیرا......؟''

''خوشبو......! بابو جی کچھ اللہ......''

''ہاں ہاں...... ایک ہی رٹ مت لگا...... یہ بتا تو سو روپے روز پر کام کرے گی......؟ دو سو روپے روز بھی مل سکتے ہیں...... جواب دے......!''

''نہیں بابو جی......! ہم عزت نہیں بیچتے...... اللہ کے نام پر کچھ دے سکتے ہو تو دے دو......!''

''بے وقوف ہے تو...... تجھ سے عزت کون مانگ رہا ہے......؟ میں مصور ہوں...... تیری تصویر بنانا چاہتا ہوں...... تصویر سمجھتی ہے......؟''

''ہاں بابو جی......!''

''بس......! میں تیری تصویر بناؤں گا۔ روزانہ دو گھنٹے کے لئے تجھے میرے پاس آنا پڑے گا۔ کم از کم ایک ہفتے کا یہ کام ہے، دو سو روپے روز دوں گا تجھے...... بول منظور ہے......؟''

''نہیں بابو جی......! دے دو کچھ اللہ کے نام پر......!''

''جہنم میں جا...... تیرا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ پارسا بن رہی ہے۔ دیکھ مجھ پر بھروسہ کر...... میں صرف تیری تصویر بناؤں گا۔ ایسی تصویر کہ تو دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔ جس جگہ تجھے آنا پڑے گا وہ میرا گھر ہے...... وہاں میری ماں ہے...... بہنیں ہیں...... بہت سے لوگ ہیں وہاں...... تو ایک مرتبہ میری بات مان لے۔ اگر کوئی پریشانی ہو تجھے تو آئندہ مت آنا۔''

معیز کو اس کے انکار سے سخت جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ وہ ایک دفعہ

میں کیوں نہیں مان جاتی......؟ بھکارن کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔

''ہم مان جائیں گے بابو جی......! پر ایک بات سن لو......!''

''ہاں کہو......!'' معیز خوش ہو کر بولا۔

''ہمیں سانس کا مرض ہے اور...... اور...... دق بھی ہے۔ سردیوں میں سانس اکھڑتا ہے اور گرمیوں میں منہ سے خون آتا ہے۔ یہ چھوت کی بیماری ہے۔ ہمیں چھوؤ گے تو خود بھی نقصان اٹھاؤ گے۔''

''میں صرف تیری تصویر بناؤں گا اور تصویر بنانے کے لئے کسی کو چھونا نہیں پڑتا...... سمجھی تو......؟''

''ٹھیک ہے......! کہاں ہے تیرا گھر......؟''

''بیٹھ جا پیچھے...... چل بیٹھ جا......!'' معیز نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔ بھکارن جھجکتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔ پیچھے ایک دکان میں بیٹھے ہوئے دو تین لڑکوں نے آوازیں لگائیں۔

''ابے کیا گھٹیا ٹیسٹ ہے...... کوئی ڈھنگ کی لونڈیا نہیں ملی تجھے......؟''

معیز نے سنی ان سنی کر دی اور کار آگے بڑھا دی۔ دکان پر بیٹھے لڑکے اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بول پڑی۔

''سن لیا تم نے بابو جی......!''

''ذلیل تھے...... آوارہ کہیں کے......؟''

''ہمارا یہ ٹھکانہ تو آج چھن گیا بابو جی......!''

''کیوں......؟'' وہ سڑک پر دیکھتے ہوئے بولا۔

''اب اگر ادھر بھیک مانگنے آئیں گے تو یہ لڑکے ناک میں دم کر

دیں گے۔''

''ہوں......تو کہیں اور نکل جانا۔ شہر چھوٹا تو نہیں ہے۔'' معیز نے کہا اور وہ خاموش سی بیٹھ گئی۔ سہمی سہمی سی۔ معیز نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔

وہ نور ولاز کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ وہ عموماً اسی طرف سے آتا تھا۔ عقبی پورچ میں اس نے کار روکی اور نیچے اتر آیا۔

''آجا......!'' اس نے بھکارن کے لئے دروازہ کھول دیا اور وہ نیچے اتر آئی۔ اس کا چہرہ کچھ اور ست گیا تھا۔ وہ کچھ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی لیکن معیز کے ساتھ وہ آگے بڑھتی رہی اور اس نگار خانے میں داخل ہوگئی جہاں اچھے اچھے لوگ قدم نہیں رکھ پاتے تھے۔

چاروں طرف حسین تصاویر آویزاں تھیں۔ ہر شے قابل حیرت، بھکارن کی زبان بند ہوگئی۔ یہ طلسم کدہ روئے زمین پر تھا لیکن اس کا تصور بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر جس وقت اسے ہوش آیا تو اس کے بدن میں خوف کی لرزش پیدا ہوگئی۔

''تم نے بولا تھا بابو جی......! تمہاری ماں اور بہن......؟'' اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا کرنا ہے...... تجھے ان لوگوں کا......؟ خاموشی سے اس جگہ بیٹھ جا......!'' اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ سڑکوں کی بات اور تھی اور وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن یہ اس کا نگار خانہ تھا اور وہ یہاں کا شہنشاہ تھا۔ اس کی سلطنت میں کوئی اس سے برتر نہیں تھا۔ بھکارن سہمی سہمی سی بیٹھ گئی۔ وہ آنے والے وقت کے لئے خود کو تیار کر رہی تھی۔

معیز تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ مصور تھا۔ اس کی نگاہ میں اپنا شاہکار گردش کر رہا تھا۔ وہ گہری نظروں سے بھکارن کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی ہر نگاہ سے کانپ رہی تھی۔ پھر معیز نے کیمرہ سنبھال لیا اور مختلف زاویوں سے اس کی تصاویر اتارنے لگا۔ درجنوں تصاویر اتاریں اس نے بھکارن کی۔ اور مطمئن ہوگیا، آج کا کام بس اتنا ہی تھا۔ اب ان تصاویر میں سے کوئی ایک پوز منتخب کرنا تھا اور اسی اینگل سے تصویر بنانی تھی۔

''بس اتنا سا کام تھا جس سے تو مری جا رہی تھی۔ لے یہ نوٹ رکھ لے اور یہ سو روپے اوپر سے......کل سے تجھے دو گھنٹے یہاں روز صرف کرنا ہوں گے اور اتنے ہی روپے روزانہ ملیں گے۔''

''روزانہ......؟'' بھکارن کی آواز بھینچ گئی۔

''ہاں......روزانہ......کہاں رہتی ہو......؟'' اس نے کہا اور بھکارن نے اپنا ٹھکانہ بنا دیا۔

''چل......! میں تجھے تیرے گھر چھوڑ آؤں......تیرا گھر بھی دیکھ لوں گا تاکہ اگر تو غائب ہونے کی کوشش کرے تو تجھے تیرے گھر سے پکڑ لاؤں۔'' بھکارن تیار ہوگئی۔ معیز اسے کار میں لے کر چل پڑا۔ بھکارن کا گھر ایسی جگہ تھا جہاں سے معیز کو گزرتے ہوئے ناک پر رومال رکھنا پڑا۔ واپسی پر اس نے ملازم کو ہدایت کر دی کہ کار کی سیٹ کو دھو دے اور اس کے بعد وہ اپنے نگار خانے میں داخل ہوگیا۔

تصاویر کے پرنٹس بنائے اور ان میں سے سب سے عمدہ پوز کا انتخاب کرنے لگا۔ ہر تصویر اپنا جواب آپ تھی۔ انتخاب مشکل ہوگیا۔ بہرحال اس نے کافی جانچ پڑتال کے بعد ایک تصویر منتخب کر لی اور اس پر کام شروع

کر دیا۔

دوسرے دن وہ ہمت کر کے دوبارہ بھکارن کے مکان پر پہنچ گیا۔ بھکارن اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ آج وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس نے خود ہی کار کا عقبی دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ راستے میں اس نے کہا۔

''یہی جگہ ٹھیک رہے گی بابو جی......! ہم تمہیں یہیں مل جایا کریں گے، یہیں ہمیں اتار بھی دیا کرنا۔''

''ٹھیک ہے......!'' وہ مختصراً بولا۔

''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم نے یہ بات کیوں کہی......؟''

''بتا دو......!''

''لڑکیاں چھیڑ رہی تھیں۔ پوچھنے لگیں...... کار والا بابو کون تھا......؟ کیسا ہے......؟ ایسی ہی بے شرمی کی باتیں۔'' وہ شرما کر بولی۔

''ہوں......!'' وہ بے خیالی کے انداز میں بولا۔ بھکارن کی باتیں اس کے لئے قابل توجہ نہیں تھیں۔

نور ولاز میں پہنچ کر وہ نگارخانے میں داخل ہوگیا۔ بھکارن کو اس نے سامنے بٹھایا اور کام شروع کر دیا۔ وہ بے خودی کے عالم میں کام کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بھکارن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان نگاہوں میں پیار تھا، وارفتگی تھی۔ وہ اس تصویر کو آنکھوں میں اتار رہا تھا اور اس کے ہاتھ اس کے ذہن سے عکس لے کر اسے کینوس پر منتقل کر رہے تھے۔ لیکن بھکارن کے سوکھے مدقوق چہرے پر بار بار رنگ آ رہے تھے۔ کئی بار اس نے شرما کر نگاہیں جھکائی تھیں اور معیز کو اسے ٹوکنا پڑا تھا۔

''بابو جی......!'' تیسرے دن اس نے کہا۔

''ہوں......!''

''تھک گئی ہوں...... رات کو طبیعت بھی خراب ہوگئی تھی۔ خون تھوکا تھا میں نے۔'' اس کی آواز میں ایک مان تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا۔ جیسے وہ پریشان ہو جائے گا، بے چین ہو جائے گا، خون تھوکنے والی بات سن کر۔ امید بھری نظروں سے وہ اسے دیکھنے لگی لیکن معیز کا ذہن تصویر میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے بڑے سپاٹ سے انداز میں یہ بات سنی۔

پھر گہری سانس لے کر بولا۔

''آرام کر لو چند منٹ......!'' اس نے پنسل رکھ دی اور خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کب سے بیمار ہو......؟''

''تین سال سے۔''

''کون...... کون ہے گھر میں......؟''

''چاچا...... اور بس......''

''باپ نہیں ہیں......؟''

''نہیں...... مر گئے بہت دن ہوئے۔''

''چاچا کیا کرتا ہے......؟''

''یہی دھندا کرتا ہے...... خاندانی کام ہے ہمارا۔''

''تمہاری شادی نہیں ہوئی......؟''

''نہیں جی......!'' اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

''کرو گی بھی نہیں......؟'' معیز نے سرسری انداز میں پوچھا اور اس

کے زرد چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ ناراض تھی وہ اس بات پر کہ وہ اس کے خون تھوکنے کی خبر سے پریشان کیوں نہیں ہوا۔ لیکن اس سوال سے اس کی ناراضی دور ہوگئی۔ اس نے شرما کر کہا۔

''مجھے کیا معلوم......؟''

''ہاں......! یہ بات تو تمہارے چاچا کو معلوم ہوگی مگر تمہیں تو ٹی بی ہے۔''

''ٹھیک ہوسکتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اگر علاج ہو جائے تو میں ٹھیک ہوسکتی ہوں۔''

''علاج کیوں نہیں کرایا......؟''

''ہم غریب لوگ ہیں بابو جی......! اور علاج بہت مہنگا ہے، تین ہزار روپے مہینہ کی دوائی آتی ہے۔''

''اوہو...... اچھا یہ بات تھی۔'' وہ بدستور سادہ سے لہجے میں بولا۔ کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا اس کے دل میں۔ کوئی احساس نہ تھا اس کے چہرے پر۔ وہ مصور تھا، اپنے فن میں کھویا ہوا۔ دوسری باتوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

''پر اب میں نے علاج شروع کرایا ہے۔ تم نے جو پیسے دیئے تھے ناں......! اس میں دوا لی اور تھوڑے چاچا کو دیئے۔ میں نے بتایا تھوڑی ہے انہیں تمہارے بارے میں۔''

''ہوں......!'' وہ آہستہ سے بولا۔

''بابو جی......! پہلے میں ڈرتی تھی تم سے......''

''مجھ سے...... کیوں......؟''

''بس بابو جی......! ایک بات ہوگئی تھی، ایسی ہی......''

''کیا......؟''

''تمہاری طرح کا ایک بابو مجھے گاڑی میں بٹھا کر لے گیا تھا، کہنے لگا ابا کی نیاز ہے۔ کھانا اور کپڑے دینے ہیں، مگر...... وہاں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور بابو جی......! اس نے...... اس نے......'' وہ شرما گئی۔

اس نے اپنا پھٹا دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا۔ انتظار کرتی رہی وہ کہ بابو کچھ بولے لیکن بابو ایک برش اٹھا کر صاف کرنے لگا۔

''پھر بابو......! میری طبیعت خراب ہوگئی۔ میں بیمار رہنے لگی۔ الٹیاں آنے لگیں مجھے۔ چکر آتے رہتے پیچھے ہر وقت۔ چاچا نے مائی بشیراں کو دکھایا اور مائی بشیراں نے چاچا کو نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ چاچا میرے اوپر ڈنڈا لے کر پل پڑا۔ کئی لاتیں ماریں اس نے میرے پیٹ پر۔ میں بیمار ہوگئی۔ میری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ میرے پیٹ میں بچہ آگیا ہے۔ خدا قسم بابو......! میں تو حیران رہ گئی۔ کہاں سے آگیا یہ بچہ میرے پیٹ میں؟ وہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ بچہ آیا بھی اور چلا بھی گیا۔ بس اس کے بعد مجھے دق ہوگئی۔ نہیں تو پہلے میں بہت اچھی تھی۔''

''اچھا......!'' وہ بولا۔

''چل اب کام شروع کریں۔'' اور وہ جل گئی، خاموشی سے وہاں آ بیٹھی جہاں وہ چاہتا تھا۔

ایک گھنٹہ ہوگیا اسے بیٹھے بیٹھے، تب وہ اچانک بول پڑی۔

''تبھی تو اس دن میں تم سے ڈر رہی تھی۔''

''ایں......!'' معیز خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"مگر تم تو سن ہی نہیں رہے میری بات...... نہ سنو......! میرا کیا ہے......؟"

دوسری صبح جب وہ اسے لینے گیا تو وہ پہلے ہی وہاں کھڑی ہوئی تھی۔ معیز نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا تو تھا لیکن پہچان نہیں سکا تھا۔ یہ وہ تو نہیں تھی۔ گہرے نیلے رنگ کی شلوار، خوبصورت پرنٹڈ قمیص، میچ کرتا ہوا دوپٹہ، سلیقے سے بندھے ہوئے بال۔ اس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ وہ خود اس کے پاس پہنچ گئی۔

"مجھے تلاش کر رہے ہو بابو......! میں یہ کھڑی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں مسرت ناچ رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی لیکن وہ پریشان ہو گیا۔

"یہ...... یہ کیا حلیہ بنا لیا تو نے......؟ پاگل ہوئی ہے کیا......؟" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"ارے خوب چکمہ دیا ہے چاچا کو...... کیا یاد کرے گا۔ میں نے کہہ دیا کہ آج میں شہزادی کی منگنی پر جا رہی ہوں۔ خوب دانت پیسے اس نے...... بڑبڑانے لگا کہ کام پر نہیں جائے گی تو کھائے گی کیا......؟ پر میں نے بھی ایک نہ سنی۔ اچھی لگ رہی ہوں ناں میں......؟" وہ کار کے دروازے کی طرف بڑھی۔

"سن تو سہی......! پاگل ہو گئی ہے کیا......؟" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

"کیوں...... کیا ہوا......؟"

"تیرے وہ کپڑے کہاں ہیں......؟"

"گھر میں ہیں۔"

"بیکار ہے...... تو نے اپنی شکل بھی بگاڑ لی ہے...... آج کام نہیں ہو

سکتا۔"

"بگڑ گئی ہے میری شکل......؟" وہ منہ بسور کر بولی۔

"ہاں...... تصویر کیسے بنے گی اس حلیے میں...... دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا...... جاہل احمق کہیں کی...... جا وہی کپڑے پہن کر آ...... میں انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی کر......!"

اس کے چہرے کی دیوالی ماند پڑ گئی۔ سارے چراغ بجھ گئے۔ وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ پھر واپس لوٹ گئی۔

کافی دیر سے کام شروع ہوا تھا۔ وہ بہت اداس تھی۔ دن بھر خاموش رہی۔ شام کو پیسے لے کر خاموشی سے چلی گئی اور پھر دوسرے دن اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"کل میں نے دوا بھی نہیں لی۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔ دن بھر بس بھوکی رہی۔"

"ہوں......!"

"آج بھی دوا نہیں لوں گی۔ سوچ لیا ہے، اچھا ہے مر جاؤں۔"

"ٹھیک ہے......!" اس نے جواب دیا اور وہ حیران رہ گئی پھر خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے دن اور تیسرے دن بھی کچھ نہیں کہا۔ اب وہ کچھ ویران ہو گئی تھی۔ معیز نے اس کے چہرے کی ساری ویرانیاں تصویر میں سمو دی تھیں۔ تصویر مکمل ہو گئی۔

"بس خوشبو......! تیرا کام ختم......" اس نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔

اس کی نگاہیں پنسل سے بنے ہوئے اسے خاکے پر جمی ہوئی تھیں جن میں بس اب رنگ بھرنے تھے، سارے جہاں کی ویرانیوں کے رنگ۔

''میں جاؤں......؟''

''ہاں......! یہ پیسے رکھ لے۔'' اس نے کہا اور وہ پیسے لے کر چلی گئی۔ دوسرے دن دوپہر کو جب وہ نگار خانے سے نکلا تو ملازم ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''چھوٹے حضور......! باہر وہ بھکارن کھڑی ہے۔ گیارہ بجے سے کھڑی ہے۔ پریشان تھی...... پاگل...... پوچھنے لگی کہ صاحب بیمار تو نہیں ہوگئے۔ آج مجھے لینے نہیں آئے......؟''

''اوہ......! میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کام ختم ہوگیا ہے۔ جاؤ اس سے کہہ دو۔ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اندرونی عمارت کی طرف چل پڑا۔ دوسری دوپہر ملازم نے پھر اس بھکارن کے بارے میں اطلاع دی۔

''وہ بری طرح رو پیٹ رہی ہے چھوٹے حضور......! آج نو بجے ہی آگئی تھی۔ کہہ رہی ہے بس ایک بار اسے آپ سے ملا دوں۔'' وہ ملازم کو خونخوار نگاہوں سے گھورنے لگا۔

''پھر مجھے کیا کرنا چاہئے......؟''

''جی......وہ سرکار......!'' ملازم بوکھلا گیا۔

''دوبارہ مجھے اس کے بارے میں اطلاع نہ ملے۔'' اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور تیز تیز قدموں سے اندر چلا گیا۔

اس کے بعد اسے اس بھکارن کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔

تصویر مکمل ہوگئی تھی۔ جس کے پس منظر، پیش منظر میں بھکارن کا چہرہ تھا۔ حسرت و یاس کی تصویر، سوکھا چہرہ، تیکھے خدوخال، پپڑائے ہوئے ہونٹ۔

پس منظر میں بھی وہی چہرہ تھا۔ سرسبز و شاداب، تروتازہ، زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور۔ وہی خدوخال تھے جو پیش منظر میں تھے لیکن پس منظر میں وہ حسن و دل کشی کا مجسمہ تھی۔ اس تصویر میں معیز نے انسان کی بے بسی پیش کی تھی۔ دل میں چھپے ہوئے، اس درد کو لکیروں میں سمو دیا تھا جو انسانیت کا درد تھا۔ افلاس، سرسبز و شاداب چہروں کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔

تصویر نمائش میں رکھی گئی اور لاکھوں نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ نقادان سر دھننے لگے۔ مقابلے میں حصہ لینے والوں کے دلوں پر پہلے ہی دن اوس پڑ گئی تھی۔ وہ خود اس تصویر کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے۔ معیز نے ایک بار پھر ایک شاہکار تخلیق کر دیا تھا۔

اخبارات نے لکھا۔

''نمبر ایک...... فنکار ہمیشہ سچ کہتا ہے۔ پس منظر میں معیز نے ایک فلاس زدہ بھکارن کو پیش کیا ہے جو نوجوان ہے، تیکھے خدوخال کی مالک ہے، لیکن اس کے حسین نقوش افلاس اور فاقہ کشی کی چادر کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔ پس منظر میں اس کا دلکش روپ نظر آتا ہے، لیکن حقیقت برہنہ ہے۔

نمبر دو...... نورمحل کا شہزادہ عظیم ہے کہ اس کی نگاہ زمین کی گہرائیوں پر رہتی ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ کسی گندی سی کھولی میں رہنے والے مصور کا ذہن اگر اس منظر کی عکاسی کرتا تو یہ بات اس قدر قابل ستائش نہ ہوتی لیکن فنکار دولت کی چمک سے اندھا نہیں ہوتا جس کا ثبوت پس منظر ہے۔ معیز ایک ارب پتی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ مرزا معیز بیگ، بلکہ یہ صرف معیز ہے۔ صرف ایک فنکار۔

نمبر تین...... سچ کو پرکھ کر، خون دل میں ڈبو کر معیز نے پس منظر

تخلیق کیا ہے اور ایک بار پھر اپنے فن کا لوہا منوا لیا ہے۔ اس کا حساس دل انسانیت کے دکھوں سے لبریز ہے۔ پس منظر کے عظیم فنکار کو ہمارا سلام......!''

فیصلہ ہوگیا۔ متفقہ طور پر اس تصویر کو اول قرار دیا گیا۔ معیز کو پھولوں سے لادا گیا۔ الٹرا ماڈرن لڑکیوں نے اس کے ہاتھ چومے، فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والی ایک خاتون نے کہا۔

''معیز ......! کاش تمہارے ہاتھ کی پرچھائیں ہی ہمیں نصیب ہو جائیں۔ کاش......'' ایک شوخ وشنگ اخباری رپورٹر لڑکی نے کہا۔

''پلیز مسٹر معیز......! صرف چند سوال...... سنا ہے آپ اخبار نویسوں کو مایوس نہیں کرتے۔''

''جی فرمایئے......!'' وہ پُر وقار لہجے میں بولا۔

''آپ یہ خیال کہاں سے حاصل کرتے ہیں......؟''

''خیالات حاصل نہیں کیے جاتے۔ ان کا تعلق ذہن و دل کی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ تصویر صرف خیالی ہے یا حقیقی......؟''

''یہ ایک حقیقت ہے......!''

''گویا......آپ نے کسی کو ماڈل بنایا ہے......؟''

''ہاں......!''

''کون ہے...... یہ لڑکی......؟ کہاں ہے......؟''

''میرے وطن، میرے شہر کی گلیاں اور سڑکیں غربت و افلاس کے ایسے ماڈلوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ لڑکی خوشبو ہے، ہاں......اس کا نام خوشبو

ہے، لیکن یہ بھوک، پیاس، افلاس اور بیماری کے جہنم میں رہتی ہے۔ شہر کی کسی سڑک پر تلاش کر لیں۔ یہ آپ کو ضرور مل جائے گی۔ یہ بدنصیب ٹی بی کے مرض میں مبتلا تھی۔ زندہ رہنے کی خواہش رکھتی تھی لیکن اس کی غربت، اس کا افلاس بالآخر اسے موت کی وادیوں تک لے جائے گا۔ مجھے یقین ہے، وہ طویل عرصہ زندگی کے اس بوجھ کو گھسیٹ نہ سکے گی۔'' معیز کی آواز بھرا گئی۔

''آپ نے اس کی صرف تصویر بنائی ہے معیز......! یا اس کی غربت کا علاج...... آپ تو ایک دولت مند خاندان کے چشم و چراغ ہیں......؟'' لڑکی نے سوال کیا۔

''ایکسکیوزمی معیز......! آپ اس تصویر کو فروخت کریں گے......؟ سنا ہے، فن مصوری کے سب سے بڑے قدردان سیٹھ نظام شاہ اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں......؟'' ایک اور رپورٹر نے اسے اس نازک سوال کے جواب بے بچالیا۔

''میں اپنا شاہکار فروخت نہیں کرتا۔'' اس نے ایک شان سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

نمائش گاہ کے باہر، درمیانی سڑک کی دوسری جانب فٹ پاتھ پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سیٹھ نظام شاہ اپنی شاندار مرسڈیز کے پاس کھڑے کہہ رہے تھے۔

''کسی طرح اسے تیار کرو جیلانی صاحب......! میں اس تصویر کو پچاس لاکھ سے پچھتر لاکھ تک دینے کو تیار ہوں۔ کم بخت نے کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے، کیا چیز بنائی ہے۔ جیلانی......! اس کے بغیر میری آرٹ گیلری نامکمل

ہے۔ تم پھر بات کرو اس سے۔ یہ ڈرائیور کم بخت کہاں مر گیا۔ دیکھو اس بھیڑ میں تو نہیں ہے......؟''

''ابھی دیکھتا ہوں سرکار......!'' جیلانی آگے بڑھ گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک نوجوان بھکارن کی لاش پڑی تھی جس کے قریب ایک بوڑھا بیٹھا رو رہا تھا۔

''ہائے......! خوشبو......! میری بچی......! اب میں کیا کروں گا اس دنیا میں جی کر......؟ ہائے...... اس جوانی میں مرنا تھا تجھے...... میری خوشبو......! لوگو......! اس کے کفن کے لئے کچھ دو۔ ارے اس بے کفن کو کفن تو دے دو۔ دوائی تو کوئی نہ دے سکا۔ اسے کفن ہی دے دو...... ہائے میری خوشبو......!''

''کیا ہو گیا تھا اسے بابا......؟'' مجمع میں سے کسی نے دریافت کیا۔

''دق کی مریض تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اگر علاج ہو جائے تو ٹھیک ہو سکتی ہے، مگر علاج...... ہائے میری خوشبو......!'' بوڑھے نے روتے ہوئے کہا۔

جیلانی نے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں کھڑے ہو میاں صاحب......! اتنی دیر سے گاڑی کے قریب کھڑے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کیسا مجمع ہے یہ......؟''

''ایک بھکارن مر گئی ہے......؟'' ڈرائیور نے کہا۔

''ارے...... اوہ...... یہ تو...... یہ تو وہی ہے۔ بالکل وہی تصویر والی۔'' جیلانی نے بھکارن کے مردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دوڑتا، ہانپتا ہوا گاڑی کی طرف بھاگا۔

''صاحب...... صاحب...... وہی ہے...... وہی تصویر والی...... مر گئی۔ فٹ پاتھ پر پڑی ہے۔ بالکل وہی ہے...... آپ دیکھیں تو سہی۔'' اور صاحب کی گھورتی ہوئی نگاہوں کو دیکھ کر وہ سنبھل گیا۔ ڈرائیور نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جیلانی......! تمہاری عمر ساٹھ سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ شاید بالکل ہی سٹیا گئے ہو۔ مجھے تصویر چاہئے...... مجھے صرف تصویر چاہئے...... تصویر والی نہیں...... کیا میں اس کی لاش کو لٹکاؤں گا آرٹ گیلری میں......؟ چلو ڈرائیور......! آگے بڑھو......!''

